ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(چہارم)

ثروت صولت

ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(چہارم)

ثروت صولت

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

نام کتاب: ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (چہارم)

مصنف: ثروت صولت

اشاعت: دسمبر 2014ء

ایڈیشن: 7

تعداد: 600

قیمت: -/300 روپے

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

اہتمام:

عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان

فون: 042-35417074, 35417071

فیکس: 042-35417072

موبائل: 0300-8485030

ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk

ای میل: islamicpak@yahoo.com

فہرست مضامین

باب ۲۲

سعودی عرب

جزیرۃ نمائے العرب جسے اہل عرب جزیرہ العرب کہنا پسند کرتے ہیں تاریخ اسلام کے ابتدائی ڈہائی سوسالہ دور کے بعد کبھی بھی ایک سیاسی وحدت کے تحت متحد نہیں ہوا۔ ایران، عراق، شام اور مصر میں قائم ہونے والی حکومتیں کبھی کبھی عرب کے ساحلی صوبوں پر قابض ہو جاتی تھیں، لیکن اندرون عرب کا علاقہ اس زمانہ میں بھی آزاد رہا۔ عباسی دور کے بعد صرف عثمانی سلطنت ایک ایسی غیر عرب حکومت تھی جس کی بالادستی کچھ مدت کے لیے عرب کے بیشتر حصے پر قائم ہوگئی تھی۔ حجاز، یمن اور الحساء کے صوبوں پر یہ بالادستی نسبتاً پائیدار تھی اور کبھی کبھی عمان تک اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا تھا۔ لیکن نجد کا علاقہ اس دور میں بھی آزاد رہا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں عثمانی سلطنت کی ہدایت پر والی مصر محمد علی پاشا کی فوج نے آل سعود کے خلاف فوجی کاروائی کرکے نجد فتح کرلیا تھا لیکن یہ فوج اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکی اور دارالحکومت درعیہ کو برباد کرکے واپس چلی گئی۔ جزیرہ نمائے عرب کی آج بھی یہی صورت ہے اور بارہ لاکھ مربع میل پر مشتمل یہ وسیع خطہ اس وقت ذیل کی آٹھ سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہے:

۱۔ سعودی عرب	۹ لاکھ ۲۷ ہزار مربع میل	
	۲۴ لاکھ مربع کیلومیٹر	۷۹ لاکھ (۱۹۷۹ء)
۲۔ شمالی یمن	۷۵ ہزار مربع میل	
	ایک لاکھ ۹۵ ہزار مربع کیلومیٹر	۷۰ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔ جنوبی یمن	ایک لاکھ دس ہزار مربع میل	
	دو لاکھ ۸۰ ہزار مربع کیلومیٹر	۱۸ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۴۔ عمان	۸۲ ہزار مربع میل	
	۲ لاکھ ۱۲ ہزار مربع کیلومیٹر	۲ لاکھ (۱۹۷۸ء)

۵۔ متحدہ عرب امارات	۳۲ ہزار مربع میل	
	۸۳ ہزار مربع کیلومیٹر	۲ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۶۔ قطر	۴ ہزار مربع کیلومیٹر	
	گیارہ ہزار مربع کیلومیٹر	۱۱ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۷۔ کویت	۹ ہزار مربع میل	
	۲۴ ہزار مربع کیلومیٹر	۱۱ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۸۔ بحرین	۲۳۱ مربع میل	
	۶ سو مربع کیلومیٹر	۳ لاکھ (۱۹۷۸ء)

ان میں سعودی عرب کا علاقہ رقبہ کے لحاظ سے جزیرۃ العرب کے ۷۵ فیصد حصے اور آبادی کے لحاظ سے چالیس فیصد حصہ پر مشتمل ہے۔

حجاز کی ہاشمی مملکت

شریف حسین (۱۸۵۲ء تا ۱۹۳۱ء) جس نے عثمانی سلطنت سے بغاوت کے بعد حجاز میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا سلسلہ نسب ۳۷ ویں پشت میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے توسط سے آنحضرت سے مل جاتا ہے۔ شریف اس کا نام نہیں تھا بلکہ خاندان رسالت سے تعلق کی وجہ سے عربوں میں سادات کو شریف کہا جاتا ہے۔ مراکش کا موجودہ حکمران خاندان بھی اسی وجہ سے شریفی کہلاتا ہے۔ خانہ کعبہ کی نگرانی اور دیکھ بھال اسلام سے قبل سے ہاشمی خاندان کے سپرد تھی۔ اسلام کے بعد بھی یہ منصب اسی خاندان کے سپرد رہا۔ شریف حسین کا خاندان طویل عرصے سے اس حکومت پر مامور تھا اور اس کی وجہ سے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں جب عربوں میں قوم پرستی کے تصورات نے گھر کرنا شروع کیا اور ترکوں کی حکومت کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا ہوئی تو شریف حسین بھی اس سے متاثر ہوا اور اس نے سلطان کا اعتماد کھو دیا۔ سلطان عبدالحمید نے ایسی صورت میں اس کا حجاز میں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور ۱۸۹۳ء میں شریف حسین کو بیوی بچوں سمیت استنبول بلا لیا جہاں وہ

۱۹۰۸ء تک پورے پندرہ سال جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ اگرچہ اس دوران میں سلطان نے اس کو مجلس وزراء میں شامل کرلیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں دوسری مشروطیت کا اعلان ہوا تو نوجوان ترکوں نے سلطان کے احتجاج کے باوجود شریف حسین کو نہ صرف واپس جانے کی اجازت دے دی بلکہ اس کو مکہ کا امیر بھی مقرر کر دیا اور جب عثمانی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو اس کا بیٹا فیصل حجاز سے رُکن منتخب ہوا۔

مکہ کا امیر ہو جانے کے بعد شریف حسین کو اپنے مقصد کے حصول میں آسانیاں ہوگئیں اور اس نے انگریزوں سے تعلق پیدا کیا اور عرب علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے منصوبہ تیار کیا جس کا اس کتاب کے باب سولہ میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ جنگ عظیم چھڑنے کے بعد جب خلیفہ نے اعلان جہاد کیا تو شام کے فوجی گورنر جمال پاشا کی طرف سے شریف حسین سے اعلان جہاد کی توثیق کرنے اور علم نبوی کو دمشق بھیجنے کے لیے کہا گیا تا کہ اس علم کے سایہ میں مصر میں انگریزی فوجوں پر حملہ کیا جائے۔ شریف حسین نے علم نبوی تو بھیج دیا جو ۱۵۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کو دمشق پہنچ گیا، لیکن مختلف حیلے بہانوں سے اعلان جہاد کی توثیق نہیں کی اور دو سال بعد عربوں کی بغاوت شروع ہونے پر ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ، فرانس اور روس نے فوراً اس کی بادشاہت تسلیم کرلی لیکن اس کو صرف حجاز کا بادشاہ تسلیم کیا جب کہ شریف حسین نے پورے عرب کا بادشاہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ انگریزوں کے مقابلے میں یہ شریف حسین کی پہلی ناکامی تھی اور اس کے بعد اس کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

شریف حسین کی حکومت صحیح معنوں میں ۱۹۱۸ء سے شروع ہوتی ہے جب مدینہ کے ترک دستہ نے ہتھیار ڈال دیے اور پورے حجاز پر عربوں کا قبضہ ہوگیا۔ شریف حسین کو انگریزوں پر بہت اعتماد تھا اور اس اعتماد میں ان عرب دشمن خفیہ معاہدوں کے بعد بھی کمی نہیں آئی جو برطانیہ اور فرانس نے ترکی کے عرب مقبوضات کو اپنے درمیان تقسیم کرنے کے لیے کئے تھے۔ شریف حسین انگریزوں کو آزادی کا پیغامبر سمجھتا تھا۔ وہ حسین میکموین معاہدے پر کامل بھروسہ کرتا تھا اور اس کی ایک نقل اپنی جیب میں اسی طرح ڈالے پھرتا تھا کہ گویا وہ سب کچھ ٹھیک ہونے کی ضمانت تھی۔ لیکن شام میں اس کے لڑکے فیصل کے ساتھ جو سلوک ہوا اس سے وہ بہت متاثر ہوا۔

۱۹۲۱ء میں برطانیہ نے ایک معاہدے کا مسودہ دے کر کرنل لارنس کو شاہ حسین کے پاس

جدہ بھیجا۔ معاہدہ کا مقصد یہ تھا کہ حسین عربوں سے متعلق برطانوی منصوبوں کو تسلیم کرلے اور فلسطین کو یہودی وطن بنانے کے منصوبے کو قبول کرلے۔ شریف حسین اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود غلامی کی اس دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

شریف حسین نے حجاز کا تخت حاصل کرنے کے بعد اپنے آمرانہ رویہ سے آزادی پسند عناصر کو جلد ہی برگشتہ کردیا۔ اس کی نااہلی کی وجہ سے ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ بڑا بننے کا خبط اس کو پہلے ہی تھا جس کی وجہ سے اس نے آزادی حاصل کرنے کے بعد عربوں کا بادشاہ بننے کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد جب ترکی نے ۳۔ مارچ ۱۹۲۴ کو خلافت ختم کرنے کا اعلان کیا تو شریف حسین نے ۱۲۔ مارچ کو خلیفہ بننے کا اعلان کردیا۔ لیکن اس کی خلافت کو اردن اور عراق کے علاوہ کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ شریف حسین کے اس طرزِ عمل نے عرب کے دوسرے حکمرانوں اور امراء کو اُس کے خلاف کردیا۔ نجد کے حکمراں ابن سعود نے شریف حسین کے خلاف اس بے چینی سے فائدہ اٹھایا اور حجاز پر حملہ کردیا اور ۵۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کو طائف فتح کرلیا۔ خود حجاز کے لوگ شریف حسین کے خلاف ہوگئے اور ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے علی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۳۵ء) کے حق میں تخت سے دست بردار ہوگیا۔ جنگ اس کے بعد بھی نہیں بند ہوئی۔ انگریزوں کو اب شاہ حسین سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے انہوں نے بھی مدد نہیں کی اور سعودی فوجوں نے ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مکہ اور اگلے سال ۵۔ دسمبر کو مدینہ بھی فتح کرلیا۔ شاہ علی کے پاس اب صرف جدہ رہ گیا تھا۔ مزید مقابلے کو بے سود سمجھ کر ۱۹۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کو شاہ علی بھی تخت سے دست بردار ہوگیا اور چار دن بعد ۲۳۔ دسمبر کو سعودی فوجوں نے جدہ بھی فتح کرلیا۔ شریف حسین اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ حجاز چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ پہلے عقبہ (اُردن) گیا پھر وہاں سے قبرص چلا گیا۔ اپنی وفات سے چند ماہ پہلے وہ اپنے بیٹے امیر عبداللہ کے پاس اُردن آ گیا تھا اور وہیں ۶۔ جون ۱۹۳۱ء کو اس کا انتقال ہوا۔ ترکوں کے خلاف انگریزوں سے سازش اس کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئی۔ اس کا بیٹا علی اپنے بھائی فیصل کے پاس عراق چلا گیا اور وہیں ۱۹۳۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس طرح حجاز سے ہاشمی خاندانی کی حکومت ختم ہوگئی اور سعودی حکومت کا دَور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

سلطان ابن سعود (۱۹۲۶ء تا ۱۹۵۳ء)

ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں نجد کے مشہور عالم اور مصلح محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء تا ۱۷۹۱ء) کے حالات میں بیان کر چکے ہیں کہ نجد کا سعودی خاندان انیسویں صدی کے آغاز میں جزیرہ نمائے عرب کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ لیکن مصری حکمران محمد علی نے آل سعود کی اس حکومت کو ۱۸۱۸ء میں ختم کر دیا تھا۔ سعودی خاندان کے لوگ اس کے بعد تقریباً اسی (۸۰) سال تک پریشان پھرتے رہے، یہاں تک کہ موجودہ صدی کے شروع میں اس خاندان میں پھر ایک زبردست شخصیت پیدا ہوئی۔ یہ شخصیت عبدالعزیز بن سعود (۱۸۷۲ء تا ۱۹۰۳ء) کی ہے جو عام طور پر سلطان ابن سعود کے نام سے مشہور ہیں۔

ابن سعود انیسویں صدی کے آخر میں اپنے باپ کے ساتھ عرب کے ایک ساحلی شہر کویت میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ بڑے باحوصلہ انسان تھے اور اس دھن میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آباواجداد کی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لیں۔ آخر کار ۱۹۰۲ء میں جب کہ ان کی عمر تیس سال تھی۔ انہوں نے صرف پچیس ساتھیوں کی مدد سے نجد کے صدر مقام ریاض پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے باقی نجد بھی فتح کر لیا۔ ۱۹۱۳ء میں ابن سعود نے خلیج فارس کے ساحلی صوبے الحساء پر جو عثمانی ترکوں کے زیر اثر تھا قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یورپ میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس کے دوران ابن سعود نے برطانیہ سے دوستانہ تعلقات تو قائم رکھے لیکن ترکوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد شریف حسین سے ان کا پہلا تصادم ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ ۱۹۲۴ء کے وسط میں جب شریف حسین نے خلیفہ بننے کا اعلان کر دیا تو ابن سعود نے حجاز پر بھرپور حملہ کر دیا اور چار ماہ کے اندر پورے حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اور ۸۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو ابن سعود نے حجاز کا بادشاہ بننے کا اعلان کر دیا۔[1] اس طرح سعودی مملکت اپنے زوال کے ایک سو سال بعد ایک بار پھر پوری قوت سے اُبھر آئی اور عرب کی سب سے بڑی طاقت بن گئی۔ مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد ابن سعود نے خلیفہ بننے کی کوشش نہیں کی

---

(۱) سب سے پہلے جس ملک نے ابن سعود کی بادشاہت کو تسلیم کیا وہ روس تھا۔ روس نے ۱۱۔ فروری ۱۹۲۶ء کو حجاز و نجد پر سعودی حکومت کو تسلیم کیا۔ لیکن برطانیہ نے تاخیر سے کام لیا اور ۲۰۔ مئی ۱۹۲۷ء کو معاہدہ جدہ کے بعد تسلیم کیا۔

بلکہ حجاز کا انتظام سنبھالنے اور جدید دَور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے انہوں نے ۱۴۔۱۹ مئی ۱۹۲۶ء کے درمیان ساری دنیا کے مسلمان رہنماؤں پر مشتمل ایک موتمر اسلامی طلب کی جس میں تیرہ اسلامی ملکوں نے شرکت کی۔ موتمر میں اسلامی ہند کے ایک وفد نے بھی شرکت کی جس کی سب سے ممتاز شخصیت مولانا محمد علی تھے۔ اگرچہ یہ موتمر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اتحاد اسلامی کی تحریک میں اس کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مسلمانوں کا پہلا بین الاقوامی اجتماع تھا جسے ایک سربراہ مملکت نے طلب کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں ابن سعود نے عسیر اور نجران کے علاقوں کو بھی سعودی مملکت میں شامل کر لیا۔ یہ دونوں علاقے چونکہ یمن کی سرحد پر واقع تھے اور ان پر یمن کا بھی دعوٰی تھا اس لیے سعودی عرب کا یمن سے تصادم ہو گیا۔ سعودی عرب کی فوجوں نے جو یمن کی فوجوں کے مقابلے میں زیادہ منظم تھیں اور دینی جذبے سے سرشار تھیں یمن کو بھی شکست دے دی اور ۱۹۳۴ء میں یمن کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اسی سال بعض ممتاز مسلمانوں کی کوششوں سے جن میں امیر شکیب ارسلان کا نام قابل ذکر ہے، طائف میں سعودی عرب اور یمن کے درمیان ۲۰۔ مئی ۱۹۳۴ء کو ایک معاہدہ ہو گیا اور سعودی فوجوں کو یمن سے واپس بلا لیا گیا۔

سعودی فوجوں نے اس سے پہلے اردن کو بھی اپنے دائرہ اقتدار میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اگر ابن سعود اردن اور یمن کی مہموں میں کامیاب ہو جاتے تو پورا جزیرہ نمائے عرب ان کے تحت آ جاتا لیکن اس وقت بھی ابن سعود کی حکومت رقبے کے لحاظ سے ایشیا میں سب سے بڑی عرب حکومت ہے اور یمن، عمان اور بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے جزیرہ نمائے عرب پر سعودی بالادستی قائم ہے۔

۲۲۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو نجد و حجاز کی اس نئی حکومت کو سعودی عرب کا نام دیا گیا۔

اصلاحات

ابن سعود اور ان کے نجدی ساتھی چونکہ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو تھے، جو ایک عظیم مصلح تھے اس لیے ابن سعود نے اسلامی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کی۔ ابن سعود بادشاہت کو ختم نہ کر سکے لیکن وہ سارے کام علماء کی ایک مجلس کے مشورہ سے انجام دیتے تھے اور

انہوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ ملک میں اسلامی احکام پر عمل کیا جائے۔ انہوں نے سارے ملک میں شراب کی خرید وفروخت بند کردی جو ترکوں کے دَور میں حجاز وغیرہ میں عام ہوگئی تھی۔ ابن سعود جب تک زندہ رہے دوسری معاشرتی برائیوں کو بھی جیسے جواء بدکاری، عریانیت، رقص وسرود، مخلوط سوسائٹی اور سودی کاروبار ملک میں پھیلنے کا موقع نہیں دیا۔ دینی تعلیم کے فروغ کے لیے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں جامعہ ازہر کے طرز پر ایک فقہ کالج قائم کیا۔

ابن سعود میں تدبر اور انتظامی صلاحیت کی وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک بانیٔ حکومت میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے اپنے پڑوسی ملکوں سے جھگڑے طے کرنے میں جس دُوراندیشی، اعتدال پسندی اور وسعت قلبی کا ثبوت دیا وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ یمن پر قبضہ کرنے کے بعد وہ اس قبضہ سے دست بردار ہو گئے۔ بندرگاہ عقبہ شروع سے حجاز کا حصہ تھا لیکن اُردن کے امیر عبداللہ نے انگریزوں کی شہ پاکر اس پر قبضہ جمالیا۔ ابن سعود نے اس تنازعہ کو زیادہ نہیں بڑھایا اور ۱۹۴۳ء میں اُردن سے تصفیہ کرلیا اور عقبہ سے دست بردار ہو گئے۔ مملوک سلطان بیبرس کے زمانہ سے خانۂ کعبہ کا غلاف ہمیشہ مصر سے آتا رہا تھا۔ ابن سعود کے زمانہ میں مصر سے اختلاف کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہوگیا لیکن ابن سعود نے ۱۹۳۶ء میں اس مسئلہ پر بھی مصر سے تصفیہ کرلیا اور محمل بدستور مصر سے آنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں سعودی عرب نے ایران اور ترکی سے دوستی کے معاہدے کیے۔ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں ظہران میں جو ہوائی اڈہ قائم کیا تھا وہ ۱۹۴۹ء میں سعودی عرب کو واپس کردیا۔ ۱۹۴۷ء میں سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بجٹ پیش ہوا جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سلطان ابن سعود کو مالیات کو جدید اصولوں کے تحت منظم کرنے کا احساس تھا۔

ابن سعود کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عرب کے خانہ بدوشوں کو بستیوں میں آباد کیا اور ان کو زراعت کی طرف مائل کیا۔ حکومت نے لوگوں کی اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کیا اور یہ کام ایک رضا کار جماعت ''اخوان'' کے ذریعہ انجام دیا۔

ابن سعود کا ایک اور اہم کارنامہ ملک میں امن وامان کا قیام ہے سعودی حکومت سے پہلے عرب بدامنی میں دور دور مشہور تھا اور وہاں کے صحراؤں میں قافلے کے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ لٹیروں اور قزاقوں سے حاجی تک محفوظ نہیں تھے۔ لیکن ابن سعود نے مجرموں کو سخت سزائیں

دے کر ایسا امن قائم کیا کہ قافلے لٹنا تو بڑی بات ہے، ملک میں چوری اور قتل وغیرہ کے جرم بھی برائے نام رہ گئے۔ سعودی حکومت کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ جس کی مثال اس جدید دور میں بھی دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ایک امریکی مصنف نے اپنی کتاب ''عربوں کی بیداری'' میں لکھا ہے کہ:

سارے عرب میں قانون کا احترام کیا جاتا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سعودی عرب میں امن عامہ کا معیار دُنیا کے ہر ملک سے خواہ وہ ملک دنیا میں سب سے زیادہ مہذب ہی کیوں نہ ہو، زیادہ ہے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ سرزمین عرب میں کامل امن وامان قائم کرنے میں تاریخ میں صرف دو آدمی کامیاب ہوئے ایک حضرت عمر اور دوسرے ابن سعود۔

عرب چونکہ ریگستانوں اور بنجر پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے، اس لیے وہاں چند سال پہلے تک آمدنی کے ذریعے بہت کم تھے۔ آمدنی کی اس کمی کی وجہ سے سلطان ابن سعود ملک کو معاشی اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ ترقی نہ دے سکے لیکن ان کے آخری دور حکومت میں عرب میں مٹی کے تیل کے کنوئیں اس کثرت سے نکل آئے کہ ملک کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اور حکومت کو کروڑوں روپے سال کی آمدنی ہونے لگی۔ تیل کی دریافت سے پہلے ۱۹۲۸ء میں سعودی عرب کی کُل آمدنی ستر لاکھ ڈالر تھی اور اس میں سے نصف رقم حاجیوں پر ٹیکس لگا کر وصول کی جاتی تھی لیکن ابن سعود کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں صرف تیل سے ہونے والی آمدنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر تک پہنچ گئی۔ اس فاضل آمدنی سے سلطان نے کئی مفید اور تعمیری کام کیے جن میں سب سے اہم کام ریل کی پٹڑی بچھانا ہے۔ یہ پٹڑی خلیج فارس کی بندرگاہ دمام سے ریاض تک جو سعودی دارالحکومت ہے بچھائی گئی ہے۔ یہ پٹڑی ساڑھے تین سو میل لمبی ہے اور ۱۹۵۱ء میں مکمل ہوئی۔ ابن سعود کا اکاون سال کی حکومت کے بعد ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا۔ وہ سعودی حکومت کے حقیقی بانی تھے اور انہوں نے ایک پسماندہ اور بے وسائل ملک کو جس طرح ترقی کے راستہ پر ڈالا، اس کی وجہ سے ان کا شمار بلاشک وشبہ تاریخ اسلام کے ممتاز حکمرانوں میں ہوگا۔

شاہ سعود (۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۴ء)

ابن سعود کے بعد ان کے بڑے لڑکے شاہ سعود (۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۴ء) تختِ حکومت پر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے باپ کے شروع کیے ہوئے تعمیری کاموں کو جاری رکھا۔ ان کے زمانے میں پٹرول سے ہونے والی آمدنی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اس لیے تعمیر و ترقی کے کام کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ مکہ میں ایک طاقتور ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا۔ مکہ و مدینہ اور دوسرے شہروں کے درمیان پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ صنعتوں کی داغ بیل پڑی۔ دمام اور جدہ کی بندرگاہوں کو جدید طرز پر تعمیر کیا گیا۔

شاہ سعود کے عہدِ حکومت کا ایک بڑا کارنامہ مسجد نبوی اور حرم کعبہ کی توسیع ہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر پر ۳۵ کروڑ روپے صرف ہوئے اور تعمیر کا کام ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوا اب یہ مسجد جو فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے دُنیا کی بہت بڑی اور خوبصورت مسجد بن گئی ہے۔ پوری مسجد سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی ہے۔

مسجد حرم یعنی خانہ کعبہ کی مسجد کی توسیع کا کام مسجد نبوی کی تکمیل کے بعد فوراً شروع ہوگیا۔ شاہ سعود کے زمانے میں تعلیم کو بھی تیزی سے فروغ ہوا۔ پہلے صرف مذہبی تعلیم کے مدرسے ہوتے تھے، لیکن اب مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی طرف بھی توجہ دی گئی، ۱۹۵۷ء میں دارالحکومت ریاض میں عرب کی پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی جس میں آرٹس، سائنس، طب، زراعت اور تجارت کے شعبے ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے لڑکیوں کے لیے بھی مدرسے قائم ہونا شروع ہوگئے۔ مکہ میں شریعت کالج قائم کیا گیا اور ۱۹۶۰ء میں مدینہ میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ کے نام سے دینی یونیورسٹی قائم کی گئی جہاں دینی تعلیم کے علاوہ طلبہ کو افریقہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی تربیت دی جاتی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں شاہ سعود نے امریکہ کا دورہ کیا اور ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے امریکہ سے اسلحہ کی خریداری شروع کی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ سعود کے دَور میں سعودی عرب میں تیزی سے ترقی ہوئی لیکن بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کی بے قید زندگی اور فضول خرچیوں نے ملک کے لیے بہت سے مسائل بھی پیدا کردیے۔ ان میں سب سے سنگین مسئلہ مالیات کا تھا۔ پٹرول سے ہونے والی

کثیر آمدنی کے باوجود سعودی عرب کی مالی حالت خراب ہوتی جارہی تھی اور ریال کی قیمت گر گئی تھی۔عربوں میں انتہا پسندانہ قوم پرستی، نسل پرستی، مذہب سے بیزاری، بعث پارٹی کے غیر اسلامی افکار اور سوشلزم کے عروج کا یہی دور ہے۔ مشرق کے عرب ممالک جن کا سرخیل مصر تھا ان نظریات کی وجہ سے سعودی عرب کے دشمن بن گئے۔اور سعودی حکومت کو امریکہ کا ایجنٹ کہہ کر بدنام کرنے لگے۔شاہ سعود میں اتنا تدبر اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ملک کو ان اندرونی اور بیرونی خطروں سے نجات دلا سکتے۔ یہ صلاحیت ان کے دوسرے بھائی فیصل میں موجود تھی جو شاہ سعود کے دور میں حجاز کے گورنر اور ملک کے وزیر خارجہ تھے۔ چنانچہ شاہی خاندان اور علماء کے دباؤ کے تحت ۲۴ مارچ ۱۹۵۸ء کو شاہ سعود نے تمام ملکی اختیارات شہزادہ فیصل کو سپرد کر دیے اور شاہ سعود کی حیثیت صرف آئینی بادشاہ کی رہ گئی۔

مکمل انتظامی اختیارات سنبھالنے کے بعد شہزادہ فیصل نے جو اصلاحات کیں ان سے ان کی انتظامی صلاحیت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔انہوں نے شاہی خاندان کے اخراجات پر پابندی عاید کی اور دوسری معاشی اصلاحات کیں جن کی وجہ سے سعودی عرب کی اقتصادی اور مالی حالت مستحکم ہوگئی۔

اسی زمانے میں شہزادہ فیصل نے غلامی کی رسم کو جو اب تک سعودی عرب میں رائج تھی ختم کر دیا۔شہزادہ فیصل کے بڑھتے ہوئے اثرات سے شاہ سعود نے اپنے لیے خطرہ محسوس کیا اور اپنے بھائی کی اصلاحات کی راہ میں انہوں نے رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔ آخر ایک مجلس نے جو شاہی خاندان کے ایک سو افراد اور ستر علماء پر مشتمل تھی ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو شاہ سعود کو تخت سے اتار دیا اور امیر فیصل کو ان کی جگہ بادشاہ نامزد کر دیا۔

شاہ فیصل (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۵ء)

شاہ فیصل ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ کا نام طرفہ تھا۔شہزادہ فیصل شروع ہی سے سمجھدار اور باصلاحیت انسان تھے۔سلطان ابن سعود کو ان پر بہت اعتماد تھا اور وہ سعود کے مقابلے میں فیصل کو ترجیح دیتے تھے۔فیصل نے نوجوانی ہی میں اہم کارنامے انجام دینا شروع کر دیے تھے۔حجاز انہوں نے ہی فتح کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ان کو حجاز کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں یمن

کے خلاف جو کامیاب فوجی کاروائی کی گئی تھی وہ فیصل ہی کی سرکردگی میں کی گئی تھی۔ وہ یمن میں بندرگاہ حدیدہ تک پہنچ گئے تھے اور اگر ابن سعود جنگ بندی پر راضی نہ ہوتے تو فیصل آسانی سے باقی یمن بھی فتح کر لیتے۔ ۱۹۵۳ء میں جب سعود بادشاہ ہو گئے تو فیصل ولی عہد قرار دیے گئے۔ ایک سال بعد وہ مجلس وزراء کے صدر یعنی وزیر اعظم ہو گئے۔ شاہ سعود کے دور میں وہ بدستور حجاز کے گورنر اور وزیر خارجہ رہے اور شاہ سعود کے زمانے میں جو انتظامی، تعلیمی، مالی اور معاشی اصلاحات ہوئیں اور ترقی کے جو کام انجام دیے گئے وہ زیادہ تر شہزادہ فیصل ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔

شاہ فیصل نے بادشاہ بننے کے بعد حکومت کو زیادہ عوامی اور جمہوری رنگ دینے کی کوشش کی۔ شاہی خاندان کے اخراجات مقرر کر دیے اور زیادہ رقم تعلیم اور ترقیاتی کاموں پر خرچ کی جانے لگی۔ وزارت میں شاہی خاندان سے زیادہ عوام کے درمیان سے وزیر لیے گئے۔ ایک مقامی اخبار نویس کے سامنے شاہ فیصل نے اپنے اغراض و مقاصد کی وضاحت اس طرح کی:

سعودی حکومت کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ باشندگان ملک کی معاشی، تعلیمی اور ثقافتی دائروں میں اس طرح تربیت کرے کہ وہ اس اونچے معیار پر فائز ہو جائیں جن پر شریعت اسلامی انہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ میں سعودی عرب کو اس نوعیت کی ایک جدید ریاست بنانے کا متمنی ہوں جس میں سائنس اور صنعت، اسلام کے روحانی اور اخلاقی ورثے سے پوری ہم آہنگ ہو جائیں۔

شاہ فیصل کے گیارہ سالہ دور میں ترقی کے کام اس کثرت سے اور تیزی سے انجام دیے گئے کہ سعودی عرب جو دنیا کے پس ماندہ ترین ملکوں میں شمار ہوتا تھا اب دنیا کے خوشحال اور ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں داخل ہو چکا ہے۔ شہروں اور بندرگاہوں کو جدید طرز پر توسیع دی گئی۔ ہوائی اڈے تعمیر کیے گئے، ملک میں سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ حرم میں توسیع کی گئی اور حاجیوں کو مختلف سہولتیں فراہم کی گئیں۔ شاہی محلوں کو تعلیمی اور رفاہی اداروں کے سپرد کر دیا گیا۔ مکہ معظمہ جدہ اور ریاض میں نئی یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے۔ صنعتوں کو ترقی دی گئی اور ۱۹۶۷ء میں فولاد سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ سعودی عرب میں پانی کی کمی کی وجہ سے زرعی ترقی کا کام بڑا مشکل ہے۔ شاہ فیصل کے دور میں اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ نئے زیر زمین ذخیرے دریافت کیے گئے اور برساتی پانی کو روک کر ندی نالوں پر جگہ جگہ بند تعمیر کیے گئے۔

خارجی میدان میں شاہ فیصل کے دور میں جو کارنامے انجام دیے گئے وہ داخلی کارناموں سے کم اہم نہیں۔ شاہ فیصل جب تخت پر بیٹھے تھے تو عرب دنیا انتہا پسندانہ قوم پرستی، نسل پرستی، سوشلزم اور دوسرے غیر اسلامی نظریات کی زد میں تھی۔ عرب دنیا کے یہ سیکولر اور سوشلسٹ عناصر سعودی عرب کو اپنے نظریات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ سعودی عرب پر رجعت پسند ہونے اور امریکہ کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا حالانکہ یہ الزام لگانے والے ملک خود روس کے ایجنٹ تھے۔ صدر ناصر کے زمانے میں دوسرے عرب ملکوں کی طرح سعودی عرب کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کی گئی اور حکومت کا تختہ تک پلٹنے کی کوشش کی گئی۔ شاہ فیصل نے نہ صرف یہ کہ ان تمام نظریات سے سعودی عرب کو بچایا بلکہ چند سالوں کے اندر کئی عرب ملکوں کو اپنا نقطہ نظر اور طرز عمل بدل دینے پر مجبور کر دیا۔ شاہ فیصل کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے فلسطین کے مسئلہ کو جسے صرف عرب مسئلہ سمجھا جاتا تھا اسلامی دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔

شاہ فیصل نے خارجی معاملات میں بڑی دانش مندانہ اور معتدل پالیسی اختیار کی۔ انہوں نے عرب ملکوں پر زور دیا کہ مسلمانوں کی بھلائی آپس میں لڑنے میں نہیں ہے بلکہ اتحاد میں ہے۔ اس پالیسی کے تحت شاہ فیصل نے کئی ملکوں کے اختلافات دور کئے اور مخالفوں سے سمجھوتے کیے۔ صدر ناصر نے جب نہر سویز کو قومی ملکیت میں لیا اور برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کر دیا تو فیصل نے جو سعودی وزیر خارجہ تھے مصر سے اختلاف کے باوجود مصری فیصلے کی تائید کی اور برطانیہ اور فرانس کی مذمت کی۔ صحرا کے مسئلے پر مراکش اور الجزائر کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ یمن اور مصر کے درمیان تصفیہ کرالیا۔ شام اور عراق کے درمیان دریائے فرات کے پانی پر تنازعہ دور کرانے میں مدد دی۔ ایران اور اس کے پڑوسی عرب ملکوں کے درمیان اختلاف دور کر دیے۔

اتحاد اسلام

اتحاد اسلام شاہ فیصل کا بہت بڑا نصب العین تھا اور وہ خوش قسمت انسان تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اس مقصد میں بے مثال کامیابی حاصل کر لی۔ ۱۹۶۲ء میں رابطۂ عالم اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی جو مسلمانوں کی پہلی حقیقی بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اگر چہ یہ تنظیم شاہ سعود کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی لیکن اس کے اصل روح رواں شاہ فیصل تھے جو اس وقت وزیر خارجہ تھے۔ اس کے

بعد شاہ فیصل نے اپریل ۱۹۶۵ء میں حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے ایک اجتماع میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو اسلام کی بنیاد پر متحد کرنے کا عہد کیا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسی سال انہوں نے ۸ نومبر سے اسلامی ملکوں کا دورہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ایران گئے، اس کے بعد بالترتیب اُردن، سوڈان، پاکستان، ترکی، مراکش گئی، مالی اور تونس گئے۔ شاہ فیصل اگست ۱۹۶۶ء میں ترکی گئے تھے۔ وہ پہلے عرب سربراہ تھے جنہوں نے ترکی کا دورہ کیا۔ اس دورے سے نہ صرف سعودی عرب اور ترکی کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں مدد ملی بلکہ عربوں اور ترکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کا ایک نیا دَور شروع ہوگیا اور وہ زخم بھرنے لگے جو عربوں کی بغاوت کی وجہ سے ترکوں پر لگے تھے۔ شاہ فیصل نے انقرہ میں صاف صاف اعلان کیا کہ ہماری طاقت کا سرچشمہ صرف اسلام ہے۔ تونس جہاں وہ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۶۶ء کو پہنچے تھے ان کے دورے کی آخری کڑی تھا۔ عرب دنیا میں یہ دورے رحلات الخیر یعنی بھلائی کے سفر کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دوروں میں شاہ فیصل نے یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی نجات صرف اسلام سے وابستہ ہے اور ان کی بھلائی اسلامی اتحاد سے وابستہ ہے۔ وہ کسی بلاک سے خواہ وہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی امید وابستہ نہ کریں۔ ان بلاکوں کی امداد اخلاص پر مبنی نہیں اغراض پر مبنی ہوتی ہے۔ اخلاص صرف اسلامی دنیا میں ملے گا۔

ان دوروں میں شاہ فیصل نے اسلامی اتحاد کے لیے جو راہ ہموار کی وہ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شکست کے بعد اور مستحکم ہوگئی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں جب خرطوم میں عرب سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تو شاہ فیصل نے جمال عبدالناصر کو گلے لگا لیا اور ان تمام مخالفانہ پالیسیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مصر کو وسیع پیمانے پر مالی امداد فراہم کی تاکہ مصر جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے نتیجے میں ہونے والے مالی نقصانات کو پورا کر سکے۔ شاہ فیصل کی اعتدال پسندی اور تدبر پر مبنی پالیسی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی اور مصر اور عرب ملکوں میں ان کو پسند کیا جانے لگا۔ اگست ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کے واقعہ کے بعد عرب اور اسلامی ملکوں کو شاہ فیصل کے موقف کی صداقت کا یقین ہوگیا اور تمام اسلامی ملک ایک تنظیم کے تحت متحدہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ۲۲ ستمبر تا ۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ء رباط (مراکش) میں دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمان سربراہوں کی کانفرنس ہوئی، جس کا بعد میں جدہ میں مستقل دفتر قائم کر دیا گیا۔ اس تاریخ

کے بعد سے اسلامی دفتر (سیکرٹریٹ) کے تحت مختلف قسم کی اسلامی کانفرنسوں کا انعقاد پابندی سے ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اسلامی کانفرنس اور اسلامی سیکرٹریٹ کی شکل میں ایک ایسا فورم مل گیا ہے جس میں اسلامی دنیا کے مسائل زیر بحث آتے ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا فخر صرف شاہ فیصل کو جاتا ہے۔

شاہ فیصل اپنے تدبر کی بدولت افریقی ملکوں پر بھی اثر انداز ہوئے۔ انہوں نے سوڈان اور صومالیہ کو اشتراکی چنگل میں جانے سے بچایا اور ان ملکوں کو ہر ممکن امداد فراہم کی۔ سعودی عرب نے افریقہ کے غیر مسلم ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی حمایت بھی کی اور ان کو بھی اتنے وسیع پیمانے پر امداد فراہم کی کہ افریقہ میں اسرائیل کا اثر زائل ہونے لگا اور اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصر اور اسرائیل کی جنگ کے دوران جب عرب ملکوں نے سعودی عرب کی قیادت میں امریکہ اور مغربی ملکوں کو تیل دینا بند کر دیا تو افریقہ کے غیر مسلم ملکوں نے بھی عربوں کی تائید کی۔

شاہ فیصل نے اسلامی ملکوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اقتصادیات، تعلیم اور دوسرے موضوعات پر ماہرین کی عالمی کانفرنسیں طلب کیں اور نوجوان مسلمانوں کے اجتماعات کیے۔ ان تمام کارروائیوں نے مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ایک دوسرے کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور ان کو حل کرنے کے لیے مشترکہ طریق کار طے کر سکیں۔ رابطۂ عالم اسلامی کی تنظیم ان کے دَور میں ایک مؤثر تنظیم بن گئی اور اس قابل ہوگئی کہ سعودی عرب کی مالی امداد سے دنیا میں اسلام کی تبلیغ کر سکے اور مسلمان اقلیتوں کی مدد کر سکے۔ جدہ یونیورسٹی میں مسلمان اقلیتوں سے متعلق ایک مستقل شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ اس وقت یورپ، امریکہ کے ہر شہر میں کوئی مسجد، کوئی اسلامی مرکز ایسا ضرور ملے گا جسے سعودی عرب سے امداد مل رہی ہے۔ یہ سارے کام شاہ فیصل کے شروع کیے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے ساتھ سعودی عرب کے شروع سے خصوصی تعلقات قائم ہیں۔ پاکستان اور سعودی عرب میں دوستی کا پہلا معاہدہ شاہ ابن سعود کے زمانے میں ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا۔ شاہ فیصل کے دَور میں ان تعلقات کو بہت فروغ ملا۔ سعودی عرب ان چند ملکوں میں ہے جنہوں نے سرکاری سطح پر مسئلہ کشمیر میں پاکستان کے موقف کی کھل کر تائید کی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاکستان بھارت جنگ میں سعودی عرب نے پاکستان کی بڑے پیمانے پر مدد کی۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں شاہ فیصل نے پہلی

مرتبہ پاکستان کا دورہ کیا اور اس موقع پر اسلام آباد کی مرکزی جامع مسجد کے سارے اخراجات خود اٹھانے کا اعلان کیا۔ ۱۹۶۷ء میں سعودی عرب اور پاکستان کے درمیان فوجی تعاون کا معاہدہ ہوا جس کے تحت سعودی عرب کی بری، بحری اور فضائی فوج کی تربیت کا کام پاکستان کو سونپ دیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں سعودی عرب سے تمام برطانوی ہوابازوں اور فنی ماہرین کو رخصت کر دیا گیا اور ان کی جگہ پاکستانی ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سعودی عرب نے پاکستانی ماہرین کو ہزاروں کی تعداد میں ملازمتیں فراہم کیں۔ ۱۹۷۳ء کے سیلاب میں مالی امداد فراہم کی اور دسمبر ۱۹۷۵ء میں سوات کے زلزلہ زدہ علاقوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ایک کروڑ ڈالر کا عطیہ دیا۔ ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا تو شاہ فیصل کو بہت رنج ہوا اور انہوں نے بنگلہ دیش کو اس وقت بھی تسلیم نہیں کیا جب پاکستان نے اس کو تسلیم کر لیا۔ شاہ فیصل جنہوں نے بادشاہ ہو کر بھی سادہ زندگی گذاری بقول ایک رہنما کے صرف سعودی عرب کے بادشاہ نہیں تھے بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے مشفق باپ اور وفادار دوست تھے اور ان کی حیثیت عالم اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک چھتری کی تھی، امریکن یونیورسٹی کے ایک عرب طالب علم نے جو ان کا بھتیجا بھی تھا ۲۵۔ مارچ ۱۹۷۵ء کو آنحضرت کے جشن ولادت کے موقع پر شاہی دربار میں گولی مار کر شہید کر دیا۔

شاہ فیصل کے بعد ان کے بھائی خالد بن عبدالعزیز جو ولی عہد بھی تھے بادشاہ منتخب ہوئے۔ شاہ خالد بڑی حد تک ان ہی پالیسیوں پر عمل کر رہے ہیں جن کی تشکیل شاہ فیصل کے دور میں ہوئی تھی۔

شیخ احمد زکی یمنی

اس جگہ شیخ احمد زکی یمنی کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو سعودی عرب میں پٹرول اور معدنی وسائل کے وزیر ہیں۔ وہ اگرچہ شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے لیکن بلاشک وشبہ وہ شاہ فیصل کے بعد سعودی عرب کی دوسری سب سے اہم شخصیت ہیں۔ اُن کو عربوں کی تیل کی حکمت عملی کا اصل دماغ سمجھا جاتا ہے۔ ہم کرنٹ بایوگرافی (current biography) ۱۹۷۵ء سے ان کے حالات پیش کرتے ہیں۔

شیخ احمد زکی یمنی ۱۹۳۰ء میں مکہ یا طائف میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا عثمانی دور میں مفتی اعظم تھے اور والد سعودی عرب کے قاضی القضاۃ۔ زکی یمنی نے مکہ میں ابتدائی تعلیم کے بعد قاہرہ

یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انیس سال کی عمر میں قانون کی سند لے کر سعودی عرب واپس آئے۔ وہ حافظ قرآن بھی ہیں۔ احمد زکی یمنی سعودی وزارت خزانہ میں مختصر ملازمت کے بعد ۱۹۵۳ء میں امریکہ چلے گئے جہاں انہوں نے ہارورڈ لا اسکول سے قانون کی سند لی۔ ۱۹۵٦ء میں واپس آ کر جدہ میں قانون کی نجی پریکٹس شروع کر دی۔ دو سال بعد ولی عہد شاہ فیصل نے جو ان کے بہت بڑے سرپرست تھے احمد زکی کو مجلس وزراء کا قانونی مشیر مقرر کیا۔ ۱۹٦۰ء میں وہ وزیر مملکت ہو گئے۔ اسی سال تیل کی امریکی کمپنی آرامکو نے تیل کی قیمت کم دی جس سے سعودی عرب کو نقصان پہنچا۔ مارچ ۱۹٦۲ء میں احمد زکی کو تیل کا وزیر مقرر کیا گیا اور انہوں نے ٹیکس کا نیا نظام قائم کیا جس سے سعودی عرب کی آمدنی میں اٹھارہ کروڑ ڈالر کی آمدنی بڑھ گئی۔ یہ احمد زکی کا پہلا بڑا کارنامہ تھا۔ اسی سال وہ آرامکو کے بورڈ آف ڈائرکٹر میں شامل کر لیے گئے۔ اگلے سال انہوں نے پٹرول اور معدنیات کی نئی تنظیم (general pettoleum and mineral organization) قائم کی جو سعودی عرب کی کمپنی ہے اور اس کا مقصد تیل کے وسائل کو ترقی دینا ہے۔ اسی سال ۱۹٦۳ء انہوں نے آرامکو کے تعاون سے ظہران (dahran) میں پٹرولیم اور معدنیات کا کالج قائم کیا جہاں سعودی باشندوں کو تیل سے متعلق فنی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب اس کالج کو جامعہ بترول یعنی پٹرول یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔

۱۹٦۴ء میں شاہ فیصل کے بادشاہ ہونے کے بعد احمد زکی یمنی کا اثر بڑھ گیا۔ انہوں نے پٹرول کو قومیانے کی بجائے اس میں شرکت کا تصور پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکی کام بھی کرتے رہیں اور سعودی عرب بتدریج آرامکو سے سب اختیارات حاصل کر لے۔ شروع میں آرامکو نے اس کی مخالفت کی لیکن پھر یہ اصول تسلیم کر لیا۔ جنوری ۱۹٦۸ء میں احمد زکی یمنی کی کوششوں سے تیل برآمد کرنے والے عرب ملکوں کی تنظیم (OPEC) قائم ہوئی اور وہ اس کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ فروری ۱۹۷۱ء میں معاہدۂ تہران ہوا جس کے تحت چھ ملکوں میں کمپنی نے تیل کی قیمت بڑھا دی اور مارچ ۱۹۷۲ء میں آرامکو نے شرکت کا اصول منظور کر لیا۔ معاہدہ کے تحت ۱۹۸۱ء میں آرامکو میں سعودی عرب اکاون فیصد حصہ کا مالک ہو جائے گا۔ احمد زکی یمنی کا یہ دوسرا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل کی جنگ کے دوران عربوں نے تیل کو امریکہ اور اسرائیل کے سرپرست ملکوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ احمد زکی یمنی

نے اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کیا۔انہوں نے امریکہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسرائیل کی لامحدود امداد بند کردے۔ جنگ کے دوران سعودی عرب نے تیل کی پیداوار تیس فیصد تک کم کردی اور امریکہ کو تیل برآمد کرنے کی مقدار دس فیصد کم کردی تاکہ امریکہ اسرائیل کو جنگ بند کرنے اور عرب علاقوں کو خالی کرنے پر مجبور کرے۔ یہ پابندی مارچ ۱۹۷۴ء تک قائم رہی۔اس کے بعد سعودی عرب نے تیل کی قیمت میں اضافہ کردیا۔تیل کی یہ حکمت عملی خاصی کامیاب ہوئی اور جزیرہ نمائے سینا اور جولان کا ایک حصہ اسرائیل کو خالی کرنا پڑا جس کے نتیجے میں نہر سویز دوبارہ کھل گئی۔احمد زکی یمنی کی یہ تیسری اور اب تک آخری بڑی کامیابی ہے۔اس سلسلے میں جب احمد زکی یمنی نے یورپ کا دورہ کیا تو اخبار گارجین نے ۸۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ یورپ پر تاتاریوں کے حملے اور مسلمانوں کے ویانا کی دیواروں تک پہنچنے کے بعد یورپ کو جس زبردست مشرقی سفیر سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ احمد زکی یمنی ہیں۔

احمد زکی یمنی صرف تیل کی قیمت کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خام مال کی قیمت زیر بحث آئے اور فنی تعلیم عام ہو۔ وہ ایسے طویل المیعاد معاہدوں کے حق میں ہیں جو تیل پیدا کرنے والے اور خرچ کرنے والے ملکوں میں توازن کا باعث ہوں۔ وہ جمہوری اصلاحات کے حامی نہیں۔احمد زکی ''اسلامی قانون اور موجودہ مسائل'' نامی کتاب کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب ان لیکچروں پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۹۶۷ء میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں دیے تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں اور ہفت روزہ ٹائم مورخہ ۱۷۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کے مطابق وہ مغربی لباس میں بھی وہی سہولت محسوس کرتے ہیں جو عربی جُبہ میں محسوس کرتے ہیں۔

شاہ فیصل کے انتقال کے بعد شاہ خالد نے ان کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا ہے اور اس وقت وہ تیل برآمد کرنے والے ملکوں کی تنظیم (OPEC) کے ممتاز ترین ترجمان ہیں۔

نظم و نسق

سعودی عرب انتظامی طور پر پانچ صوبوں میں تقسیم ہے۔ حجاز، عسیر، نجران، نجد اور مشرقی صوبہ جسے پہلے الحساء کہا جاتا تھا۔حجاز میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس شہر واقع ہیں۔جدہ اور رابغ کی بندرگاہیں بھی اسی صوبے میں ہیں۔سعودی عرب کا گرمائی صدر مقام طائف بھی حجاز میں

واقع ہے۔ سعودی عرب کا دارالحکومت اور جدہ کے بعد ملک کا سب سے بڑا شہر ریاض نجد میں واقع ہے۔ مشرقی صوبہ تیل کی پیداوار کا مرکز ہے۔ ظہران، خُبر، دمام اور راس طنورہ کے شہر اس صوبے میں ہیں۔

سعودی حکومت میں اگرچہ بادشاہت قائم ہے، لیکن حکومت عدالت کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ سعودی عدالتیں ابن سعود کے زمانے سے آزاد ہیں۔ فیصلے شرع کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ تعزیری قوانین بھی شرعی ہیں۔ چوری پر ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں اور شرابیوں کو دُرّے لگائے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں ملکی اور غیر ملکی میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ سعودی عرب کی عورتیں اگرچہ لباس مغربی انداز کا پہنتی ہیں لیکن باہر نکلتے وقت پردہ کرتی ہیں۔ سعودی معاشرہ مخلوط معاشرہ نہیں ہے حتیٰ کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہر سطح پر علیحدہ مدرسے موجود ہیں۔ ملک میں ابھی تک پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز قائم نہیں ہوئی۔ حکمراں کی مدد کے لیے مجلس وزراء قائم ہے جس میں شاہی خاندان کے وڈیروں اور عوام سے لیے گئے وزیروں کی تعداد برابر ہے۔ مجلس وزراء فیصلہ اکثریت سے کرتی ہے لیکن شاہی منظوری ضروری ہے۔ مجلس وزراء کے علاوہ ایک مشاورتی کونسل اور ایک مجلس علماء بھی ہے۔ تمام اہم فیصلے مجلس وزراء، مشاورتی کونسل اور مجلس علماء کے باہمی تعاون سے کیے جاتے ہیں۔ شاہ فیصل کی نامزدگی اسی طرح ہوئی تھی۔ نچلی سطح پر میونسپل کونسلیں، ضلعی کونسلیں اور قبائلی اور دیہی پنچائتیں قائم ہیں۔ ہر شخص انصاف کے لیے بادشاہ تک پہنچ سکتا ہے اور عوام کی شکایت سننے کے لیے ایک مستقل دفتر قائم ہے۔ ملک میں چونکہ سیاسی جماعتوں کے قیام کی اجازت نہیں اور آزادی تحریر بھی نہیں ہے اس لیے یہ معلوم کرنا آسان نہیں کہ عوام موجودہ نظام سے کہاں تک مطمئن ہیں۔ بظاہر سعودی عرب کا یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔ عوام میں کوئی بے چینی نظر نہیں آتی اور نہ کسی سیاسی گھٹن کا پتہ چلتا ہے جو بادشاہی یا آمرانہ نظاموں کی خصوصیت ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں اور عوام کی ضروریات زیادہ سے زیادہ پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غذائی اشیاء کی قیمتیں کم رکھنے کے لیے حکومت متعلقہ لوگوں اور اداروں کی مالی مدد کرتی ہے۔ ۱۹۶۹ء سے کفالت عامہ یعنی سوشل سکیورٹی کا محکمہ قائم ہے جو معذوروں، بیروزگاروں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے وظائف دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو بہت سے اسلامی ملکوں میں ابھی تک شروع نہیں ہوا۔ طبی سہولتیں تمام

ملکی اور غیر ملکی افراد کے لیے مفت ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ملک میں پچاس سے زیادہ شفاخانے تھے جن میں آٹھ تا نو ہزار بستر تھے۔ ان کے علاوہ پانچ سو سے زیادہ مراکز صحت تھے۔ ریاض کے نواح میں حال ہی میں شاہ فیصل طبی شہر تعمیر کیا گیا ہے جو فنی سہولتوں کے لحاظ سے دنیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید شفاخانہ سمجھا جاتا ہے۔ مکانات تیزی سے تعمیر کیے جارہے ہیں تاکہ ہر شخص کو ذاتی مکان مہیا کیا جاسکے۔

آبی وسائل اور زراعت

سعودی عرب کا بڑا حصہ بے آب و گیاہ ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ یمن سے ملے ہوئے عسیر کے پہاڑوں کو چھوڑ کر جہاں دس انچ تک سالانہ بارش ہوجاتی ہے باقی ملک میں برائے نام بارش ہوتی ہے۔ ندی نالے بھی نہیں۔ ملک کی شادابی چند نخلستان تک محدود ہے اور ملک کے تمام بڑے شہر ان ہی نخلستانوں کے گرد آباد ہیں۔ پانی کی کمی سعودی عرب کا سب سے نازک مسئلہ ہے۔ حکومت اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کررہی ہے۔ بیرونی ملکوں کے ماہروں کی مدد سے زیرِ زمین پانی کے ذخیروں کی تلاش کی جارہی ہے۔ وادی جیزان ابھا (عسیر) خیبر اور دوسرے مقامات پر بارش کا پانی روکنے کے لیے بند تعمیر کیے گئے ہیں اور مزید تعمیر کیے جارہے ہیں، جن سے نہری آبپاشی کا رقبہ ایک لاکھ بیس ہزار ہیکٹر (تین لاکھ ایکڑ) سے بڑھ کر ایک لاکھ ستر ہزار ہیکٹر (چار لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ) ہوگیا ہے۔ آبپاشی کی ان سہولتوں کی وجہ سے زرعی پیداوار اور پھلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی صوبے میں الخرج کے نخلستانوں کو جہاں پانی کی کثرت سے ایک بڑے زرعی علاقے میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ جہاں جدید طرز پر کاشت کو ترقی دی جارہی ہے اور میلوں تک کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس علاقے میں چاول کی بھی کامیاب کاشت کی گئی ہے۔ ۱۹۶۴ء کے ایک جائزہ کے مطابق ملک میں ایک کروڑ بارہ لاکھ ایکڑ زمین ایسی ہے جس پر کاشت ممکن ہے، لیکن اس میں صرف نو لاکھ ۶۲ ہزار ایکڑ زمین اس وقت زیر کاشت تھی اور مزید پندرہ لاکھ ایکڑ ایسی زمین تھی جس پر کاشت ہوسکتی ہے۔ لیکن ۸۸ لاکھ ایکڑ زمین ایسی ہے جو کاشت کے لائق تو ہے لیکن پانی نہ ہونے کی وجہ سے اس پر فی الحال کاشت ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی تحقیقات کی جارہی ہے اور اس کو زیر کاشت لانے کے لیے پانی کے

وسائل تلاش کیے جا رہے ہیں۔

سعودی عرب کے ساحلی علاقوں میں سمندر کے پانی کو بھی کام میں لایا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے ساحلی شہروں میں کھارے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کے کارخانے جتنی بڑی تعداد میں سعودی عرب میں ہیں دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہیں۔ موجودہ کارخانوں کے علاوہ بیس نئے کارخانے دمام، راس طنورہ، جُبیل، نیبو، جدہ اور دوسرے مقامات پر زیر تعمیر ہیں، جن کی تکمیل کے بعد دُنیا میں کھاری پانی سے جس قدر میٹھا پانی بنایا جاتا ہے اسکی نصف مقدار صرف سعودی عرب کے کارخانے فراہم کرنے لگیں گے۔ ان میں بعض کارخانوں میں روانہ کئی کروڑ گیلن پانی میٹھے پانی میں تبدیل کیا جا سکے گا۔

پٹرول اور معدنیات

سعودی عرب کی خوشحالی کا دارومدار پٹرول کی پیداوار پر ہے جسے بجا طور پر زرسیاہ کہا جاتا ہے۔ پٹرول کے ذخیروں کی دریافت سلطان ابن سعود کے زمانے ہی میں ہوگئی تھی۔ سلطان نے کیلیفورنیا (امریکہ) کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو جولائی ۱۹۳۳ء میں تیل کی تلاش کا ٹھیکہ دیا تھا اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں راس طنورہ کے علاقے میں پہلی مرتبہ تیل دریافت ہوا اور مئی ۱۹۳۹ء تک یہاں سے تیل نکالنے کا کام شروع ہوگیا۔ بعد میں اس کمپنی کو عرب امریکی تیل کمپنی (aramco) کا نام دے دیا گیا اور ایک معاہدہ کے تحت اس نے تیل برآمد کرنا شروع کر دیا۔[1] تیل کی برآمد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں پیداوار ۳۴ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ اس وقت سعودی عرب تیل کی پیداوار میں روس اور امریکہ کے بعد دنیا کا تیسرا اور اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ تیل کے محفوظ ذخیروں کی تعداد بھی کافی ہے اور یہ ذخیرے جلد ختم ہونے والے نہیں۔ قدرتی گیس کے ذخیرے اس کے علاوہ ہیں جن کی مقدار کا اندازہ تین ارب پندرہ کروڑ مکعب میٹر ہے۔ تیل کی آمدنی نے سعودی عرب کی کایا پلٹ دی ہے۔ تیل کی کثرت پیداوار کی وجہ سے عالمی سیاست میں سعودی عرب کلیدی کردار ادا کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ مغربی ملکوں کی نگاہیں تیل کی قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لیے سعودی عرب پر لگی رہتی ہیں۔ اگر سعودی عرب مختلف

---

(۱) ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء کو سعودی حکومت نے آرامکو کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

ملکوں میں جمع شدہ رقم ایک سکے سے دوسرے سکے میں منتقل کر دے تو عالمی منڈی میں زلزلہ آ سکتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران سعودی عرب کی اس قوت کا دنیا کو ایک ہلکا سا اندازہ ہو چکا ہے۔ سعودی عرب کا دنیا سے عرب اور بین الاقوامی اقتصادیات پر کتنا اثر ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی مبصرین کے نزدیک مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا کوئی حل اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوگا جب تک سعودی عرب کی مہر تصدیق اس پر نہ لگے گی۔

معدنیات کے معاملے میں بھی سعودی عرب خوش قسمت معلوم ہوتا ہے۔ ابھی معدنیات کی تلاش کا کام ابتدائی مرحلے میں ہے اور ان کو نکالنے کا کام بھی شروع نہیں ہوا، لیکن گزشتہ چند سالوں میں سونے، چاندی، لوہے اور یورینیم کے وسیع ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ سعودی گزٹ کی ایک اطلاع کے مطابق شمال مغربی سعودی عرب میں حال ہی میں اعلیٰ درجہ کے خام لوہے کے تیس کروڑ ٹن کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مدینہ کے شمال مشرق میں تانبے، سونے اور چاندی کی کانیں دریافت ہوئی ہیں۔

صنعت وحرفت

پٹرول سے ہونے والی آمدنی کا ایک بڑا حصہ حکومت صنعتی ترقی پر صرف کر رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء تک جب سلطان ابن سعود کا انتقال ہوا ملک میں صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سعودی عرب میں صنعتی زندگی کا آغاز تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور سیمنٹ کے کارخانوں سے ہوا۔ اس کے بعد جدہ، ریاض، اور مشرقی صوبے میں تیزی سے کارخانے قائم ہونا شروع ہوئے اور ۱۹۷۹ء تک چھوٹے بڑے کارخانوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ کارخانے سیمنٹ، شکر سازی، سائیکل اور موٹر اسمبلی پلانٹ، کیمیاوی کھاد اور پٹرول پر مبنی صنعتوں کے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں سیمنٹ کی پیداوار نو لاکھ ٹن تھی۔ ۱۹۷۸ء تک یہ مقدار ۲۵ لاکھ ٹن ہوگئی۔ ملک میں تعمیرات کا کام کس تیزی سے ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیمنٹ کی یہ پیداوار بھی ناکافی ثابت ہو رہی ہے اور ۱۹۷۷ء میں سعودی عرب کو ۵۵ لاکھ ٹن سیمنٹ درآمد کرنی پڑی۔ چنانچہ سیمنٹ کی پیداوار میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ ملک اس معاملے میں درآمد کا محتاج نہ رہے۔ ۱۹۶۷ء میں سعودی عرب کو ۵۵ لاکھ ٹن سیمنٹ درآمد کرنی پڑی۔ چنانچہ سیمنٹ کی

پیداوار میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ ملک اس معاملے میں درآمد کا محتاج نہ رہے۔ ۱۹۶۷ء میں سیمنٹ میں پہلی اسٹیل رولنگ مل قائم ہوئی اور اب خلیج فارس کے کنارے جبیل کے مقام پر فولاد سازی کا پہلا کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے جو شروع میں ۸½ لاکھ ٹن فولاد تیار کرے گا۔ بعد میں یہ مقدار بڑھا کر چودہ لاکھ ٹن کر دی جائے گی۔ جدہ سعودی عرب کا پہلا صنعتی شہر تھا۔ اس کے بعد دمام میں ۱۹۷۰ء میں دوسرا صنعتی مرکز قائم کیا گیا جہاں ۱۹۷۸ء تک پچیس کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ اب مشرقی صوبے میں جُبیل اور حجاز میں نیبوع کے مقام پر دو عظیم صنعتی شہر تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ یہ شہر فولاد سازی، پٹروکیمیکل صنعتوں، کیمیاوی کھاد کے کارخانوں تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنے کے کارخانوں پر مشتمل ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے آخر تک جب یہ دونوں شہر مکمل ہو جائیں گے تو سعودی عرب میں شہری منصوبہ بندی کا وہ سب سے اچھا نمونہ ہوں گے۔ منصوبہ کے مطابق ۱۹۹۷ء میں جُبیل کی آبادی ایک لاکھ ستر ہزار ہ جائے گی اور ینبوع کی آبادی ۲۰۰۰ء تک ڈیڑھ لاکھ ہو جائے گی۔ مشرقی صوبے سے ینبوع تک ۷½ سو میل لمبی ایک نئی پائپ لائن ڈالی جا رہی ہے۔ اب تک سعودی عرب کا تیل بحری جہازوں کے ذریعہ جنوبی عرب اور عدن کا چکر لگا کر یورپ بھیجا جاتا تھا۔ اب زیر تعمیر پائپ لائن کے بعد کئی ہزار میل کا فاصلہ بچ جائے گا اور سعودی عرب کا تیل کم وقت اور کم خرچ پر یورپ پہنچ سکے گا۔ تیل کی پائپ لائن کے متوازی ینبوع تک قدرتی گیس کی پائپ لائن بھی بچھائی جا رہی ہے۔ ینبوع میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ بھی تعمیر کیا جائے گا۔ مشرقی صوبے میں ایک فرانسیسی کمپنی ایٹمی تحقیقات کا مرکز قائم کرنے کا ایک منصوبہ بھی تیار کر رہی ہے۔ اسی صوبے میں الخرج کے مقام پر اسلحہ سازی کا ایک بہت بڑا مرکز بھی تعمیر کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۸۵ء میں جب سعودی عرب کا تیسرا پنج سالہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا تو صنعتی لحاظ سے ایشیا کا یہ پسماندہ ملک صنعتی ملکوں کی صف میں آ جائے گا۔ سعودی حکومت کا کہنا ہے کہ ہم چند سالوں میں وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو یورپ نے ڈیڑھ سو سال کی مدت میں حاصل کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت سعودی عرب، کویت اور خلیج فارس کی ریاستوں میں جس وسیع پیمانے پر تعمیر و ترقی کا کام ہو رہا ہے وہ اُنیسویں صدی کے اواخر میں جاپان میں ہونے والی صنعتی ترقی کی یاد دلاتا ہے جس کے نتیجے میں جاپان نصف صدی کے اندر دنیا کے سب سے بڑے صنعتی اور ترقی یافتہ ملکوں کی صف

میں آ گیا تھا۔

پانی کی کمی کے علاوہ افرادی قوت کی کمی بھی سعودی عرب کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ملک رقبہ میں بہت بڑا ہے لیکن آبادی بہت کم ہے۔ ملک کو ترقی دینے کے جن وسیع منصوبوں پر عمل کیا جارہا ہے ان کے لیے آدمی ملک کے اندر سے فراہم نہیں ہوسکتے۔ یہ کمی دوسرے ملکوں سے ماہرین، کاریگر اور مزدور درآمد کر کے پوری کی جارہی ہے۔ اس وقت ملک کی ایک چوتھائی آبادی یعنی تقریباً بیس لاکھ افراد باہر کے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی تعداد یمن کے باشندوں کی ہے، اس کے بعد فلسطین، لبنان اور مصر و شام کے عرب ہیں۔ ایشیائی ملکوں میں پاکستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد ہندوستان، جاپان اور کوریا کے باشندے ہیں۔

رسل و رسائل

سعودی عرب جیسے وسیع و عریض ملک میں رسل و رسائل کی ترقی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جب وزارت مواصلات قائم ہوئی تھی تو پختہ سڑکوں کی لمبائی صرف دو سو کلومیٹر تھی۔ اس کے بعد سڑکوں کی تعمیر کا کام اس تیزی سے ہوا کہ ۱۹۷۵ء تک پختہ سڑکوں کی لمبائی گیارہ ہزار کلومیٹر تک پہنچ گئی۔ دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں سڑکوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور توقع ہے کہ ۱۹۸۰ء تک تیرہ ہزار کلومیٹر طویل پختہ سڑکوں کا اور دس ہزار کلومیٹر طویل دیہی سڑکوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۹۷۵ء میں ملک میں موٹروں کی تعداد دو لاکھ تھی جو ۱۹۸۰ء میں پانچ لاکھ ہو جائے گی۔

سعودی عرب میں ریلوے لائن کی تعمیر پر اب تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ سعودی عرب کی پہلی ریلوے لائن دمام سے ریاض تک ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب تک کوئی ریلوے لائن تعمیر نہیں ہوئی۔ اب موجودہ ریلوے لائن کو براہ مکہ معظمہ بندرگاہ جدہ تک توسیع دینے کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ اس منصوبے کے تحت جدہ سے مدینہ اور دمام سے جبیل تک بھی ریل کی پٹری بچھائی جائے گی۔ حجاز ریلوے لائن کی بحالی کی کوشش بھی کی جارہی ہے، جس کو عربوں نے جنگ عظیم اوّل کے دوران تباہ کر دیا تھا۔ اس کو بحال کرنے کی کوشش ۱۹۲۴ء ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ لیکن یہ ریلوے چونکہ ایک اسلامی وقف تھی اور وہ جس راستے سے گزرتی تھی وہ اب شام، اردن اور سعودی عرب تین ملکوں سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو بحال کرنے کی کوششیں الجھنوں کا

شکار ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۸ء سے حجاز ریلوے لائن کو بحال کرنے کی کوشش سنجیدگی سے شروع کر دی گئی ہے اور اس سلسلے میں مختلف ٹھیکے بھی دیے گئے ہیں۔ اگر یہ لائن بحال ہوگئی تو نہ صرف ایران، ترکی، عراق اور شام سے مدینہ تک ریل کا سفر ممکن ہو جائے گا بلکہ سعودی عرب کے ریل کے زیر تعمیر منصوبوں کی تکمیل کے بعد ان ملکوں سے مکہ معظمہ اور سعودی عرب کے تمام اہم شہروں تک ریل میں سفر کیا جا سکے گا۔

بندرگاہوں کو بھی تیزی سے ترقی دی جارہی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں سعودی بندرگاہوں میں مال اُتارنے کی صلاحیت تیس لاکھ ٹن تک تھی جو ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ناکافی تھی۔ ۱۹۸۱ء تک یہ صلاحیت ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ جدہ اور دمام ملک کے سب سے بڑے بندرگاہ ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں جدہ میں گودیوں کی تعداد ۴۵ اور دمام میں چالیس ہو جائے گی۔ نیبوع اور جُبیل کے بندرگاہ اس کے علاوہ ہوں گے۔ جنوب مغرب میں جنیران کی بندرگاہ کو بھی توسیع دی جارہی ہے۔

حرمین کی مسجدوں کی توسیع

مسجد نبوی اور مسجد خانہ کعبہ کی توسیع بھی سعودی دَور کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ توسیع کے یہ منصوبے سلطان عبدالعزیز بن سعود کے زمانے میں تیار ہو گئے تھے۔ سلطان سعود بن عبدالعزیز کے زمانے میں ان پر کام شروع ہوا اور شاہ فیصل شہید کے زمانے میں بڑی حد تک مکمل ہو گئے۔ خانہ کعبہ کی مسجد حرم کا رقبہ پہلے ۲۹ ہزار مربع میٹر تھا، اب ایک لاکھ ساٹھ ہزار مربع میٹر ہو گیا ہے۔ اب یہاں تین لاکھ افراد ایک وقت میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد نبوی کی توسیع کا کام ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا اور اب اس کا رقبہ سولہ ہزار مربع میٹر ہے۔ مسجد نبوی میں دوسو بتیس نئے ستونوں اور ستر ستر فٹ بلند دو میناروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔[1] اب یہ دونوں مسجدیں جدید اسلامی فن تعمیر کا دنیا میں بہترین نمونہ ہیں۔ حاجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اب بھی ان میں توسیع اور ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ آج کل خانہ کعبہ کے گرد مطاف کی توسیع کی جارہی ہے۔ مطاف کا موجودہ رقبہ چار ہزار مربع میٹر سے بڑھا کر ۸۵ ہزار مربع میٹر کیا جارہا ہے تاکہ چار ہزار کی بجائے ۲۸ ہزار افراد

---

(۱) روزنامہ ڈان کراچی ۱۹۔ نومبر ۱۹۷۷ء

آسانی سے طواف کر سکیں۔ اس کے علاوہ مطاف کے فرش کو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔[1] حرمین کی مساجد کی توسیع کرتے وقت شروع میں پرانی عمارت کو ڈھا کر از سرِ نو تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا، لیکن اس پر ترکوں کو اعتراض تھا کیونکہ قدیم عمارتوں کا بہت بڑا حصہ عثمانی ترکوں کے دور میں تعمیر کیا گیا تھا جن کو ڈھا دینے سے عثمانی دور کی یادگاریں ختم ہو جاتیں۔ سعودی حکومت نے ترکوں کے اس اعتراض کے پیشِ نظر مسجدوں کے پرانے حصے کو اصلی حالت میں رہنے دیا اور نئی تعمیرات مزید زمین پر کی گئیں۔

تعلیم و صحافت

تعلیم جبری نہیں لیکن یونیورسٹی تک مفت ہے۔ طلبہ کو تعلیم کا شوق دلانے کے لیے کثرت سے وظیفے دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں چھ لاکھ لڑکے اور دو لاکھ لڑکیاں مختلف مدرسوں میں زیر تعلیم تھیں اور ملک کی چار یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد دس ہزار تھی۔ ان چار یونیورسٹیوں کے علاوہ دو دینی یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ ایک ریاض میں محمد بن سعود یونیورسٹی اور دوسری مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ یعنی اسلامی یونیورسٹی۔ جامعہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد ۲۔ مئی ۱۹۶۲ء کو شاہ سعود نے رکھا تھا۔ اس کا نصاب تیار کرنے میں مولانا مودودی کی سفارشات سے خاص طور پر مدد لی گئی۔ یہ یونیورسٹی حسب ذیل کالجوں پر مشتمل ہے۔ شریعت کالج، قرآن کالج، حدیث کالج، تبلیغ کالج، عربی زبان کا کالج۔ ان میں کالج کا نصاب چار سال پر مشتمل ہوتا ہے۔ کالج کے بعد دراسات علیا کا نصاب ہوتا ہے جس کے تحت کسی ایک مضمون میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اور پھر طالب علم کو ایم۔ اے کے برابر سند دی جاتی ہے۔ جامعہ اسلامیہ میں چاروں فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں جامعہ اسلامیہ میں ایک سو چھ ملکوں کے پانچ ہزار طلبہ تھے۔ ۱۴۱۵ھ تک یہ تعداد پندرہ ہزار تک پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے تحت ۱۹۸۰ء تک ابتدائی مدرسوں کی تعداد ساڑھے چار ہزار اور طلبہ کی تعداد ساڑھے دس لاکھ، انٹرمیڈیٹ مدرسوں کی تعداد نو سو نوے اور طلبہ کی تعداد دو لاکھ تیس ہزار اور ثانوی مدرسوں کی تعداد دو سو اکتیس اور طلبہ کی تعداد ½۷۲ ہزار ہو جائے گی۔ اس طرح یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد ۱۹۸۰ء تک ۴۳ ہزار ہو جائے گی۔

---

(۱) ایضاً، مئی ۱۹۷۸ء

شاہ فیصل سے پہلے ملک میں صحافت کا وجود نہیں تھا، لیکن اب ریاض، مکہ اور جدہ سے کئی روزنامے، ہفت روزہ اخبار اور ماہنامے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں البلاد (اشاعت ۲۵ ہزار) المدینہ المنورہ (تیس ہزار) اور عکاظ (بیس ہزار) ممتاز عربی روزنامے ہیں۔ عرب نیوز کے نام سے ایک انگریزی روزنامہ اور سعودی بزنس کے نام سے ایک انگریزی ہفت روزہ بھی جدہ سے شائع ہوتا ہے۔ انگریزی اخباروں میں زیادہ عمل دخل لبنان کے عیسائیوں کا ہے اور وہ عرب کی اصلی روح سے زیادہ مغربی اور امریکی افکار کے ترجمان ہیں۔

بیرونی امداد کے ادارے

سعودی حکومت تیل سے ہونے والی آمدنی بڑی دانشمندی سے استعمال کر رہی ہے۔ ایک طرف ایتھوپیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ملکوں کو امداد فراہم کر کے ان کے لیے امداد کا ایک نیا ذریعہ فراہم کر دیا ہے جس سے مغرب کے ترقی یافتہ بڑے ملکوں پر ان پسماندہ ملکوں کا انحصار کم ہو گیا ہے اور دوسری طرف یہ رقم آزادی کی تحریکوں کی مدد اور اشتراکیت کی روک تھام پر خرچ کی جا رہی ہے۔ سعودی عرب کی مدد نے مصر، سوڈان اور صومالیہ کو روسی اثر سے نکالنے اور مراکش میں اشتراکی انقلاب کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے سعودی حکومت نے مختلف امدادی فنڈ فراہم کیے ہیں۔ ان میں دو ارب دس ڈالر کا سعودی ترقیاتی فنڈ سب سے اہم ہے۔ اس فنڈ کا مقصد ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادی مدد کرنا ہے۔ جب موریتانیا نے لوہے اور تانبے کے ذخیروں کو ترقی دینے کے لیے فرانس کی میفرما (meferma) کمپنی کو قومی ملکیت میں لیا تو سعودی عرب نے موریتانیا کو اس فنڈ سے ستر کروڑ ریال کا قرضہ بلاسود فراہم کیا۔ تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں نے جو مختلف امدادی فنڈ قائم کیے ہیں ان میں بھی ہر ایک میں سعودی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس قسم کے اداروں میں عرب فنڈ برائے معاشی ترقی، اسلامی ترقیاتی بنک اور خصوصی عرب امدادی فنڈ برائے افریقہ قابل ذکر ہیں۔ سعودی عرب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سودی کاروبار نہیں کرتا اور جو قرض بھی دیتا ہے وہ سب بلا سود کے ہوتے ہیں۔ سعودی عرب کا مرکزی بنک جو مانیٹری فنڈ کہلاتا ہے بلاسودی کاروبار کرتا ہے۔

فیصل اسلامی بنک

سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے غیر سودی بنکاری کا جو تجربہ کیا جا رہا ہے وہ جدید اقتصادیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس تحریک کے روح رواں شاہ فیصل مرحوم کے صاحبزادے محمد فیصل ہیں اور ان ہی کے نام پر یہ بنک فیصل اسلامی بنک کہلاتے ہیں۔ اس کام کے لیے سعودی حکومت نے کافی سرمایہ فراہم کیا ہے۔ اس کام میں ایک مصری ماہر معاشیات ڈاکٹر احمد نجار ان کے دست راست ہیں۔ ڈاکٹر احمد نجار نے سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں غیر سودی بنکاری کے ابتدائی تجربے کیے پھر انہوں نے سوڈان میں ایک اسلامی بنک قائم کیا اور ایک انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا جس کا مقصد غیر سودی بنکاری کو روشناس کرانا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جرمنی جا کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس وقت ڈاکٹر احمد نجار اسلامی بنکوں کی بین الاقوامی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ ایسوسی ایشن کے صدر شہزادہ محمد فیصل ہیں۔ اس ادارے کا صدر دفتر جدہ میں قائم ہے۔ اس ادارے کی طرف سے ۱۹۷۹ء تک سعودی عرب، مصر، دوبئی، سوڈان، کویت، اُردن اور بحرین میں فیصل اسلامی بنک قائم ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں شہزادہ محمد فیصل اور ڈاکٹر احمد نجار پاکستان بھی آئے تھے تاکہ یہاں اسلامی بنک قائم کر سکیں۔ ایک اسلامی بنک یورپ میں لگزمبرگ میں بھی قائم کیا جا رہا ہے تاکہ وہ عالمی سطح پر سرمایہ کاری کر سکے۔ اسلامی بنکوں کی ایسوسی ایشن اب یہ کوشش کر رہی ہے کہ اسلامی ترقیاتی بنک ان اسلامی بنکوں کے لیے مرکزی بنک کا کردار ادا کرے۔[1]

شاہ فیصل فاؤنڈیشن

رابطۂ عالم اسلامی اور اسلامی کانفرنس[2] کی تشکیل کے علاوہ ایک اور اہم کام جو سعودی عرب میں انجام دیا گیا وہ شاہ فیصل فاؤنڈیشن کا قیام اور اس کے تحت شاہ فیصل بین الاقوامی انعامات کا اہتمام ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۷۶ء میں شاہ فیصل شہید کی یاد میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کے

---

(۱) ماہنامہ "مڈل ایسٹ" (انگریزی) ستمبر ۱۹۷۹ء

(۲) رابطۂ عالم اسلامی اور اسلامی کانفرنس کے بارے میں مزید تفصیل اس کتاب کے ضمیمے میں ملاحظہ کیجیے۔

ناظم (ڈائرکٹر) شاہ فیصل کے صاحبزادے خالد الفیصل ہیں۔ شاہ فیصل فاؤنڈیشن کا مقصد اندرون اور بیرون ملک تعلیمی، رفاہی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کے تحت اس کی طرف سے دنیا کے مختلف ملکوں میں مسجدوں، مدرسوں، اسلامی مرکزوں اور رفاہی اداروں کے قیام میں مدد کی جاتی ہے۔ ریاض میں فاؤنڈیشن کا صدر مقام ہے۔

شاہ فیصل فاؤنڈیشن کی طرف سے نوبل انعام کی طرز پر ایک بین الاقوامی انعام بھی دیا جاتا ہے جو اپنی نوعیت کا اسلامی دنیا میں پہلا بین الاقوامی انعام ہے۔ انعامات کی دوسری سالانہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز نے وضاحت کی کہ "شاہ فیصل فاونڈیشن کے قیام کا مقصد موجودہ دور کے علمی اور فکری تقاضوں کو پورا کرنا ہے تاکہ دینی اور علمی خدمات انجام دینے والے محققین کی ہمت افزائی ہو اور نئی نسلیں رہنمائی حاصل کریں۔ شہزادہ فہد نے اپنی تقریر میں مولانا مودودی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مولانا مودودی نے پہلا شاہ فیصل انعام قبول کر کے فاؤنڈیشن کی عزت افزائی کی۔"

شاہ فیصل انعامات کی تعداد تین ہے۔ ایک انعام اسلامی خدمات پر دیا جاتا ہے، دوسرا اسلامی علوم پر تحقیقات کا انعام ہے اور تیسرا انعام عربی ادب پر تحقیق پر دیا جاتا ہے۔ یہ انعام ایک تمغے اور دو لاکھ ریال پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے پہلے انعامات ۲۔ ربیع الثانی ۲۸۔ فوری ۱۳۹۹ھ۔ ۱۹۷۹ء کو دیے گئے تھے جب کہ پاکستان کے ممتاز مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو اسلامی خدمات کا پہلا انعام دیا گیا تھا۔ اسلامی تحقیقات کا انعام ایک ترک محقق فواد سیزگن (sezgin) کو دیا گیا تھا جو جرمنی میں احادیث پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ اُس سال عربی ادب پر کوئی انعام نہیں دیا گیا۔ کیونکہ کوئی کتاب انعام کے لائق موجود نہیں تھی۔ دوسرے سال ۱۹۔ فروری ۱۹۸۰ء کو فاؤنڈیشن کی طرف سے حسب ذیل افراد کو انعامات دیے گئے:

اسلامی خدمات کا انعام مشترکہ طور پر ہندوستان کے ممتاز عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی اور انڈونیشیا کے نامور سیاست دان اور مفکر ڈاکٹر محمد ناصر کو دیا گیا۔ تمغہ کے علاوہ دونوں کو ایک ایک لاکھ ریال کی رقم دی گئی۔ اسلامی تحقیقات کا انعام ریاض یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کو دیا گیا اور ان کو دو لاکھ ریال دیے گئے۔ ڈاکٹر اعظمی ہندوستان کے رہنے والے ہیں لیکن ۱۹۵۲ء سے ہندوستان سے باہر ہیں۔ طویل عرصے تک مصر اور لندن میں رہے۔ ۱۹۶۶ء میں حدیث پر

ایک تحقیقی کتاب لکھ کر ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔ وہ اب تک چودہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ آج کل وہ کمپیوٹر کے ذریعہ احادیث کو جمع کر کے ان کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کر رہے ہیں۔ عربی ادب کا انعام فلسطین کے ڈاکٹر احسان عباس کو اور مصر کے ڈاکٹر عبد القادر الفط کو مشترکہ طور پر دیا گیا اور ان کو تمغوں کے علاوہ ایک ایک لاکھ روپے ملے۔ یہ دونوں پروفیسر بیروت یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔

اسلام کا مستقبل

سعودی عرب کی حکومت کے ان تمام مثبت اور تعمیری کاموں کے باوجود وہاں کا بادشاہی نظام حکومت اور معاشرہ کو مکمل طور پر اسلامی رنگ دینے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دولت کی کثرت اور شاہی خاندان کی اجارہ داری کی وجہ سے شاہی خاندان کے لوگوں اور امراء و رؤسا میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جو دولت مند اور خوشحال قوموں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ محمد بن عبد الوہاب کی اصلاحی تحریک نے ابتدائی حکمرانوں پر جو اعلیٰ اخلاقی اثرات ڈالے تھے، وہ اب کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات کمزور ہو رہے ہیں اور مغربی تہذیب کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ شاہزادے اور امراء چونکہ با اثر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے خلاف قدم اٹھانا حکومت کے لیے بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ملک میں سیاسی جماعتیں بھی نہیں ہیں جو نظام حکومت اور شاہی خاندان اور عوام پر ان خراب اثرات کو دور کر سکے اور عوام کی تعمیری اور اسلامی انداز میں رہنمائی کر سکیں۔ سعودی عرب سے بادشاہت جلد یا بدیر ختم ہو کر رہے گی۔ لیکن بعد بادشاہت کے خاتمے کے کیا سعودی عرب اپنی موجودہ اسلامی خصوصیات برقرار رکھ سکے گا، ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اگر موجودہ حکومت جمہوری رنگ اختیار کر لے اور اسلامی تحریکوں کو آزادی سے کام کرنے کا موقع فراہم کرے تو مستقبل میں سعودی حکومت کے ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے بقا کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ سعودی حکومت دُنیا کی دوسری اسلامی تحریکوں سے ہمدردی کا اظہار تو کرتی رہتی ہے اور مصر و شام کے اخوان رہنماؤں کو اس نے پناہ بھی فراہم کی ہے لیکن خود سعودی عرب میں سیاسی اور فکری میدان میں اسلامی انداز سے کوئی ٹھوس کام نہیں ہو رہا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ سیاسی نوعیت کے اسلامی اور غیر اسلامی ادب پر خواہ وہ کتابوں کی شکل میں ہو خواہ اخباروں و رسائل

کی شکل میں، سعودی عرب میں داخلہ پر پابندی ہے لیکن مغرب اور عرب ملکوں کی وہ تمام کتابیں اور رسالے جو مغربی ثقافت اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں اور عریانیت اور غیر اسلامی اقدار کے فروغ کا باعث ہیں آزادی سے ملک میں آسکتے ہیں۔ خود سعودی عرب کی ایک خاتون سُمیرا، جنھوں نے قاہرہ اور امریکہ میں تعلیم پائی ہے، شاہ فیصل مرحوم کی ایک صاحبزادی کے تعاون سے ۱۹۶۲ء سے خواتین میں کام کر رہی ہیں اور عورتوں اور بچوں کے لیے ''الشرقیہ'' کے نام سے ایک فیشن میگزین نکالتی ہیں جس کا صدر دفتر پہلے بیروت میں تھا اور اب قاہرہ میں ہے۔ یہ رسالہ تقریباً اسی نہج کا ہے جیسے یورپ اور امریکہ کے فیشن میگزین ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے رسالوں کی وجہ سے مملکت سعودیہ میں مغربی تہذیب تیزی سے پھیل رہی ہے اور سینما گھروں کی تعمیر پر پابندیوں کے باوجود گھر گھر فلم پروجیکٹر موجود ہیں جن کے ذریعہ مغرب کی اور عرب دنیا کی عریاں اور فحش فلمیں تک دکھائی جاتی ہیں۔ لیکن شاہی خاندان کے افراد کی سرپرستی کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھ سکتی۔

یکم محرم ۱۴۰۰ھ ۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو خانہ کعبہ کی بے حرمتی کا جو غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا اور جس کے مرتکب افراد کو سرکاری طور پر مرتدین کے نام سے پکارا گیا تھا، اس کے بارے میں بھی عام خیال یہی ہے کہ یہ واقعہ سعودی عرب میں بڑھتے ہوئے غیر اسلامی اثرات کے خلاف ایک طرح کا احتجاج تھا جو اختلاف کے اظہار کا کوئی جمہوری ذریعہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تخریب اور تشدد کی شکل میں ظاہر ہوا۔

خاندان سعودیہ کے حکمران

پہلا دور

۱۔ محمد بن سعود	۱۷۳۵ء تا ۱۷۶۵ء
	۱۱۴۸ھ ۱۱۷۹ھ
۲۔ عبدالعزیز	۱۷۶۵ء تا ۱۸۰۳ء

	۱۱۷۹ھ		۱۲۱۸ھ
۳۔سعود	۱۸۰۳ء	تا	۱۸۱۴ء
	۱۲۱۸ھ		۱۲۲۹ھ
۴۔عبداللہ	۱۸۱۴ء	تا	۱۸۱۸ء
	۱۲۲۹ھ		۱۲۳۳ھ

دوسرا دور

۱۔سلطان عبدالعزیز بن سعود	۱۹۰۲ء	تا	۱۹۵۳ء
۲۔شاہ سعود بن عبدالعزیز	۱۹۵۳ء	تا	۱۹۶۴ء
			۱۳۸۴ھ
۳۔شاہ فیصل بن عبدالعزیز	۱۹۶۴ء	تا	۱۹۷۵ء
	۱۳۸۴ھ		۱۳۹۵ھ
۴۔شاہ خالد بن عبدالعزیز	تخت نشینی		۱۹۷۵ء
			۱۳۹۵ھ
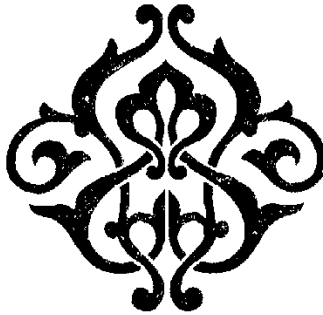
باب ۲۳

جمہوریہ یمن

جزیرہ نمائے عرب میں سعودی حکومت کے بعد سب سے بڑی اور اہم مملکت یمن کی ہے یمن جزیرہ نما کا سب سے زرخیز اور شاداب ملک ہے۔ یہاں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ظہور اسلام سے 2½ ہزار سال پہلے یمن تہذیب وتمدن کا ایک بڑا مرکز تھا۔ ابتدائی اسلامی دور میں یمن اسلامی خلافت کا ایک حصہ تھا۔ تیسری صدی کے وسط میں جب عباسی خلافت کو زوال ہوا تو خلیفہ متوکل علی اللہ ۸۴۷ء/ ۲۳۲ھ تا ۸۶۱ء/ ۲۴۷ھ کے زمانے میں یمن میں ایک مستقل اور آزاد حکومت قائم ہوگئی۔ بعد میں فاطمیوں، سلجوقیوں، ایوبیوں اور مصر کے مملوک سلاطین کی مختلف اوقات میں یمن پر حکومت قائم رہی لیکن یمن پر مضبوطی کے ساتھ کوئی بھی حکومت قائم نہیں کرسکا، اور عملاً یمن آزاد اور نیم آزاد رہا۔ جغرافیائی لحاظ سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے یمن اسلامی دور میں علوم وفنون اور صنعت وحرفت کی ترقی میں وہ مقام حاصل نہ کرسکا، جس پر دوسرے اسلامی ملک دنیا میں بین الاقوامی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے پہنچ گئے تھے۔ پھر بھی یمن نے قدیم دور میں کئی ایسے محقق اور اہل علم پیدا کیے جن کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان میں مورخ حمدانی متوفی ۹۴۵ء/ ۳۳۴ھ مرتضیٰ زبیدی ۱۷۲۳ء تا ۱۷۹۱ء اور امام شوکانی ۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۴ء کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم کے زمانے میں یمن عثمانی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ء میں عدن پر بھی عثمانی ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ یمن پر عثمانی ترکوں کی بالادستی ۱۶۳۰ء تک قائم رہی لیکن اس کے بعد ترک فوجیں واپس ہوگئیں، اور یمن میں مقامی حکمرانوں کا دور دورہ ہوگیا۔ ترک ۲۴۲ سال بعد پھر یمن واپس آگئے اور ۱۸۷۲ء میں پورے یمن کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ ترکوں کا یہ تسلط ۱۹۱۸ء تک قائم رہا، اس مدت میں یمنی باشندوں نے بار بار بغاوتیں کیں، لیکن ان کو سختی سے دبا دیا گیا۔ ان بغاوتوں میں موجودہ صدی کے شروع میں امام یحییٰ

(۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۸ء) کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ امام یحییٰ کا تعلق زیدی[1] فرقہ سے تھا جس کے حکمران تیسری صدی ہجری یا نویں صدی سے یمن کے پہاڑی حصوں میں اپنی آزادی قائم رکھنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ امام یحییٰ نے ۱۹۱۱ء میں بغاوت کی تھی لیکن جلد ہی ترکوں اور امام یحییٰ کے درمیان تصفیہ ہوگیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ عظیم کے دوران یمن کے باشندوں نے ترکوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی، حالانکہ اسی زمانہ میں شمال میں حجاز کا علاقہ عربوں کی بغاوت کی وجہ سے ترکی سے کٹ چکا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں کی شکست کے بعد ترک فوجیں واپس ہوگئیں۔ اور یمن کے پورے ملک پر امام یحییٰ کی حکومت مستحکم ہوگئی۔

امام یحییٰ (۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۸ء)

امام یحییٰ ترکوں سے آزادی کی جنگ لڑنے کی وجہ سے بہت مقبول ہوگئے تھے۔ لیکن مطلق العنان حکمران بن جانے کے بعد امام یحییٰ ایک سخت گیر حاکم بن گئے۔ ان کی ظالمانہ پالیسی کا اندازہ امام یحییٰ کے اس قول سے ہوسکتا ہے کہ کتے کو بھوکا رکھو تا کہ وہ تمہارے پیچھے چلتا رہے۔ امام یحییٰ نے تعلیم کو پھیلنے سے روکا اور یمن کو ساری دُنیا سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یمن ان کے ۴۴ سالہ دورِ حکومت میں ترقی کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ جب کہ ان کے پڑوس میں سعودی عرب اس سے نصف مدت میں ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا، حالانکہ تعلیمی اور معاشی لحاظ سے دونوں ملک اس صدی کے آغاز میں ایک ہی سطح پر تھے۔ امام یحییٰ کے دور میں یمن نے ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کا رُکن بنا۔

امام یحییٰ کے ظلم وستم کی وجہ سے یمنی باشندے جو ترکوں سے نجات پانے کے لیے زیدی ائمہ کے پرچم تلے جمع ہوگئے تھے خود زیدی اماموں سے نجات پانے کی کوششیں کرنے لگے۔ یمن کے حریت پسندوں نے جن میں خود امام یحییٰ کا لڑکا شامل تھا، عدن میں مقیم ہوگئے جہاں ۱۸۳۹ء سے برطانوی حکومت قائم تھی۔ ان حریت پسندوں نے یمن میں آئینی اصلاحات لانے

---

[1] زیدی فرقہ امام زید کی طرف منسوب ہے جو حضرت حسینؓ کے صاحبزادے امام زین العابدین کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اموی خلیفہ ہشام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن جنگ میں شہید ہوگئے۔ ان کے قتل کے بعد ایک مستقل فرقہ پیدا ہوگیا جو امام باقر کے بعد امام زید کو امام مانتا ہے اور اسی نسبت سے زیدی کہلاتا ہے۔ زیدی حضرت علیؓ کی دوسرے صحابہ پر فضیلت کے قائل ہیں اور حضرت علیؓ کو خلافت کا حقدار سمجھتے ہیں لیکن دوسرے خلفاء کا بھی احترام کرتے ہیں اور ان کی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں۔

کے لیے ایک انجمن بنائی۔ یہ انجمن ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتی تھی جو جمہوری ہونے کے ساتھ ساتھ یمن کی روایات کے مطابق بھی ہو۔ حریت پسند امامت کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مجلس قانون ساز کے ذریعہ امام کی ذاتی اور من مانی حکومت پر پابندی لگانے کے حق میں تھے۔ یہ انجمن عدالتی، انتظامی اور معاشی اصلاحات چاہتی تھی اور ہر قسم کے مدرسے قائم کر کے جدید تعلیم کو عام کرنا چاہتی تھی۔

یمن کے ان حریت پسندوں میں علماء بھی شامل تھے۔ انہوں نے امام یحییٰ کے سامنے درخواستیں پیش کیں اور عوام کے مصائب کا ذکر کر کے اصلاحات پر اصرار کیا۔ انھوں نے امام کو خبردار کیا کہ اگر ان خرابیوں کو نہ روکا گیا تو مملکت تباہ ہو جائے گی۔ امام یحییٰ نے ان مطالبات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام اور حریت پسندوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور امام یحییٰ ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء کو قتل کر دیے گئے۔

امام یحییٰ کے قتل کے بعد عبداللہ بن احمد الوزیر کی بیعت اور دستوری حکومت کا اعلان کیا گیا۔ ایک قومی منشور مرتب کیا گیا اور عوام کی نمائندہ مجلس شوریٰ براہ راست انتخاب کے ذریعہ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس انقلاب کے محرک درمیانی طبقے کے فوجی قبائل نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ انقلاب کے رہنماؤں میں محمد محمود زبیری جیسے وطن دوست اور اسلام پسند اور فضیل ورتلانی جیسے عرب رہنما شامل تھے۔ مگر یہ پہلا انقلاب پائیدار ثابت نہ ہوسکا۔ امام یحییٰ کا لڑکا احمد اپنے حامیوں کو لے کر صنعا پر حملہ آور ہوا اور انقلاب کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد انقلاب کے حامی چن چن کر قتل کیے گئے۔ اور ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ محمود زبیری، فیصل ورتلانی اور عبداللہ بن علی خوش قسمتی سے بچ گئے کیونکہ وہ عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل کو یمن کی صورت حال سے مطلع کرنے کے لیے باہر جا چکے تھے۔ یہ ابھی جدہ میں تھے کہ ان کو انقلاب کے ناکام ہونے کی خبر ملی۔ ورتلانی نے شام میں، عبداللہ بن علی نے ہندوستان میں اور محمد محمود زبیری نے پاکستان میں پناہ حاصل کی۔ محمود زبیری [1] کو پاکستان کی سی۔ آئی ڈی نے گرفتار کر کے حکومت یمن کے سپرد کرنا چاہا، مگر کراچی میں سعودی عرب کے سفیر نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا اور پھر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی سفارش سے امام احمد نے زبیری کو معاف کر دیا۔

---

(۱) زبیری کچھ مدت تک جامعہ عباسیہ بہاولپور میں عربی کے مدرس رہے اور پھر کراچی میں مقیم ہو گئے اور ریڈیو پاکستان کے عربی پروگرام میں اسلامی موضوعات پر تقریریں کرتے رہے۔ انھوں نے مولانا حالی اور اقبال کی نظموں کو بھی عربی میں منتقل کیا۔

امام احمد

امام احمد کا دور حکومت (۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۲ء) تشدد اور انتقام کا دور تھا انھوں نے جہاں جہاں حریت پسندی اور انقلاب کے جراثیم دیکھے انہیں ختم کر دیا۔ مظالم کی وجہ سے تقریباً ایک لاکھ یمنی ہجرت پر مجبور ہوئے۔ امام احمد کے آخری دور میں حریت پسند عناصر نے اپنی داخلی اور بیرونی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ یمن کے نامور ادیب اور عالم شیخ عبداللہ حکیمی نے عدن میں بیٹھ کر اپنی تحریک چلائی۔ محمود زبیری بھی پاکستان سے قاہرہ پہنچ گئے اور وہاں ایک دوسرے حریت پسند احمد نعمان کے ساتھ مل کر اتحاد یمنی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور صوت الیمن کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ وہ قاہرہ ریڈیو سے بھی اپنا پیغام یمنی عوام تک پہنچاتے تھے۔ اس زمانے میں یمن کے اندر بھی حریت پسندوں کے خفیہ مراکز قائم ہو گئے تھے۔ امام احمد نے جب خود کو ہر طرف سے گھرا ہوا پایا تو انھوں نے مصری رہنما جمال عبدالناصر کا سہارا لیا اور یمن ۱۹۵۸ء میں متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ یمن کے حریت پسند اس شمولیت کے حق میں نہیں تھے۔ مصر نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور امام احمد کو ایک محب وطن رہنما قرار دیا۔

مصر اور یمن کا یہ اتحاد زیادہ دن قائم نہیں رہا۔ مصری حکمرانوں نے یمنی عوام کے دینی اور سیاسی رجحانات کا لحاظ کیے بغیر یمن پر بھی اشتراکی قوانین اسی طرح نافذ کرنا شروع کر دیے جس طرح وہ خود مصر اور شام میں نافذ کر رہے تھے۔ یہ بات امام احمد کو ناگوار گزری اور انہوں نے اشتراکیت کی مذمت میں ایک پُرزور نظم لکھی اور مصری حکام کی خوب خبر لی۔ امام احمد کے اس فعل پر مصری حکام بگڑ گئے، اور یمن کو متحدہ عرب جمہوریہ سے خارج کر دیا گیا۔ اب وہی امام احمد جس کو قاہرہ والے محب وطن کہتے تھے، اب وہ رجعت پسند، غیر ملکی ایجنٹ اور غدار وطن قرار دیے گئے۔ یمن اور مصر میں یہ کشمکش جاری تھی کہ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۶۲ء کو دوسرا انقلاب آ گیا اور امام احمد کو قتل کر دیا گیا۔ امام احمد کے قتل پر یمن کے تمام حلقوں نے خوشی کا اظہار کیا اور فوجی افسروں کا جو گروپ انقلاب کے لیے پر تول رہا تھا، وہ بھی مطمئن ہو گیا۔ اور احمد کے لڑکے امام بدر کو امام قرار دے دیا گیا۔

یمن جمہوریہ بن گیا

یمن کے متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہونے کے بعد سے مصر نے یمن کے معاملات میں

گہری دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ مصری حکام نے ایک طرف شہزادہ بدر سے تعلقات بڑھائے اور دوسری طرف یمن کے حریت پسندوں کے ساتھ مل کر سازشیں شروع کر دیں۔ امام بدر شروع سے مصری حلقوں میں جمہوریت نواز اور ترقی پسند سمجھے جاتے تھے اور قاہرہ ریڈیو ۱۹۵۵ء سے ستمبر ۱۹۶۲ء تک اُن کو مسلسل مجاہد، وطن دوست اور ترقی پسند کے خطابات سے نوازتا رہا اور امام بدر سیف الاسلام آخر وقت تک صدر ناصر کے گہرے دوستوں میں شمار ہوتے رہے، لیکن جب امام بدر کی حکومت پر پورا ملک مطمئن ہو گیا تو مصر کو اپنے درپردہ منصوبے ناکام ہوتے نظر آئے اور اس نے اُن فوجی افسروں کی مدد سے جن سے پہلے ہی سازش ہو چکی تھی امام بدر کی تخت نشینی کے ایک ہی ہفتہ بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو امام بدر کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اور یمن میں امامت کا نظام ختم کر کے ملک کو جمہوریہ قرار دے دیا۔ یہ انقلاب یمنی فوجوں کے نئے چیف آف اسٹاف عبداللہ السلال (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء) لائے۔ جو جدید طرز پر منظم کی ہوئی فوجوں کے سربراہ تھے۔ ۳۱۔ اکتوبر کو پہلا عارضی آئین نافذ کر دیا گیا جس کے تحت عبداللہ سلال یمن کے پہلے صدر نامزد کیے گئے۔

یمن کا بادشاہت سے جمہوریہ بن جانا یقیناً عرب کی تاریخ میں ایک انقلابی تبدیلی تھی اور یہ صدر ناصر کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مصری مدد شامل نہ ہوتی تو شاید یہ تبدیلی اتنی جلدی نہ آ سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مصری مداخلت نے عرب کی سیاست میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں جن کا پوری عرب دنیا پر اثر پڑا اور یمن بھی کئی سال تک جمہوریت سے استفادہ نہیں کر سکا۔ امام محمد بدر بچ کر نکل گئے اور اپنے حامی قبائل کی مدد سے یمن کی جمہوری حکومت سے جنگ شروع کر دی۔ مصر نے صدر سلال کی مدد شروع کر دی۔ دو سو مصری افسر پہلے ہی سے موجود تھے جنہیں امام بدر نے اختیارات سنبھالتے ہی قاہرہ سے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔ انقلاب کے تیسرے دن باقاعدہ مصری فوجیں بھی یمن میں داخل ہونا شروع ہو گئیں اور ان کی تعداد جلد ہی ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ مصر اور سعودی عرب میں پہلے ہی سے کشمکش چل رہی تھی اور صدر ناصر نے سعودی حکومت کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ اب سعودی عرب کے پڑوس میں مصر کی ایک طفیلی حکومت بھی قائم ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ صورت حال سعودی عرب کے لیے خطرناک تھی۔ چنانچہ سعودی حکومت نے امام بدر کی فوجی مدد شروع کر دی اور اس طرح یمن پورے پانچ سال تک خانہ جنگی میں مبتلا رہا۔

مصری فوجی مداخلت کا دوسرا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کی فوجی قوت تقسیم ہوگئی اور ۱۹۶۷ء میں جب مصر اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑی تو پچاس ہزار کے قریب مصری فوج اسرائیل سے جنگ کرنے کی بجائے یمن میں خود اپنے مسلمان اور عرب بھائیوں سے برسرپیکار تھے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے مقابلے میں مصر کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اور یہ ایسی زبردست شکست تھی کہ پورا جزیرہ نما سینا مصر کے ہاتھ سے نکل گیا اور جس کے اثرات سے عرب دنیا کو اب تک نجات نہیں مل سکی ہے۔ بالآخر شاہ فیصل کا تدبر اور اعتدال پسندی کام آئی۔ شاہ فیصل نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد یمن کو خانہ جنگی سے نجات دلانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور ۲۴۔ اگست ۱۹۶۵ء کو ناصر اور شاہ فیصل نے تصفیہ کر لیا کہ یمن کے مستقبل کا فیصلہ استصواب کے ذریعہ سے کیا جائے۔ لیکن یمن کے شاہ پسند اور جمہوریت پسند استصواب پر راضی نہیں ہوئے جس کی وجہ سے مصری فوجیں یمن میں موجود رہیں۔ اگست ۱۹۶۷ء میں عرب سربراہوں کی کانفرنس میں ناصر اور فیصل دونوں نے یمن سے اپنی اپنی فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا اور سال ختم ہونے تک ساری مصری فوجیں واپس چلی گئیں۔

عبدالرحمن الاریانی (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۴ء)

مصری مداخلت نے یمن کے عوام پر بُرا اثر ڈالا۔ مصری جبر اور ان کی طرف سے سوشلزم کی حمایت نے یمن کے لوگوں کو مصر سے اسی طرح متنفر کر دیا جس طرح شام کے باشندے مصر سے متنفر ہوگئے تھے۔ چنانچہ مصری فوج کے واپس ہوتے ہی یمن کی مجلس صدارت کے ایک رکن عبدالرحمن اریانی نے ۵۔ نومبر ۱۹۶۷ء کو عبداللہ سلال کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے بعد شاہ پسند پسپا ہونا شروع ہو گئے اور ۱۹۶۹ء کے آخر تک جمہوریہ کی فوجوں کا پورے یمن پر قبضہ ہوگیا۔ مئی ۱۹۷۱ء میں عبدالرحمن الاریانی دوبارہ صدر منتخب کر لیے گئے۔

عبدالرحمن اریانی کے دور صدارت کا اہم واقعہ جنوبی یمن کا جمہوریہ یمن سے تصادم ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب جنوبی یمن نے برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل کی تو وہاں کمیونسٹوں پر مشتمل قومی محاذ آزادی (نیشنل لبریشن فرنٹ) برسراقتدار آ گیا۔ محاذ آزادی نے اقتدار میں آ کر مخالفوں کے خلاف جبر و تشدد کا وہی طریقہ اختیار کیا جو کمیونسٹ ہر ملک میں اختیار کرتے ہیں۔ اس

تشدد اور دہشت انگیزی کے نتیجے میں جنوبی یمن کے تین لاکھ افراد وطن چھوڑ کر جمہوریہ یمن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ان پناہ گزینوں نے جب جنوبی یمن پر چھاپے مارنا شروع کیے اور جنوبی یمن نے ان کے خلاف جوابی کاروائی کی تو ان جھڑپوں نے اکتوبر ۱۹۷۲ء میں جمہوریہ یمن اور جنوبی یمن کے درمیان باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ اس جنگ میں سعودی حکومت جمہوریہ کی مدد کو آ گئی جب کہ روس نے جنوبی یمن کی مدد کی۔ جنوبی یمن کا علاقہ تاریخی طور پر یمن ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے وہاں کے باشندے دونوں حصوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خواہش کا اظہار جلد ہی ایک تصفیہ کے ذریعہ کیا گیا۔ جو عرب لیگ کے توسط سے ہوا اور طرفین جنگ بندی پر راضی ہو گئے اور اس بات پر کہ دونوں حصوں کو ڈیڑھ سال کے اندر متحد کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ تصفیہ روس کے مفاد میں نہیں تھا اس لیے اس پر اب تک عمل نہیں ہو سکا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

علی عبداللہ صالح

جون ۱۹۷۴ء کو لیفٹیننٹ کرنل ابراہیم الحمادی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جن کو اکتوبر ۱۹۷۷ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے جانشین احمد حسین الغشمی ۲۴۔ جون ۱۹۷۸ء کو پُراسرار دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ اس قتل میں جنوبی یمن کی حکومت ملوث تھی۔ احمد حسین الغشمی کے بعد یمن کی عوامی کونسل نے ۱۷۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو کرنل علی عبداللہ صالح کو شمالی یمن کا صدر منتخب کر لیا۔ اس وقت سے ابھی تک ڈیڑھ سال سے وہی صدر چلے آ رہے ہیں۔ ان کے دور میں اپریل ۱۹۷۹ء میں یمن میں شرعی قوانین نافذ کیے گئے۔

شمالی یمن اور جنوبی یمن کی کشمکش اب بھی جاری ہے۔ عرب ملکوں کی مداخلت پر کچھ دن کے لیے یہ کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور شمالی اور جنوبی یمن کو متحد کرنے کی بات چیت شروع ہو جاتی ہے لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا اور جب تک جنوبی یمن میں کمیونسٹ عناصر کا غلبہ رہے گا جو یمن کے مفاد سے زیادہ روس کے مفاد میں کام کر رہے ہیں اس وقت تک شمالی اور جنوبی یمن کے اتحاد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

تعمیر و ترقی

یمن جزیرہ نمائے عرب کا سب سے زرخیز اور خوبصورت خطہ ہے۔ رقبہ (دو لاکھ مربع

کلومیٹر) ہزار مربع میل اور آبادی ستر لاکھ لگ بھگ ہے۔ وسطی حصہ پہاڑی ہے اور اس میں ساٹ ہزار دو سوفٹ کی بلندی پر دارالحکومت صنعاء واقع ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے صنعاء اور اس کے گردونواح کے علاقہ میں موسم سال بھر خوشگوار رہتا ہے۔ پہاڑوں میں بارش کافی ہوتی ہے اور وسیع علاقوں میں کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور باغات لگے ہوئے ہیں۔ پھل اور کافی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ کھجور، روئی، غلہ خاص کر ذرہ اور مکئی اہم پیداوار ہیں۔ ساحلی علاقہ میں مویشی بانی (بھیڑ، بکری اور اونٹ) کی جاتی ہے۔ کافی، چمڑا، کھالیں اور نمک شمالی یمن کی سب سے بڑی برآمدی پیداوار ہیں۔ پارچہ بافی اور سیمنٹ کے کارخانے ہیں۔

یمن اسلامی دنیا کا انتہائی الگ تھلگ اور پسماندہ ملک ہے۔ قیام جمہوریت کے بعد سے باقی دنیا سے رابطے قائم ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ حکومت جنوبی یمن کے برخلاف غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ترقیاتی کام بھی شروع ہو گئے ہیں اور حکومت تمام بڑے ملکوں سے امداد حاصل کر رہی ہے۔ بندرگاہ حدیدہ سے صنعاء تک چینیوں نے سڑک تعمیر کی ہے۔ بندرگاہ حدیدہ کی تعمیر روسیوں نے کی ہے اور بندرگاہ مُخا سے تعز اور صنعا تک امریکیوں نے سڑک تعمیر کی ہے۔ مدرسے تیزی سے قائم ہو رہے ہیں اور حفظان صحت پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ صنعتوں کا قیام ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ عراق اب تک جنوبی یمن کا طرفدار تھا لیکن روس سے کشیدگی کے بعد اس کے تعلقات جنوبی یمن سے بھی کشیدہ ہو گئے اور اب وہ شمالی یمن سے زیادہ قریب آ گیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں عراق نے شمالی یمن کو ترقیاتی کاموں کے لیے تیس کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا ہے۔ شمالی یمن کے آٹھ دس لاکھ افراد سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔

شمالی یمن کی مجلس قانون ساز ۱۷۹ ممبروں پر مشتمل ہے جن میں بیس ممبروں کو صدر نامزد کرتا ہے۔ آئین دسمبر ۱۹۷۰ء سے نافذ ہے۔ یمن کی پہلی یونیورسٹی صنعاء میں ۱۹۷۰ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت اس میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ خواندگی کا تناسب دس فیصد ہے۔ ۱۹۷۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں طلبہ کی کل تعداد ۶۷ ہزار ہے۔ ڈاکٹروں کی تعداد ایک سو اسی ہے۔ چالیس شفاخانے ہیں جن میں چار ہزار بستر ہیں۔ صنعا کی آبادی ڈیڑھ لاکھ اور تعز اور حدیدہ کی آبادی ایک ایک لاکھ ہے۔

باب ۲۴

جمہوریہ جنوبی یمن

جنوبی یمن کی حکومت یمن کے جنوب اور جنوب مشرق میں عرب کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ یہ خطہ عہد قدیم میں حضرموت کہلاتا تھا اور یمن ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں برطانوی تسلط سے پہلے یہاں کئی خودمختار حکومتیں قائم تھیں اور عدن عثمانی ترکوں کے قبضہ میں تھا۔ برطانیہ نے ۱۸۳۹ء میں عدن پر قبضہ کرلیا اور انتظامی لحاظ سے اپنے نئے مقبوضات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک عدن اور دوسرا ممالک محروسہ۔ ممالک محروسہ ان ریاستوں پر مشتمل تھا جن پر مقامی سلطان اور امیر حکومت کرتے چلے آئے تھے۔

برطانوی دَور میں عدن بین الاقوامی اہمیت کی بندرگاہ بن گیا کیونکہ انیسوی صدی کے آخر میں نہر سویز بن جانے کی وجہ سے یورپ سے ایشیا آنے والے تمام جہاز عدن میں رُک کر ایندھن حاصل کرتے تھے۔ عدن بحیرہ عرب کے علاقہ میں برطانوی فوجوں کا مرکز بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایران میں جب تیل کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تو برطانیہ نے عدن میں تیل صاف کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ بھی قائم کیا۔ عدن کو آزاد بندرگاہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے عدن نے بڑی خوشحالی حاصل کر لی تھی اور تعلیم یافتہ طبقہ کی موجودگی نے آزادی کی تحریکوں کے لیے راہ ہموار کی۔

آزادی

جنوبی یمن میں برطانوی انخلاء سے پہلے قوم پرستوں کی دو جماعتیں قومی محاذ آزادی (NLF) اور جنوبی یمن کی آزادی کا محاذ (flosy) اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ یہ دونوں جماعتیں سوشلزم سے متاثر تھیں۔ ان میں پہلی انتہا پسند تھی اور اس کو روس کی تائید حاصل تھی جب کہ دوسری جماعت اعتدال پسند تھی اور اس کو مصر کی تائید حاصل تھی۔ ان جماعتوں کی طرف سے چلائی ہوئی تحریک آزادی کے پیشِ نظر برطانوی حکومت نے جو بتدریج اپنے

مقبوضات سے دست بردار ہوتی جارہی تھی جنوبی یمن کو ۱۹۶۸ء میں آزادی دینے کا اعلان کیا۔ لیکن ان جماعتوں نے آزادی کے لیے برطانیہ سے مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ انقلاب کے ذریعہ سیاسی تبدیلی لانے کی حامی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ نے کسی سیاسی جماعت کو اقتدار منتقل کیے بغیر ۱۹۶۷ء میں اسی طرح جنوبی یمن کو خالی کر دیا جس طرح بیس سال پہلے فلسطین کو خالی کیا تھا۔ سیاسی جماعتوں کی مسلح کشمکش میں بالآخر قومی محاذ آزادی (NLF) کو کامیابی ہوئی۔[1] اور اس نے ۳۰۔ نومبر ۱۹۶۷ء کو قحطان الشعبی کی قیادت میں حکومت قائم کر لی۔ حکومت کا نام عوامی جمہوریہ جنوبی یمن رکھا گیا اور عدن اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ جون ۱۹۶۹ء کو سالم علی ربایا (Rubaya) نے قحطان الشعبی کو بیدخل کر دیا اور خود صدر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۶۹ء کو تیل صاف کرنے کے کارخانے کے علاوہ تمام بیرونی تجارتی اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں ملک کا نام بدل کر عوامی ڈیموکریٹک جمہوریہ یمن کر دیا گیا۔ اسی سال قحطان الشعبی کو جماعت سے خارج کر دیا گیا اور حکومت نے مخالفین کو پکڑنے دھکڑنے کی ایسی تحریک چلائی کہ جنوبی یمن سے تیس ہزار سے زیادہ لوگ فرار ہو کر شمالی یمن چلے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں جنوبی یمن کی فوج کا شمالی یمن کے رضا کاروں سے تصادم ہو گیا اور ۱۹۷۲ء میں دو ہفتہ تک شمالی اور جنوبی یمن کی فوجوں میں باقاعدہ جنگ ہوئی۔ بالآخر عرب لیگ کی مداخلت کے بعد جنگ بند ہوگئی۔ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو قاہرہ میں شمالی اور جوبی یمن کے نمائندوں کا اجتماع ہوا جس میں فریقین نے دونوں حصوں کو ۱۹۷۳ء کے آخر تک ملانے کا فیصلہ کیا اور ۲۸۔ اکتوبر کو معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس تصفیہ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور دونوں ملکوں کے درمیان پھر بھی کئی تصادم ہوئے۔ جنوبی یمن کا شمالی یمن کے دو صدروں کے قتل میں بھی ہاتھ تھا۔ ۲۴۔ جون ۱۹۷۸ء کو شمالی یمن کے صدر احمد حسین الغشمی ایک پُراسرار دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ خبر کے مطابق جنوبی یمن کے صدر سالم ربیع علی کا ایک ایلچی ان سے ملنے آیا۔ جب اس نے اپنا بریف کیس کھولا تو اس میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا اور صدر احمد حسین الغشمی اور ایلچی دونوں ہلاک ہو گئے۔ شمالی یمن کی حکومت نے قتل کی ذمہ داری جنوبی یمن پر ڈالی

(۱) قومی محاذ آزادی نے جبر و تشدد کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی وجہ سے جنوبی یمن سے تین لاکھ افراد فرار ہونے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے شمالی یمن میں پناہ حاصل کی جہاں سے وہ جنوبی یمن پر حملے کرتے رہتے ہیں۔

اور جنوبی یمن کی حکومت نے اس کا ذمہ دار صدر سالم ربیع علی کو قرار دیا اور ان کے خلاف کارروائی کی۔ صدر سالم مقابلہ کے بعد گرفتار ہو گئے اور جنوبی یمن کی حکومت نے ان کو ۲۶۔ جون کو گولی مار دی۔ لیکن اصل واقعہ یہ تھا کہ صدر سالم جنوبی یمن پر بڑھتے ہوئے روسی اثر کے خلاف تھے اور انہوں نے حبش اور صومالیہ کی جنگ میں جنوبی یمن کی طرف سے حبش کی امداد کی بھی مخالفت کی تھی۔ روس کے حامی عناصر نے ان سے خطرہ محسوس کیا اور ان کے خلاف فوری کارروائی کر کے ان کو ختم کر دیا۔ جنوبی یمن کے کمیونسٹ عناصر کو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر صدر سالم زندہ رہ گئے تو شمالی یمن کے صدر کی قتل کی سازش کا بھانڈا ابھی پھوٹ سکتا ہے۔ سالم ربیع کو سزائے موت دینے کے بعد علی ناصر محمد کو جنوبی یمن کا صدر مقرر کیا گیا۔ پھر ۲۷۔ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ابوالفتح اسماعیل صدر ہو گئے اور علی ناصر محمد وزیر اعظم۔ شمالی یمن کے صدر احمد حسین الغشمی کے قتل کے بعد پھر شمالی اور جنوبی یمن میں تصادم شروع ہو گئے۔ ۱۹۷۹ء میں عراق کی وساطت سے دونوں ملکوں کو متحد کرنے کی پھر ایک بار کوشش کی گئی۔ اس کوشش کے نتیجے میں سرحدی جھڑپیں تو بند ہو گئیں لیکن اتحاد نہ ہو سکا۔

سوشلزم اور اسلام کی کشمکش

جنوبی یمن کے حکمراں اس بات کے دعویدار ہیں کہ اسلام اور سائنٹیفک سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں اور وہ سوشلزم کو نافذ کر کے اسلامی اصولوں ہی کو نافذ کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کا نام محض عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے لے رہے ہیں ورنہ جنوبی یمن میں بھی عراق اور شام کی طرح اسلام کو ہر جگہ سے بیدخل کیا جا رہا ہے۔ شمالی یمن کی حکومت بھی اگرچہ اشتراکی رجحان رکھتی ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے نظریات اور اصلاحات میں اسلامی اصولوں کو برتری حاصل ہے۔ اس کے برخلاف جنوبی یمن کے اشتراکی رہنما انتہاپسندی کی طرف مائل ہیں ۱۹۷۰ء کے اوائل میں جنوبی یمن کی حکمران جماعت قومی محاذ (الجبهة القومیہ) نے عدن کے علماء اور اسلام پسند عناصر کی پکڑ دھکڑ کی۔ عدن کے نامور عالم دین شیخ محمد سالم بیجانی اور متعدد افراد کو گرفتار کیا۔ کسی پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس کا تعلق اخوان المسلمین سے ہے اور کسی کو سعودی عرب کا ایجنٹ کہا گیا۔ اسلامی مرکز بند کر دیے گئے اور اسلامی لٹریچر ضبط کر لیا گیا۔ عدن کے قومی محاذ کے ایک نشریہ میں علماء اسلام اور اسلام کی حمایت میں آواز اٹھانے والوں کو خطاب کر کے کہا گیا:

''اے انسانیت کے دشمنو، اسلام کی حمایت میں تمہارے گلے پھٹ رہے ہیں۔ یہ اسلام جو انسانیت کا دشمن ہے بوسیدہ ہو چکا ہے اور داستان پارینہ ہو چکا ہے۔ تمہارا یہ شور و غل کمیونزم اور مارکسزم اور لینن ازم کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''(۱)

مسجدوں کو حکومت کی تحویل میں لینے اور غیر شرعی عائلی قوانین نافذ کرنے پر جب علماء نے احتجاج کیا تو ان پر سختیاں کی گئیں۔ جولائی ۱۹۷۶ء میں قصبہ شیخ عثمان کے قاضی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ملک کے سب سے بڑے شیخ علی محمد بھامش کو زدوکوب کیا گیا۔ اس سے قبل ایک اور عالم شیخ بیہانی کو حکومت پر تنقید کرنے کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ حکومت کی اس پالیسی کے نتیجے میں عرب کی اس پسماندہ مملکت میں شراب خانوں اور جوئے خانوں کو فروغ ہو رہا ہے۔ جبر و تشدد کے نتیجے میں آبادی کا ایک بڑا حصہ اور بعض اطلاعات کے مطابق تقریباً نصف آبادی ہجرت کر کے شمالی یمن اور سعودی عرب چلی گئی ہے۔ ملک میں صرف ایک سیاسی جماعت ہے یعنی قومی محاذ آزادی جو ۱۹۶۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ ابوالفتح اسمٰعیل جو صدر مملکت بھی ہیں اپنی پارٹی کے سربراہ بھی ہیں۔ ملک کا انتظام ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ایک سپریم پیپلز کونسل (اعلیٰ مجلس عمومی) کے سپرد ہے۔

جنوبی یمن پر کمیونزم کے ساتھ ساتھ روس کے اثرات بھی بہت گہرے ہیں جو جنوبی یمن کو سب سے زیادہ فوجی اور مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عدن میں روس نے ایک بحری اڈہ قائم کر رکھا ہے اور کم از کم یہ بات تو شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جنوبی یمن کے ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں میں روسی فضائیہ اور بحریہ کو سہولتیں حاصل ہیں۔ جنوبی یمن کے اشتراکی شمالی یمن کے علاوہ مملکت عمان میں بھی مداخلت کرتے رہتے ہیں۔

جنوبی یمن ایک بنجر اور خشک ملک ہے اور وسائل کے لحاظ سے اردن کے علاوہ اور تمام عرب ملکوں میں غریب ہے۔ آزادی سے پہلے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ مقام عدن تھا جس کو ایک آزاد بین الاقوامی بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی،(۲) لیکن آزادی جب ملی تو ۱۹۶۷ء کی جنگ کی وجہ سے نہر سویز بند ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی عدن کی اہمیت بھی ختم ہوگئی۔ نہر سویز کے

---

(۱) ترجمان القرآن لاہور مئی ۱۹۷۰ء بحوالہ ہفت روزہ نداالجنوب مورخہ ۱۲۔فروری ۱۹۷۰ء۔

(۲) ۱۹۶۶ء میں چھ ہزار بحری جہاز عدن میں ٹھہرے تھے۔ ان کی وجہ سے دو لاکھ ۲۷ ہزار افراد نے عدن کی سیر کی اور ان سے دو کروڑ بیس لاکھ ڈالر کی آمدنی ہوئی تھی۔

بند ہونے سے تیل صاف کرنے کے کارخانہ پر بھی اثر پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے ساتھ ساتھ عدن میں بدحالی عام ہوگئی اور بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ جون ۱۹۷۵ء میں جب نہر سویز دوبارہ کھل گئی تو عدن کی بندرگاہ کا کاروبار بحال ہوگیا اور تیل صاف کرنے کے کارخانے نے بھی کام شروع کردیا۔ کچھ عرصے سے سعودی حکومت سے جنوبی یمن کی مفاہمت ہوگئی ہے اور ظہران سے عدن تک تیل کی ایک پائپ لائن ڈالنے کے منصوبے پر غور کیا جارہا ہے، اگر یہ منصوبہ مکمل ہوگیا تو جنوبی یمن کی اقتصادی مشکلات کو دُور کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور اس کے بعد شاید جنوبی یمن خود کو روس کے اثر سے آزاد کرا سکے۔

روئی جنوبی یمن کی خاص برآمد ہے۔ ۱۹۷۴ء میں شروع ہونے والے پنجسالہ منصوبے کے تحت محدود آبی وسائل کی مدد سے آبپاشی کو ترقی دی جارہی ہے۔ آزادی کے بعد تعلیم نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ایک لاکھ کے قریب بچے زیر تعلیم تھے اور ۱۹۷۵ء میں ۵ سے ۱۹ سال کی عمر کے ۳۸ فیصد بچے زیر تعلیم تھے جب کہ شمالی یمن میں اسی عمر کے صرف بارہ فیصد بچے زیر تعلیم تھے۔ خواندگی کا تناسب پندرہ فیصد ہے۔ عدن جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے، دارالحکومت ہے۔ مُکلا کی تاریخی بندرگاہ بھی جنوبی یمن میں واقع ہے۔ جزیرہ سقوطرہ، جزیرہ کامران اور جزیرہ پیرم جنوبی یمن کا حصہ ہیں۔
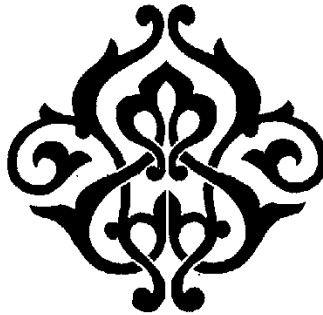
باب ۲۵

مملکت عُمان

مملکت عُمان جسے پہلے مسقط اور عمان کہا جاتا تھا جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ عباسی خلافت کے عروج تک عمان مرکز خلافت سے وابستہ رہا۔ اس کے بعد آزاد ہوگیا۔ پھر بنی بویہ اور سلجوقیوں نے مختصر مدت تک اپنی بالادستی قائم رکھی۔ اس کے بعد عمان کبھی بیرونی اثر سے آزاد ہو جاتا اور کبھی اس پر ایران کی بالادستی قائم ہو جاتی۔ جب یورپ کی قوموں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرلیا تو پرتگالیوں نے عمان پر حملے شروع کر دیے اور ۱۵۰۸ء میں انہوں نے شہر مسقط پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے شہر کو جلا کر خاک کر دیا، ایک قلعہ تعمیر کیا اور مسقط میں اپنا بحری اڈہ قائم کرلیا۔ ۱۶۲۲ء میں جب ایران نے ہرمز سے پرتگالیوں کو نکال دیا تو مسقط کے اس بحری اڈے کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ۱۶۵۰ء میں مقامی عربوں نے پرتگالیوں کو نکال باہر کیا اور ان کے تعاقب میں مشرقی افریقہ تک پہنچ گئے جہاں کی تاریخ پر عمان کے عربوں نے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس تاریخ کے دوسرے حصے میں بیان کر چکے ہیں۔ سترہویں صدی میں عمان کے بحری بیڑے نے پرتگالیوں سے کامیاب جنگیں کیں اور ۱۷۰۰ء تک ان کو مشرقی افریقہ کے بیشتر ساحلی علاقوں سے بے دخل کر دیا۔ ۱۷۴۱ء میں ایران نے آخری مرتبہ عمان پر قبضہ کیا لیکن مسقط کے حکمران احمد بن سعید نے تین سال بعد ہی ان کو نکال دیا۔ عمان کا موجودہ حکمران خاندان اسی وقت سے حکمران چلا آ رہا ہے۔ اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران سعید بن سلطان (۱۸۰۴ء تا ۱۸۵۶ء) ہوا ہے۔ اس نے ۱۸۳۲ء میں اپنا دارالسلطنت مسقط سے زنجبار منتقل کر دیا۔ سعید کے انتقال کے بعد سلطنت عمان اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک زنجبار اور مشرقی افریقہ کا حکمران بنا اور دوسرے کو عمان ملا۔

عمان کی تاریخ کا یہ قدیم دور سعید بن تیمور ۱۹۱۰ء تا ۱۹۷۰ء تک قائم رہا جو اپنے باپ تیمور بن فیصل کے بعد ۱۰۔ فروری ۱۹۳۲ء کو تخت نشین ہوئے تھے اور اپنے خاندان کے تیرہویں

حکمراں تھے۔ اگرچہ ان کا جدید دَور سے تعلق تھا لیکن انہوں نے یمن کے امام یحییٰ کی طرح عمان کو دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی اور ملک کو ترقی دینے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اگرچہ تیل کی تلاش کا کام ۱۹۳۷ء میں ان ہی کے دَور میں شروع ہوا اور ان ہی کے دَور میں ۱۹۶۷ء سے تیل نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ سلطان کے بیٹے قابوس بن سعید (پیدائش دسمبر ۱۹۴۰ء) نے جنہوں نے برطانیہ میں تعلیم پائی تھی جب یہ دیکھا کہ تیل کی آمدنی سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے اور ملک کی ترقی پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے تو انہوں نے ۲۳۔ جولائی ۱۹۷۰ء کو اپنے باپ کو بیدخل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت تک وہی عمان کے حکمراں ہیں۔ سلطان سعید کو لندن پہنچا دیا گیا اور نئے حکمراں نے یقین دلایا کہ وہ ملک کی دولت عوام کی بہتری پر خرچ کریں گے۔

عمان اگرچہ ہمیشہ سے ایک آزاد مملکت رہی ہے لیکن انیسویں صدی سے اس پر برطانیہ کا اثر رہا ہے اور اس سے خصوصی تعلقات قائم رہے ہیں۔ ۱۸۵۴ء میں عمان نے بحری تار کا اسٹیشن قائم کرنے کے لیے جزائر کوریا موریا برطانیہ کے سپرد کر دیے تھے۔ برطانیہ نے جب جنوبی یمن کو خالی کیا تو یہ جزیرے ۳۰۔ نومبر ۱۹۶۷ء کو عمان کو واپس کر دیئے۔ پاکستان کے صوبے بلوچستان کا بندرگاہ گوادر بھی عمان کے قبضے میں تھا جسے ۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو عمان نے پاکستان کو واپس کر دیا۔

جنوبی یمن میں اشتراکی حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں کے کمیونسٹ عناصر نے عمان کو بھی اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں عمان اور خلیج عرب یعنی خلیج فارس کے علاقے کو برطانوی اثر سے آزاد کرانے کے لیے چھاپہ ماروں کی ایک جماعت منظم کی جو تنظیم آزادی برائے خلیج عربی (loag) کہلاتی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں اس کا نام عوامی محاذ برائے آزادئ عمان (Pflb) کر دیا گیا۔ ان چھاپہ ماروں کی سرگرمیوں کا مرکز ظفار کا علاقہ ہے جس کی حدیں جنوبی یمن سے ملتی ہیں۔ عمان نے سعودی عرب اور ایران کی مدد سے دسمبر ۱۹۷۵ء تک ان چھاپہ ماروں کی سرگرمیوں کو پوری طرح کچل دیا۔ ویسے بھی ۱۹۷۲ء میں خلیج فارس سے برطانوی فوجوں کی واپسی اور خلیج فارس کی ریاستوں کی آزادی کے بعد کمیونسٹ چھاپہ ماروں کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی جذباتی کشش ختم ہو چکی تھی۔ سلالہ میں برطانیہ کا اڈہ ابھی تک موجود ہے۔

عمان ۱۹۷۱ء سے اگرچہ اقوام متحدہ کا رکن ہے لیکن عرب لیگ کا رکن نہیں ہے۔ پاکستان نے عمان میں سفارت خانہ ۱۹۷۲ء میں قائم کیا اور ۱۹۷۳ء میں عمان نے پاکستان میں اپنا

سفارت خانہ قائم کیا۔

عمان میں کوئی مجلس قانون ساز نہیں۔ کوئی آئین نہیں۔ قانون سازی سلطانی فرمان کے ذریعہ ہوتی ہے اور سلطان کابینہ کے وزراء کی مدد سے حکومت کرتا ہے۔ ملک انتظامی طور پر ۳۸ ولایتوں میں تقسیم ہے۔ مقدموں کا فیصلہ شرعی عدالتیں کرتی ہیں۔

جغرافیائی ساخت کے لحاظ سے عمان ایک بنجر اور بے آب و گیاہ ملک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۸۲ زار مربع میل میں صرف سات آٹھ لاکھ انسان آباد ہیں۔ نخلستانوں میں ضرورت کے مطابق غلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کھجور، انار اور لیموں برآمد کیے جاتے ہیں۔ صوبہ ظفار کا ساحلی حصہ جہاں سالالہ کا شہر آباد ہے۔ خوش آب و ہوا اور سرسبز علاقہ ہے۔ مسقط کے شمال مغرب میں ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ سو میل تک نخلستان چلے گئے ہیں جہاں کی کھجوریں اپنی لذت کے لیے مشہور ہیں۔ مغرب میں نو ہزار فٹ بلند جبل اخضر پر خاصی بارش ہوتی ہے اور چشموں کی کثرت ہے جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر کاشت کاری ہوتی ہے اور اس کو عمان کے سرسبز اور خوبصورت علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگست ۱۹۶۷ء سے عمان میں پٹرول بھی نکلنا شروع ہو گیا اور ۱۹۷۵ء میں ایک کروڑ ۶۵ لاکھ ٹن تیل نکالا گیا اور ۱۹۷۶ء میں تیرہ کروڑ ۴۳ لاکھ پیپے (بیرل) تیل نکالا گیا۔[1] ایک کروڑ اسی لاکھ ٹن اعلیٰ درجہ کے تانبے کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۸ء تک دس لاکھ ٹن سالانہ کے حساب سے تانبہ نکالا جانے لگے گا۔ حال ہی میں کرومیم اور ایسبسٹس بھی نکلنا شروع ہو گیا ہے۔ پٹرول کی بڑھتی ہوئی آمدنی نے دوسرے عرب ملکوں کی طرح عمان کے لیے بھی تعمیر و ترقی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شہروں کو جدید طرز پر تعمیر کیا جا رہا ہے، بندرگاہیں بنائی جا رہی ہیں اور سڑکیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ مسقط کے پاس مینا الفحل کے نام سے تیل برآمد کرنے کا بندرگاہ تعمیر کیا گیا ہے اور نومبر ۱۹۷۴ء میں مینا القابوس کے نام سے جدید ترین بندرگاہ مکمل کی گئی ہے۔ تیل نکلنے سے پہلے عمان میں ایک بھی پختہ سڑک نہیں تھی۔ اب تین سو میل سے زیادہ پختہ سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ آبادی اور تعلیم کم ہونے کی وجہ سے تعمیری کاموں کے

---

(۱) تیل کمپنی میں ساٹھ فیصد حصے عمان کے ہیں باقی ولندیزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے ہیں۔

لیے باہر سے ماہرین اور کاریگر درآمد کیے جا رہے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں پاکستانی ملازمین کی تعداد بیس ہزار تھی۔ عمان کی حکومت پاکستان میں مشترکہ صنعتی منصوبوں میں بھی دلچسپی لے رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے اور ۱۹۷۶ء میں تیس فیصد بچے ابتدائی مدرسوں میں زیر تعلیم تھے۔

عمان کے اصل باشندے عرب ہیں، لیکن پاکستانی، ہندوستانی، ایرانی اور حبشی النسل باشندے بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کی وجہ سے عربی کے ساتھ اُردو بھی شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عرب باشندے زیادہ تر خارجی عقیدے کے ہیں اور خارجیوں کی مشہور شاخ اباضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک چوتھائی آبادی سُنی عقیدہ رکھتی ہے۔

باب ۲۶

متحدہ عرب امارات

متحدہ عرب امارات ایک نئی مملکت ہے جو ۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وجود میں آئی۔ یہ مملکت عمان اور سعودی عرب کے درمیان خلیج فارس کے جنوبی ساحل پر واقع سات عرب ریاستوں کا ایک وفاق ہے۔ یہ ریاستیں جن کے نام فجیرہ، راس الخیمہ، عجمان، شارجہ، ام القوین، دوبئی اور ابوظہبی ہیں انیسویں صدی میں برطانیہ کے زیر اثر آ گئی تھیں جو خلیج فارس کے علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیان برطانیہ نے ان کے ساتھ خصوصی معاہدے کیے تھے جن کے تحت دفاع اور امور خارجہ کی ذمہ داری برطانیہ پر تھی اور قیام امن کی ذمہ داری ان ریاستوں کے حکمرانوں پر تھی جو شیخ کہلاتے تھے۔ ان معاہدوں کی وجہ سے ان ریاستوں کو صحلنامہ کی ریاستیں اور علاقے کو ساحل صلحنامہ کہا جاتا تھا۔ [1]

جنوری ۱۹۶۸ء میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ۱۹۷۱ء تک خلیج فارس کے علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلا لے گا۔ یہ ریاستیں چونکہ بہت چھوٹی تھیں، علاقہ بھی بنجر اور ریگستانی تھا جس میں آبادی بہت کم تھی اس لیے ان ریاستوں کے حکمرانوں نے مل کر ایک ایسا وفاق بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ایک جھنڈا ایک سکہ اور ایک ترانہ ہو اور ڈاک کا مشترکہ نظام ہو۔ شروع میں قطر اور بحرین کی ریاستوں کو بھی وفاق میں شامل کرنے کی تجویز تھی۔ لیکن ایران کے اس دعوے کی وجہ سے کہ جب تک بحرین کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہو جاتا وہ وفاق کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وفاق کی تشکیل میں دیر ہو گئی اور اگست ۱۹۷۱ء میں بحرین نے وفاق میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد قطر نے بھی انکار کر دیا۔ باقی ریاستوں میں سے چھ نے ۲۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو متحدہ عرب امارات کے نام سے وفاق کے قیام اور برطانیہ سے آزادی کا اعلان کر دیا اور ۹۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو متحدہ عرب امارات کو اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔ وفاق کی ساتویں ریاست راس الخیمہ ۱۹۷۲ء میں وفاق میں

---

[1] انگریزی میں یہ نام اس طرح لکھے جاتے ہیں:

Trucial oman, Trucial Coast, Trucial States, Trucial Shekhdom

شامل ہوئی۔

متحدہ عرب امارات کے پہلے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان ہیں جو ۱۹۶۶ء سے ابوظبی کے حکمراں چلے آ رہے ہیں۔ نائب صدر دوبئی کے شیخ راشد بن سعید المکتوم ہیں جو ۱۹۵۸ء سے دوبئی کے شیخ ہیں۔ مملکت کے انتظام کے لیے ایک مجلس اعلیٰ (سپریم کونسل) ہے جو ساتوں ریاستوں کے حکمرانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجلس میں ابوظبی اور دوبئی کے حکمرانوں کو حق استرداد حاصل ہے۔ یونین کی ایک کابینہ ہے ایک وفاقی عدلیہ ہے اور ایک وفاقی اسمبلی ہے جس کا پہلا اجلاس فروری ۱۹۷۲ء میں ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں ابوظبی نے اپنی جداگانہ حیثیت ختم کر دی اور امارت کا انتظام وفاقی مجلس وزراء کے سپرد کر دیا۔ باقی حکمراں اپنی ریاستوں پر براہ راست حکومت کرتے ہیں۔ وفاق کی اپنی فوج بھی ہے۔ بعض ریاستوں نے اپنی فوجیں وفاقی فوج میں ضم کر دی ہیں، لیکن بعض میں ریاستی فوجیں موجود ہیں۔ متحدہ عرب امارات کا رقبہ ۳۲ ہزار مربع میل (۸۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور دسمبر ۱۹۷۵ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی چھ لاکھ ۵۶ ہزار ہے۔ اس میں دو تہائی آبادی ابوظبی اور دوبئی کی ریاستوں کی آبادی پر مشتمل ہے۔

ترقیاتی منصوبے

''متحدہ عرب امارات'' بھی جنوبی یمن اور عمان کی طرح خشک اور ریگستانی علاقوں پر مشتمل ہے۔ تیل کی دریافت سے پہلے یہاں کے باشندوں کا انحصار ماہی گیری اور سمندر سے موتی نکالنے کے کاروبار پر تھا اور یہ علاقہ دنیا کا مفلس ترین علاقہ تھا۔ لیکن تیل کی دریافت نے چند سال کے اندر اس علاقے کی کایا پلٹ دی اور اب اس کا شمار دنیا کے دولت مند ترین علاقوں میں ہوتا ہے اور ساری دنیا کی نظریں اس علاقے پر لگی ہوئی ہیں۔ پٹرول سب سے پہلے ابوظبی میں ۱۹۵۰ء میں دریافت ہوا لیکن پیداوار کا آغاز ۱۹۶۲ء میں ہوا، اگلے سال دوبئی میں بھی تیل نکلنے لگا۔ شارجہ میں ۱۹۷۴ء سے تیل نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں متحدہ عرب امارات سے تقریباً آٹھ کروڑ ٹن پٹرول نکالا گیا جس میں ساڑھے چھ کروڑ ٹن ابوظبی سے، سوا کروڑ ٹن دوبئی سے اور بیس لاکھ ٹن شارجہ سے نکالا گیا۔ تیل زیادہ تر ساحلی علاقے اور سمندر کے اندر سے نکالا جا رہا ہے۔ ٹھیکے یورپی کمپنیوں کے علاوہ جاپانیوں کے پاس بھی ہیں۔ کمپنیوں میں ساٹھ فیصد حصہ متحدہ عرب

امارات کا ہے۔ تیل کے کنوؤں سے تیل کے علاوہ قدرتی گیس بھی حاصل ہوتی ہے جس کی مقدار ۱۹۷۳ء میں ایک ارب ۹۸ کروڑ مکعب میٹر تھی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں جب عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ ہوئی متحدہ عرب امارات نے عربوں کے موقف کی پُرزور تائید کی اور امریکہ کے لیے تیل کی برآمد پر پابندی لگا کر تیل سے حاصل شدہ نئی قوت کا پورا پورا استعمال کیا۔ جنگ کے بعد متحدہ عرب امارات نے مصر و شام کو وسیع پیمانے پر مالی امداد بھی دی۔ ابوظبی کی تیل کمپنی ۱۹۷۵ء میں قومی تحویل میں لے لی گئی۔

متحدہ عرب امارات کی حکومت تیل کی آمدنی کو مختلف ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کر رہی ہے جس کی وجہ سے گذشتہ دس سال میں اس بنجر اور بے آب و گیاہ علاقہ کی شکل بدل گئی۔ جس علاقے کی طرف کوئی رُخ نہیں کرتا تھا وہ اب ساری دنیا کے لیے باعث کشش بن گیا ہے۔ دوبئی، ابوظبی اور شارجہ میں بین الاقوامی ہوائی اڈے بن گئے ہیں۔ دوبئی اور ابوظبی میں جدید طرز کے بندرگاہ تعمیر ہو گئے ہیں۔ خصوصاً دوبئی کی بندرگاہ کا شمار خلیج فارس کی سب سے بڑی بندرگاہوں میں ہونے لگا ہے۔ دوبئی اور ابوظبی جن کی حیثیت بیس سال پہلے ماہی گیری کی بستیوں سے زیادہ نہیں تھی آج کی آبادی ایک ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے اور تعمیر اور جدید سہولتوں کے لحاظ سے مشرق کے نہیں بلکہ یورپ کے شہر معلوم ہوتے ہیں۔ متحدہ عرب امارتوں کے تمام شہر پختہ سڑکوں سے ملا دیے گئے ہیں۔

فولاد سازی، کیمیاوی کھاد اور المونیم کی صنعت پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ پانی کا مسئلہ سعودی عرب کی طرح سمندری پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے حل کیا جا رہا ہے۔ بندرگاہوں کو بے تحاشا ترقی دی جا رہی ہے۔ خلیج کے علاقہ میں پندرہ بندرگاہیں ہیں جن میں ڈیڑھ سو گودیاں ہیں۔ چند سال میں بندرگاہوں کی تعداد چوبیس اور بندرگاہوں کی تعداد ۲۷۶ ہو جائے گی جو علاقہ کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوں گی۔ سعودی حکومت خلیج کے علاقہ میں اقتصادی روابط کی کوشش کر رہی ہے تاکہ ترقیاتی کام مربوط طریقہ پر ہو سکے اور دوہری محنت سے بچایا جا سکے۔

متحدہ عرب امارات میں طبی دیکھ بھال اور علاج مفت ہے۔ بیرونی ملکوں میں خصوصی علاج کے لیے بھی مریضوں کو مالی مدد دی جاتی ہے۔ دوبئی میں ۱۹۷۴ء میں راشد ہسپتال کے نام سے جدید طرز کا عالی شان شفاخانہ کام کر رہا ہے۔

تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ تعلیم ہر مرحلے پر مفت ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ابتدائی

مدرسوں میں طلبہ کی تعداد پچاس ہزار تھی جو ۱۹۷۱ء کے مقابلے میں دو چند تھی۔ ۱۹۷۷ء میں یہ تعداد ۷۹ ہزار ہوگئی۔ سات سو طلبہ خصوصی مدرسوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ ۳ ذیقعدہ نومبر ۱۹۷۷ء۔ ۱۳۹۷ھ کو ابوظہبی میں العین کے مقام پر پہلی یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔ طلبہ کی تعداد ۱۵½ سو ہے۔ امارت کی ہر ریاست میں ایک ٹیلیویژن اسٹیشن ہے۔

متحدہ عرب امارات اپنی دولت دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری اور ان کی امداد پر بھی صرف کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف خصوصی فنڈ قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں ابوظہبی امدادی فنڈ اور عربوں کی اقتصادی امداد کا ابوظہبی فنڈ قابل ذکر ہیں۔ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کو متحدہ عرب امارات اور ایران میں معاشی تعاون کے کئی معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ پاکستان کے متحدہ عرب امارات سے قریبی تعلقات ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان کئی مشترکہ منصوبے مکمل کئے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ ان میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ، کیمیاوی کھاد کا کارخانہ اور مویشیوں کی افزائش نسل کا منصوبہ قابل ذکر ہیں۔ متحدہ عرب امارات پاکستانی فنی ماہروں اور مزدوروں کے لیے روزگار کا ایک اہم مرکز ہے اور وہاں اس کثرت سے پاکستانی باشندے موجود ہیں کہ اُردو وہاں روز مرہ کی زبان بن گئی ہے اور پاکستانی باشندے کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔

بریمی کے مسئلہ پر متحدہ عرب امارات کا سعودی عرب سے پُرانا جھگڑا اگست ۱۹۷۴ء میں طے ہوگیا اور اب یہ نخلستان متحدہ عرب امارات کی حدود میں آ گئے۔

باب ۲۷

قطر اور بحرین

قطر

قطر کا جزیرہ نما ملک متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے درمیان خلیج فارس کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ رقبہ تقریباً سوا چار ہزار مربع میل (گیارہ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ایک لاکھ اسی ہزار (۱۹۷۵ء) ہے۔ متحدہ عرب امارات کی ریاستوں کی طرح قطر کے تعلقات بھی ایک معاہدے کے ذریعہ برطانیہ سے قائم تھے۔ یہ معاہدہ ۳۔ نومبر ۱۹۱۶ء کو کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب برطانیہ نے خلیج فارس کے علاقے سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے کا اعلان کیا تو قطر نے متحدہ عرب امارات کے وفاق میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن بعد میں یہ فیصلہ بدل دیا اور یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۷۱ء کو قطر اقوام متحدہ کا رکن بنالیا گیا۔

جس وقت قطر ایک آزاد ملک بنا اس وقت شیخ احمد بن علی (۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۲ء) قطر کے حکمراں تھے۔ فروری ۱۹۷۲ء میں ان کے رشتہ کے بھائی شیخ خلیفہ بن حماد الثانی (پیدائش ۱۹۳۲ء) نے جو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھے شیخ احمد کو معزول کر دیا اور خود قطر کے حکمراں ہو گئے۔ اس کے بعد سے قطر میں متعدد معاشی اور معاشرتی اصلاحات کی گئیں۔ اور قطر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

قطر میں جولائی ۱۹۷۰ء سے ایک عارضی آئین نافذ ہے۔ اختیارات وزارتی کابینہ کو حاصل ہیں۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں ایک مجلس مشاورت قائم کی گئی جس کے کچھ ارکان نامزد کیے جاتے ہیں اور کچھ منتخب کیے جاتے ہیں۔

قطر بھی عرب کی بیشتر ریاستوں کی طرح ایک ریگستانی علاقہ ہے اور اس کی خوشحالی کا انحصار پٹرول پر ہے۔ پٹرول کی تلاش کا کام ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا تھا لیکن تیل نکالنے کا کام دسمبر ۱۹۴۹ء میں شروع ہوا۔ تیل نکالنے کا کام ولندیزی اور جاپانی کمپنیوں کے سپرد ہے جن میں

حکومت کا ساٹھ فیصد حصہ ہے۔ قطر میں ۱۹۶۹ء میں ستر لاکھ ٹن تیل نکالا گیا تھا جس کی مقدار ۱۹۷۵ء میں دو کروڑ ٹن پہنچ گئی۔ ۱۹۷۶ء میں ستر لاکھ ٹن تیل نکالا گیا تھا جس کی مقدار ۱۹۷۵ء میں دو کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ ۱۹۷۶ء میں تیل سے ایک ارب ۶۵ کروڑ ڈالر آمدنی ہوئی تھی۔

تیل کی یہ آمدنی مختلف ترقیاتی کاموں پر صرف کی جارہی ہے۔ ملک میں شفاخانے، مدرسے ہوائی اڈے، بندرگاہیں، بجلی گھر، پانی صاف کرکے اس کو میٹھا بنانے کے کارخانے اور سڑکیں تیزی سے تعمیر کی جارہی ہیں۔ ام سعید کے مقام پر تیل کی بندرگاہ بنائی گئی ہے اور دارالحکومت دوحا میں ۱۹۶۹ء میں جدید طرز کی بندرگاہ مکمل ہوگئی ہے۔ دوحا میں ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ قطر میں طبی سہولتیں مفت ہیں اور تعلیم بھی ہر سطح پر مفت ہے۔ ۱۹۷۵ء میں ۲۶ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے۔ سات سو طلبہ بیرونی ملکوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ پختہ سڑکوں کا طول پانچ سو میل ہے۔ ملک میں سترہ ہزار موٹر گاڑیاں ہیں اور ۱۹۷۶ء میں سولہ ہزار ٹیلیفون تھے۔

قطر کے باشندے سعودی عرب کی طرح حنبلی ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر ہیں۔ عارضی آئین کے تحت اسلامی اصولوں پر عمل کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔

بحرین

قطر اور سعودی عرب کے مشرقی صوبے کے درمیان کئی جزیرے پائے جاتے ہیں جن کا مجموعی رقبہ صرف دو سو اکتیس مربع میل (۵۹۸ مربع کلومیٹر) ہے۔ ان میں سب سے بڑے جزیرے کا نام بحرین ہے اور اسی کے نام پر مجمع الجزائر کو بھی بحرین کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرہ تیس میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے۔ دارالحکومت منامہ اسی جزیرہ کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ جزیرہ مُحرّق جو چار میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ دو میل لمبے خشکی کے راستے سے بحرین سے ملادیا گیا ہے۔

خلیج فارس کی دوسری عرب ریاستوں کی طرح بحرین کے بھی ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۲ء کے معاہدوں کے تحت برطانیہ کے ساتھ خصوصی تعلقات قائم تھے اور بیرونی امور برطانیہ کے سپرد تھے۔ خلیج فارس کے علاقے کا برطانوی ریزیڈنٹ بحرین میں رہتا تھا جب کہ دوحا (قطر) اور ابوظہبی میں پولیٹیکل ایجنٹ رہتے تھے۔ جب برطانیہ نے خلیج فارس کے علاقے سے فوجیں واپس بلانے کے فیصلے کا اعلان کیا تو ۲۷/ فروری ۱۹۶۸ء کو بحرین اور قطر نے متحدہ عرب امارات کے وفاق میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ایران کے اس اعلان کے بعد کہ اگر بحرین کے مستقبل

کا فیصلہ نہیں کیا گیا تو ایران متحدہ عرب امارات کے وفاق کو تسلیم نہیں کرے گا۔ بحرین نے وفاق میں شرکت کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ بحرین کا مسئلہ اس وقت بھی ایران اور عرب ملکوں کے درمیان وجہ نزاع ہے۔ ایران کا کہنا ہے کہ برطانوی بالادستی سے پہلے بحرین سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ایران کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ اس لیے برطانیہ کی واپسی کے بعد یہ جزیرہ ایران کو ملنا چاہیے۔ شاہ ایران نے بعد میں یہ موقف اختیار کر لیا کہ اگر بحرین کے باشندے آزادانہ استصواب کے ذریعے ایران سے علاحدہ رہنے کا فیصلہ کریں تو ایران اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائے گا۔ برطانوی فوجوں کی واپسی کے بعد بحرین نے ۱۵ / اگست ۱۹۷۱ء کو اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور ۲۱ ستمبر کو بحرین اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔

جس وقت بحرین آزاد ہوا تھا اس وقت وہاں شیخ عیسیٰ بن سلمان (۱۹۶۱ء تا ۱۹ء) حکمراں تھے جن کا تعلق الخلیفہ نامی خاندان سے تھا جو ۱۷۸۲ء سے جب کہ عربوں نے ایرانیوں کو نکال دیا تھا حکمراں چلا آ رہا ہے۔ شیخ عیسیٰ اس خاندان کے گیارہویں حکمراں تھے۔ خلیفہ خاندان کی کویت کے شاہی خاندان سے رشتہ داری ہے۔

بحرین میں جنوری ۱۹۷۰ء میں ایک کونسل آف اسٹیٹ قائم تھی جو اگست ۱۹۷۱ء کے بعد ریاست بحرین کی وزارتی کابینہ بن گئی۔ جون ۱۹۷۳ء میں ریاست میں آئین نافذ کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں قومی اسمبلی قائم کی گئی تھی لیکن بائیں بازو کی طرف سے ہنگاموں کے بعد اگست ۱۹۷۵ء میں یہ اسمبلی توڑ دی گئی۔ ریاست میں سیاسی پارٹیوں کے قیام کی اجازت نہیں۔

خلیج فارس کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مقابلے میں بحرین شروع سے خوشحال جزیرہ رہا ہے۔ سمندر سے موتی نکالنا اور کشتی سازی یہاں کی خاص صنعت تھی۔ ۱۹۳۲ء میں جزیرے میں تیل دریافت ہوا اور اب یہی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ۳۷ لاکھ ٹن تیل نکالا گیا، ۱۹۷۴ء میں تقریباً ۳۴ لاکھ ٹن اور ۱۹۷۵ء میں ۳۱ لاکھ ٹن تیل نکالا گیا۔ جزیرے کے محدود رقبے اور مختصر آبادی کو دیکھتے ہوئے تیل کی یہ مقدار بہت ہے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب سے ۱۹۶۶ء کے ایک معاہدے کے تحت سعودی عرب اور بحرین کے درمیان تنگ سمندر سے جو تیل نکالا جاتا ہے اس کے منافع کا ایک چوتھائی حصہ بحرین کو ملتا ہے۔ بحرین میں تیل صاف کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں سعودی عرب سے آنے والا تیل بھی صاف کیا

جاتا ہے۔ بحرین تیل برآمد کرنے والے ملکوں کی تنظیم کا رکن بھی ہے۔

بحرین میں موتیوں کی قدیم صنعت اب روبزوال ہے۔ لیکن اب اس کی جگہ متعدد ہلکی پھلکی صنعتوں نے لے لی ہے۔ بحرین میں مینا سلمان کے نام سے ایک آزاد بندرگاہ اور آزاد صنعتی علاقہ تعمیر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بحرین تیزی سے صنعتی مرکز بنتا جارہا ہے۔ المونیم کا ایک کارخانہ کئی سال سے کام کررہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی بیرونی کمپنیاں ایسی ہیں جنہوں نے خلیج فارس کے علاقے میں اپنی مصنوعات کی تقسیم کے لیے بحرین کو مرکز بنالیا ہے۔ اس کی وجہ سے بحرین کی خوشحالی میں اضافہ ہورہا ہے۔

بحرین میں تعلیم مفت ہے۔ ۱۹۷۴ء میں طلبہ کی تعداد ۵۵ ہزار تھی۔ جزیرے کے باشندوں کی اکثریت عرب ہے۔ دارالحکومت منامہ کی آبادی عربوں، ایرانیوں اور پاکستانیوں پر مشتمل ہے۔ جب کہ محرق خالص عرب شہر ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق بحرین کی آبادی دو لاکھ سولہ ہزار تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ چھ ہزار تھی۔ باشندے سُنّی اور شیعہ عقائد رکھتے ہیں۔ عربوں کی اکثریت سُنّی ہے اور حکمران خاندان بھی سُنّی ہے۔ دیہات میں شیعی اکثریت ہے اور شہروں میں شیعہ سنی تناسب برابر ہے۔ تجارت کا بڑا حصہ شیعوں کے ہاتھ میں ہے اور ان کا رجحان ایران کی طرف ہے۔ شہروں میں اکثریت شافعی فقہ کی پیرو ہے لیکن حکمران خاندان مالکی ہے۔

دارالحکومت منامہ کی آبادی جو بندرگاہ بھی ہے ۱۹۷۱ء میں نوے ہزار کے قریب تھی اور دوسرے بڑے قصبے مُحرّق کی آبادی چالیس ہزار کے لگ بھگ۔

لبنان میں جب سے خانہ جنگی شروع ہوئی ہے، عرب دنیا میں لبنان کی جگہ بحرین عیاشی کا مرکز بنتا جارہا ہے اور مشرقی عرب دنیا میں بدکاری کا اڈہ بن گیا ہے۔ بحرین کو سعودی عرب سے ملانے کے لیے سمندری آبنائے پر ایک پُل بنایا جارہا ہے جو وسط ۱۹۸۳ء تک مکمل ہوجائے گا۔ یہ چار پلوں کا مجموعہ ہوگا اور ان کے نیچے سے بڑے سے بڑا تیل بردار جہاز گزر سکے گا۔ لوگوں میں عام خیال پایا جاتا ہے کہ اس پُل کی تعمیر کے بعد بحرین کی بدکاری اور عیاشی سعودی عرب کو تیزی سے متاثر کرے گی۔

باب ۲۸

کویت

کویت کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ آل صباح کے موجودہ حکمراں خاندان کے بانی شیخ صباح اوّل (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۲ء) ہیں۔ بحرین کے حکمراں خاندان آل خلیفہ کی طرح یہ خاندان بھی قطر سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے قطر کے آل ثانی اور بحرین کے آل خلیفہ سے اس کے تعلقات بہت گہرے اور قریبی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم تک کویت پر سلطنت عثمانیہ کی بالادستی قائم تھی اور بصرہ کا عثمانی گورنر کویت کے معاملات کا نگراں ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں نے جو خلیج فارس کی تجارت پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتے تھے کویت کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ ۲۳۔ جنوری ۱۸۹۹ء کو برطانیہ اور کویت کے شیخ مبارک کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جو خلیج فارس کی دوسری عرب ریاستوں سے کیے جانے والے معاہدوں کی طرح تھا۔ اس کے بعد کویت برطانوی تحفظ میں چلا گیا، لیکن آئینی طور پر مصر کی طرح کویت پر بھی سلطنت عثمانیہ کی بالادستی قائم رہی۔ موجودہ صدی کے آغاز میں جب عثمانی حکومت نے بغداد ریلوے کو کویت تک بڑھانا چاہا تو برطانیہ نے منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑنے پر برطانیہ نے کویت پر قبضہ کر لیا اور اس طرح کویت پر سے عثمانی بالادستی ختم ہو گئی۔ برطانیہ نے اپنے زیر تحفظ کویت کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۸ء میں نجد کے حکمراں سلطان ابن سعود نے کویت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن برطانیہ کی مداخلت کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۶۔ جون ۱۹۶۱ء کو برطانیہ اور کویت کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کے تحت ۱۸۹۹ء کا معاہدہ ختم کر دیا گیا اور برطانیہ نے کویت کو مکمل طور پر آزاد مملکت تسلیم کر لیا، معاہدہ کے تحت برطانیہ نے یہ ذمہ داری بھی قبول کی کہ اگر کویت امداد کی درخواست کرے تو برطانیہ اس کی مدد کرے گا۔ اس وقت شیخ عبداللہ السالم الصباح کویت کے حکمراں تھے۔ ۲۴۔ نومبر ۱۹۶۵ء کو ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی شیخ

صباح السالم (۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء کویت کے حکمراں ہوئے۔ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ان کا بھی انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ جابر الاحمد الصباح کویت کے حکمراں بنے۔

شیخ صباح السالم کویت کے بارھویں امیر تھے۔ وہ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ روایتی طریقہ پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایک ممتاز عالم دین نے انہیں قرآن، عربی زبان اور عربی ادب کی تعلیم دی۔ جون ۱۹۶۱ء میں جب کویت آزاد ہوا تو وہ وزیر خارجہ تھے۔ اس کے بعد وہ نائب وزیر اعظم ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں وزیر اعظم ہوگئے۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے بھائی عبداللہ سالم الصباح کے انتقال کے بعد کویت کے امیر مقرر ہوئے۔ ان کا دور کویت کی جدید تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ انہوں نے کویت کے باشندوں کو پارلیمانی جمہوریت سے آشنا کرایا اور ملک کو صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔

۱۹۶۳ء میں وزارت عظمیٰ پر ان کی تقرری سے کویت میں اصلاح و ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس زمانے میں کویت نے زبردست ترقی کی۔ ۱۹۷۳ء میں اسرائیل اور عربوں کی جنگ کے دوران امریکہ کو تیل کی فراہمی بند کرنے کے سلسلے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اور بعد میں مصر، اردن اور شام کو مالی امداد فراہم کی۔ اپنی خاموش مگر پُر جوش حکمت عملی، تدبر اور اعتدال پسندی کے سبب عرب دنیا میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ انتہاء پسند عربوں اور اعتدال پسند عربوں کے درمیان شاہ فیصل کی طرح ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے جانشین اور موجودہ امیر شیخ جابر احمد الصباح ان کے دور حکومت میں وزیر خزانہ، وزیر اقتصادیات اور نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے ہیں اور شیخ صباح کے انتقال کے وقت کویت کے وزیر اعظم تھے۔

انتظامی طور پر کویت تین حصوں میں تقسیم ہے، کویت، احمدی اور حوالی۔ ۱۹۶۲ء سے کویت میں آئین نافذ ہے جس کے تحت اسلام سرکاری مذہب ہے۔ اُس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ اختیارات وزیر اعظم اور مجلس وزراء کو حاصل ہیں اور ان دونوں کا تقرر امیر کویت کرتا ہے۔ قومی اسمبلی پچاس افراد پر مشتمل ہے جو چار سال کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ ممبروں کا انتخاب صرف مرد آبادی کرتی ہے۔ جنوری ۱۹۷۱ء سے زیادہ نمائندہ اسمبلی منتخب ہوئی۔ امیدوار انفرادی طور پر کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ ملک میں

سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں۔

تعمیر و ترقی

کویت کی خوشحالی کا دارومدار پٹرول کی پیداوار پر ہے۔ ۱۹۳۸ء میں یہاں پہلی مرتبہ تیل دریافت ہوا اور ۱۹۴۶ء سے نکلنا شروع ہوگیا۔ ۱۹۷۵ء میں تیل کی پیداوار نو کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ کویت کے غیر جانبدار علاقہ میں ڈھائی کروڑ ٹن جو تیل نکالا گیا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس کے نصف منافع میں کویت شریک ہے۔ اس وقت کویت تیل کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا کا ساتواں اور اسلامی دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔ تیل کی دریافت سے قبل یہاں کے باشندوں کا انحصار خلیج فارس کے دوسرے ساحلی علاقوں کی طرح ماہی گیری، کشتی سازی اور سمندر سے موتی نکالنے پر تھا اور کویت ایک بڑے گاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اب کویت کا شمار دنیا کے دولت مند ترین ملکوں میں ہوتا ہے۔ ہر دوسو تیس آدمیوں میں ایک کروڑ پتی ہے۔ فی کس آمدنی امریکہ کے مقابلہ میں دوگنی ہے۔ افلاس کا نام ونشان نہیں۔ ۱۹۷۴ء میں کویت کو دنیا کا سب سے دولت مند ملک قرار دیا گیا تھا۔ کویت کی تیل کمپنی ۱۹۷۵ء سے قومی ملکیت میں لے لی گئی ہے۔ ۱۹۷۳ء سے تیل کی پیداوار کم کردی گئی ہے تاکہ تیل کے ذخیرے جلدی ختم نہ ہوں۔

تیل سے ہونے والی آمدنی کو ملکی ترقی، عوام کی فلاح و بہبود کم ترقی یافتہ ملکوں کی امداد اور دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری پر صرف کیا جا رہا ہے۔ کویت کا بندرگاہ خلیج فارس کے علاقہ میں سب سے اچھا قدرتی بندرگاہ ہے۔ احمدی میں تیل کا بندرگاہ تعمیر کیا گیا ہے۔ سعودی عرب کے بعد سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کے سب سے بڑے کارخانے کویت میں ہیں۔ پینے کے پانی کی بیشتر ضروریات اسی طرح پوری کی جاتی ہیں۔

ملک میں سماجی تحفظ کا مکمل نظام قائم ہے۔ مزدور قوانین کے تحت ملازموں کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ طبی سہولتیں ہر سطح پر مفت ہیں۔ غریبوں، بوڑھوں، بیواؤں، یتیموں اور دق کے مریضوں کی سرکاری طور پر امداد کی جاتی ہے۔ مکانات معمولی قسطوں پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ تعلیم یونیورسٹی تک مفت ہے۔ ۱۹۷۵ء میں دو ہزار طلبہ بیرونی ملکوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ملک میں اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ایک یونیورسٹی اور ایک ٹیکنیکل کالج قائم ہے۔ ۱۹۶۹ء میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ

بیس ہزار تھی۔ اب تعلیمی عمر رکھنے والے تقریباً سب بچے مدرسے جاتے ہیں۔ خواندگی کا تناسب ساٹھ فیصد ہے۔

کویت اور عراق کے درمیان آزادی کے بعد سے اختلافات چلے آرہے تھے۔ عراق کی حکومت کویت کو عراق کا ایک حصہ سمجھتی تھی اس لیے اس نے دو سال تک کویت کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں عراق نے کویت کی آزادی تسلیم کر لی۔ کویت اور سعودی عرب کے درمیان ۲½ ہزار مربع میل پر مشتمل ایک غیر جانبدار علاقہ بھی تھا جس کی ملکیت پر دونوں ملکوں میں اختلاف تھا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۶ء تک یہ علاقہ سعودی عرب اور کویت کے مشترکہ انتظام میں تھا۔ مئی ۱۹۶۶ء میں یہ علاقہ دونوں ملکوں میں برابر تقسیم کر دیا گیا اور تیل کی پیداوار سے ہونے والے منافع میں دونوں ملک برابر کے شریک ہیں۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب نہر سویز بند ہوگئی تو کویت نے سعودی عرب اور لیبیا کے ساتھ مل کر مصر کے مالی اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری لی۔ لیبیا تو بعد میں الگ ہوگیا لیکن کویت اب تک یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ میں کویتی فوج کے ایک دستہ نے نہر سویز کے مقام پر جنگ میں حصہ لیا۔ کویت، سعودی عرب اور مصر کے ساتھ اسلحہ سازی کے مشترکہ منصوبہ میں بھی برابر کا شریک ہے۔ کویت نے ترقی پذیر ملکوں کی امداد کے لیے مختلف فنڈ قائم کیے ہیں۔ ان میں ایک عربوں کی معاشی ترقی کا کویت فنڈ (kfaed) ہے جو تین ارب تیس کروڑ ڈالر کے سرمایہ سے ۱۹۶۱ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ کویت کی پہل پر ۱۹۶۸ء میں عرب ملکوں نے 'عرب فنڈ برائے معاشی و سماجی ترقی' کے نام سے ایک مشترکہ فنڈ بھی قائم کیا ہے۔

نظریاتی کشمکش

کویت کی مقامی آبادی کا تین چوتھائی حصہ سُنّی ہے اور ایک چوتھائی شعیہ۔ لیکن پچھلے سالوں میں ترقیاتی کاموں اور مواقع کی کثرت کی وجہ سے سعودی عرب اور خلیج فارس کے دوسرے علاقوں کی طرح کویت میں بھی بیرونی ملکوں کے افراد اس کثرت سے آگئے ہیں کہ اب ان کی اکثریت ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت کویت کی آبادی کا ساٹھ فیصد حصہ غیر ملکی باشندوں پر مشتمل ہے اور ان میں نصف لبنان، فلسطین اور شام کے عیسائی ہیں یا یورپ اور ایشیا

کے دوسرے ملکوں کے غیر مسلم۔ کویت کے اخبارات اور رسائل اگرچہ کویتی باشندوں کی ملکیت ہیں، لیکن اُن کو چلانے کا سارا انتظام ان ہی غیر مسلم عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبارات سیکولرازم کی حمایت کرتے ہیں اور اسلامی نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء کے آخر میں جب کویت میں اسلامی تعزیری قوانین کے نفاذ کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا تو ان اخباروں کی طرف سے اسلامی قوانین کی شدید مخالفت کی گئی تھی۔[۱]

کویت کا پریس لبنان کے بعد عرب دنیا کا سب سے آزاد پریس سمجھا جاتا ہے۔ عربی روزناموں میں الدنیا اور انگریزی میں کویت ٹائمز ممتاز اخبار ہیں۔ ہفت روزہ ''النھضۃ'' کی اشاعت پچاس ہزار سے زیادہ ہے اور رسالہ مجلہ العربی دنیا ئے عرب کے سب سے زیادہ چھپنے والے ماہناموں میں سے ہے۔ اس کی اشاعت پانچ لاکھ ہے اور ادبی اور طباعتی معیار سے یہ رسالہ کسی طرح عرب ملکوں کے دوسرے رسالوں سے کم نہیں۔ لیکن فکری طور پر یہ رسالہ بھی مصر و شام کے دوسرے مقبول عام رسالوں کی طرح نوجوانوں کے ذہنوں میں عرب قوم پرستی، آوارگی اور آزاد خیالی کے نقوش کندہ کر رہا ہے۔ الدنیا اور کویت ٹائمز بھی اسی قسم کے رجحانات کے ترجمان ہیں۔

کویت عربی کتابوں کی اشاعت کا بھی ایک بڑا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ اخوان رہنماؤں اور مولانا مودودی کی عربی کتابیں پہلے قاہرہ، بیروت اور دمشق سے شائع ہوتی تھیں۔ لیکن اب کویت ان کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے۔

خلیج کے علاقے میں اسلامی فکر رکھنے والے علماء میں یوسف القرضاوی کا نام سب سے ممتاز ہے۔ وہ مصر کے باشندے ہیں لیکن ان کا قیام کویت اور قطر میں رہتا ہے اور آج کل وہ قطر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ ان کی تصانیف میں سب سے مقبول ''حلال وحرام'' ہے جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب کا عبدالحمید صدیقی مرحوم نے ''اسلام اور معاشی تحفظ'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یوسف القرضاوی اخوان لمسلمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

کویت کے اسلامی فکر رکھنے والوں میں وہاں کے اوقاف اور مذہبی امور کے ناظم جناب عبداللہ عقیل (پیدائش ۱۹۳۰ء) بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے وزارت اوقاف کو نئے

---

(۱) اس مخالفت کے باوجود ۱۳۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۷۸ء سے کویت کے ہوٹلوں اور کلبوں میں شراب اور رقص پر پابندی لگادی گئی۔

خطوط پر منظم کر کے دنیا بھر میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ عبداللہ العقیل جامعہ ازہر کے پڑھے ہوئے ہیں اور اخوان المسلمون سے متاثر ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ ادارۂ شعونہ الاسلامیہ کے مہتمم مقرر کیے گئے۔ ۱۹۷۸ء میں جبکہ وہ ایشیائی ملکوں کے تین ہفتہ کے دورے کے سلسلے میں پاکستان آئے تھے تو انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ کویت کی وزارت اوقاف اسلامی مطبوعات کی اشاعت اور نادر کتابوں کی تحقیق و تدوین اور غیر زبانوں میں اسلامی کتب کے ترجمہ کے علاوہ اسلامی فقہی احکام کا ایک مجموعہ بھی شائع کر رہی ہے جس کی گیارہ جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔ (۱)

کویت کا خاندان آلِ صباح

۱۔ شیخ صباح اول	۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۲ء
۲۔ شیخ عبداللہ الصباح اوّل	۱۷۶۲ء تا ۱۸۱۲ء
۳۔ شیخ جابر الصباح اوّل	۱۸۱۲ء تا ۱۸۵۹ء
۴۔ شیخ صباح دوم	۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۶ء
۵۔ شیخ عبداللہ الصباح دوم	۱۸۶۶ء تا ۱۸۹۶ء
۶۔ شیخ محمد الصباح	۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۶ء
۷۔ شیخ مبارک الصباح	۱۸۹۶ء تا ۱۹۱۵ء
۸۔ شیخ جابر الصباح دوم	۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۷ء
۹۔ شیخ سالم الصباح	۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۱ء
۱۰۔ شیخ احمد الصباح	۱۹۲۱ء تا ۱۹۵۰ء
۱۱۔ شیخ عبداللہ السالم الصباح سوم	۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۵ء
۱۲۔ شیخ صباح السالم سوم	۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء
۱۳۔ شیخ جابر احمد الصباح سوم	۱۹۷۷ء میں تخت نشیں ہوئے۔

(۱) روزنامہ 'جسارت' کراچی ۳۰۔ جون ۱۹۸۰ء

المشرق العربی (۳)

وادی نیل اور ملحقہ علاقہ

۱۔ مصر	۳لاکھ ۸۶ ہزار مربع میل دس لاکھ مربع کلومیٹر	۳ کروڑ ۸۹ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔ سوڈان	۹ لاکھ ۶۷ ہزار مربع میل ۲۵ لاکھ مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۶۸ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔ صومالیہ	۲ لاکھ ۶۴ ہزار مربع میل ۷ لاکھ مربع کلومیٹر	۳۴ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۴۔ جیبوتی	۸ ہزار مربع میل ۲۳ ہزار مربع کلومیٹر	۳ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۵۔ اری ٹیریا	۴۵ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۲۰ ہزار مربع کلومیٹر	۱۸ لاکھ (۱۹۷۸ء)
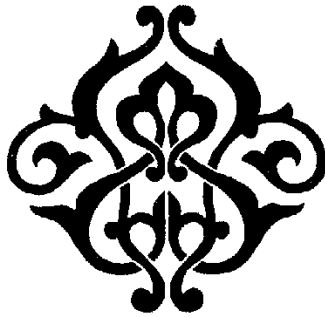
باب ۲۹

۱۔ مصر

برطانوی دور سے فوجی انقلاب تک

مصر آبادی اور وسائل کے اعتبار سے دنیائے عرب کا سب سے بڑا اور معاشی اور تمدنی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اسلامی دور کے آغاز میں مصر خلافت اسلامیہ کا ایک حصہ رہا اور خلافت کے زوال کے بعد یہاں اخشیدی، طولونی، فاطمی، ایوبی اور مملوک کے نام سے کئی خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں جن کا حال ہم پچھلے حصوں میں بیان کر چکے ہیں ان حکومتوں کے زمانے میں مصر علمی اور تمدنی لحاظ سے دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان تمام حکومتوں کے زمانے میں شام بالعموم تخت مصر کے تحت ہوتا تھا اور کبھی کبھی مصر کی ان ریاستوں کا دائرہ اقتدار حجاز اور شام تک بھی بڑھ جاتا تھا۔

سولہویں صدی کے آغاز میں جب ۱۵۱۷ء میں مصر عثمانی سلطنت کا ایک حصہ بنا تو بیشتر عثمانی مقبوضات کی طرح مصر بھی زوال [1] کے راستہ پر گامزن ہوگیا۔ اٹھارھویں صدی سے عثمانی ترکوں کا اقتدار بھی کمزور پڑنے لگا اور یہاں کے عثمانی والی جو عموماً مملوک ترک ہوتے تھے مصر کو نیم آزاد رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے۔ ان مملوک والیوں کے دور میں فرانس نے اپنے

---

(۱) اس جگہ یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ اس زوال کا باعث عثمانی ترک تھے جیسا کہ عام طور پر قوم پرست عرب مورخین اور مغربی مصنف الزام لگاتے ہیں۔ عثمانی ترکوں نے جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ زمانہ اسلامی دنیا کے علمی اور ذہنی انحطاط کا دور تھا، اور اسلامی دنیا کے ہر حصے میں ان میدانوں میں مسلمان روبہ زوال تھے۔ خود عثمانی ترک بھی کوئی اعلیٰ علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں (۱۴۹۲ء) یورپ سے ایشیا تک پہنچنے کا بحری راستہ بھی دریافت ہوگیا تھا۔ اس راستے کی دریافت سے پہلے ایشیا اور یورپ کی بیشتر تجارت مصر اور شام کے راستے ہوتی تھی اور اس تجارت کی وجہ سے ان دونوں ملکوں میں خوشحالی پیدا ہوگئی تھی لیکن جب جنوبی افریقہ کی طرف سے بحری راستہ دریافت ہوگیا تو یہ تجارت ختم ہوگئی اور مصر اور شام کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں نہر سویز کی تعمیر تک برقرار رہی۔ اس کے بعد مصر کو پھر معاشی خوشحالی حاصل ہوئی۔

مشہور سپہ سالار نپولین کی قیادت میں ۱۷۹۸ء میں مصر پر قبضہ کرلیا۔ نپولین ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے مصر کو اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مصر پر فرانس کا یہ تسلط دیر پا ثابت نہیں ہوا، اور ترک اور برطانوی فوجوں نے مل کر ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی فوجوں کو مصر سے نکال دیا۔ اس جنگ میں ایک البانوی افسر محمد علی نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لیے عثمانی حکومت نے ۱۸۰۵ء میں اسی کو مصر کا عثمانی والی مقرر کر دیا۔ بعد میں جیسا کہ ہم پچھلے حصے میں بیان کر چکے ہیں، یہ عہدہ محمد علی کی اولاد میں موروثی ہو گیا۔

مصر کی حکومت محمد علی کے خاندان میں ۱۹۵۲ء تک قائم رہی۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۸۲ء تک مصر کے یہ حکمراں جو خدیو کہلاتے تھے عملاً آزاد تھے، لیکن آئینی طور پر اس تمام عرصے میں مصر پر عثمانی خلافت کی بالادستی قائم رہی۔ عثمانی خلافت کی یہ بالادستی اس وقت بھی قائم رہی جب ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔

برطانوی دَور

مصر پر انگریزوں کا قبضہ ۱۹۲۲ء تک قائم رہا۔ برطانوی تسلط کے اس چالیس سالہ دَور میں سب سے زیادہ توجہ مصر کے انتظامی اور مالی امور پر دی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانوی ہند کی طرح ان امور میں مصر کو بھی برطانوی دَور میں بہت فائدہ پہنچا۔ انتظامی ڈھانچہ جدید طرز پر قائم کیا گیا اور معیشت کو ترقی دینے کے لیے مختلف کام انجام دیے گئے۔ جدید نہری نظام کو جس کا آغاز خدیوی حکمرانوں کے دَور میں ہو چکا تھا۔ برطانوی دور میں مزید وسعت دی گئی۔ دریائے نیل پر کئی بند تعمیر کیے گئے جن میں ۱۹۰۲ء میں تعمیر ہونے والا اسوان بند سب سے بڑا تھا۔ رُوئی اور گنے کی کاشت بھی خدیو حکمرانوں کے دَور میں شروع ہو گئی تھی۔ برطانوی دَور میں اس پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور مصر دنیا میں سب سے زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی روئی پیدا کرنے والے ملکوں میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ برطانوی ہند کی طرح مصر میں بھی زرعی پیداوار پر خصوصی توجہ دینے کا مقصد برطانیہ کے کپڑے کے کارخانوں کے لیے خام مال پیدا کرنا تھا۔ بہر حال ان اقدامات کے نتیجے میں ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا اور مصر میں ایک بار پھر خوشحالی آ گئی۔

سیاسی معاملات میں بھی مصر میں برطانیہ کی پالیسی ویسی ہی تھی جو اس نے برطانوی ہند اور

اپنے دوسرے مقبوضات میں اختیار کی تھی، یعنی جیسے جیسے عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوتا جائے، ان کے مطالبات کو اہمیت دی جائے اور ملک میں نمائندہ ادارے قائم کیے جائیں۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں صوبائی اور بلدیاتی مجالس قائم کی گئیں اور منتخب اور غیر منتخب لوگوں پر مشتمل ایک اسمبلی قائم کی گئی جس کی حیثیت مشاورتی تھی۔ مصر کی پہلی پارلیمنٹ ۱۹۲۴ء میں اس وقت قائم ہوئی جب برطانیہ نے مصر کو عملاً آزاد مملکت تسلیم کرلیا اور ۲۳۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں آزادی حاصل ہونے تک مصر کا حقیقی حکمراں برطانوی قونصل جنرل یا ایجنٹ ہوتا تھا۔

پہلا برطانوی ایجنٹ لارڈ کرومر تھا جو ۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۷ء تک مصر میں قونصل جنرل رہا۔

برطانوی دَور میں عربی ادب کا احیاء ہوا اور مصر میں جدید عربی ادب کی بنیاد پڑی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ برطانوی حکومت جدید عربی ادب کو وجود میں لانے کا سبب بنی۔ جدید عربی ادب کی بنیاد محمد علی پاشا اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ دراصل انیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں جو عام بیداری پیدا ہو رہی تھی، اس کے نتیجے میں نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہر جگہ نیا ادب وجود میں آیا۔ ترکی، فارسی اور اُردو کے جدید ادب کی بنیاد بھی عربی کی طرح انیسویں صدی میں پڑ چکی تھی۔ بہرحال یہ صحیح ہے کہ جدید مصری ادب کو عروج برطانوی دَور میں حاصل ہوا۔ محمود سامی باروی (۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۵ء) احمد شوقی (۱۸۶۸ء تا ۱۹۳۲ء) محمد حافظ ابراہیم (۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۲ء) مطران خلیل (۱۸۷۱ء تا ۱۹۴۹ء) اور صبری جن کو جدید عربی ادب کے ارکان خمسہ کہا جاتا ہے مصر میں برطانوی دور ہی سے تعلق رکھتے تھے ان میں مطران خلیل لبنان کے عیسائی تھے، لیکن انہوں نے مصر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان میں شوقی اور حافظ جدید دَور کے سب سے بڑے عرب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ شوقی نہ صرف پاکستان کے اقبال اور ترکی کے عاکف کے ہمعصر تھے بلکہ وہ ان دونوں کی طرح اتحاد اسلام اور خلافت کے عظیم علمبردار بھی تھے۔

برطانوی دور کے ان روشن پہلوؤں کے بعد جب ہم اس دور کے تاریک پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے بڑی خرابی یہ نظر آتی ہے کہ دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح جو برطانیہ کے قبضے میں تھے مصر میں بھی برطانوی حکومت کی طرف سے اسلامی اقدار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی، اعلیٰ تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں اور قومی جذبات کو دبایا گیا۔ لارڈ کرومر نے جو خدیو

مصر کی موجودگی کے باوجود مصر کا حقیقی حکمراں تھا اسلامی عقائد پر سخت تنقیدیں کیں، عورتوں اور عائلی قوانین سے متعلق اسلامی نظریات پر خاص طور پر اعتراضات کیے اور اس خیال کو عام کیا کہ اسلام جدید زمانے کے تقاضوں پر خاص طور پر اعتراضات کیے اور اس خیال کو عام کیا کہ اسلام جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ قومی تحریک اور اتحاد اسلام کی تحریک کا مخالف تھا اور اس نے عربوں میں ترکوں کے خلاف نفرت کے بیج بوئے۔ اسی کے دور میں لبنانی مسیحی ادیب سلیمان بستانی (۱۸۰۶ء تا ۱۹۲۵ء) کی کتاب ذکریٰ وغیرہ مصر میں شائع ہوئی جس میں عثمانی دور خلافت کی انتہائی سیاہ تصویر پیش کی۔ لارڈ کرومر نے مصر میں یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی سخت مخالفت کی۔

پاکستان اور ہندوستان میں جس طرح ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کیا اسی طرح مصر کے قبطی عیسائیوں نے جو ملک کی کل آبادی کا نو فیصد ہیں انگریزوں سے تعاون کیا۔ انگریزی حکومت نے ان کی اور لبنان اور شام کے ان عیسائیوں کی جو مصر میں آباد ہو گئے تھے دل کھول کر حوصلہ افزائی کی اور ان کو بڑے بڑے منصب دیے گئے یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں ایک قبطی پطرس نمالی کو مصر کا وزیر اعظم بھی بنا دیا۔ معمولی اقلیت ہونے کے باوجود مصر کے تعلیمی اور اقتصادی میدانوں میں ان قبطیوں کو جو اجارہ داری برطانوی دور میں حاصل ہو گئی تھی وہ اب تک قائم ہے۔ برطانیہ کی قبطی نواز پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتنی کشیدگی بڑھی کہ ۲۰۔ فروری ۱۹۱۰ء کو ایک مصری نے پطرس نمالی کو قتل کر دیا۔ مصر کی عیسائی آبادی نے مغربی تہذیب کو اپنانے اور اس کو مصر میں پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی دور میں شراب خانے، قمار خانے اور رقص گاہیں کھلے بندوں قائم کیے گئے اور اس دور میں لائسنس یافتہ قحبہ گری کا آغاز ہوا اور اس طرح مصریوں کو ثقافت کے ایک ایسے تاریک پہلو سے روشناس کرایا گیا جس نے مصری باشندوں کی اخلاقی بنیادوں کو ڈھا دیا اور تفریح کے صحت مند نظریوں اور طریقوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا۔ اسلامی ہند اور پاکستان کی طرح برطانیہ نے مصر میں بھی شرعی قوانین کی جگہ مغربی ضابطہ قانون کو رواج دیا۔

برطانوی دور کا ایک اہم واقعہ سوڈان کی مصر سے علیحدگی ہے۔ محمد علی پاشا کے زمانے سے سوڈان ملک مصر کا ایک حصہ تھا، لیکن مصری حکام کے ظالمانہ اور استبدادی طرز عمل نے سوڈانی

باشندوں میں مصر کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی اور وہ مہدی سوڈانی کی رہنمائی میں مصری تسلط کے خلاف جس نے اب برطانوی سامراج کی شکل بھی اختیار کر لی تھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ۱۸۸۵ء میں انہوں نے سوڈان میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔ لیکن ۱۸۹۹ء میں انگریزوں نے سوڈان پر قبضہ کر لیا اور مصر کی طرح اس کو بھی اپنے زیر انتظام لے لیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک نیا انتظامی ڈھانچہ تیار کر لیا جس میں برطانیہ اور مصر دونوں برابر کے شریک رکھے گئے لیکن برطانیہ کی یہ پالیسی بال آخر سوڈان کے مصر سے کٹ جانے کا باعث بنی۔

سیاسی بیداری

برطانوی تسلط اور برطانیہ کی مستعمراتی پالیسی کا ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہوا کہ مصر میں قومی اور سیاسی تحریک کو فروغ ملا اور اصلاحات کا وہ کام جس کا مطالبہ جمال الدین افغانی اور اعرابی پاشا نے کیا تھا اب ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ ابتدائی دور کے سیاسی رہنماؤں میں مصطفیٰ کامل (۱۸۷۴ء تا ۱۹۰۸ء) کے نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے ۱۸۹۵ء میں ''حزب الوطنی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جس کا نصب العین مصر اور سوڈان کی مکمل آزادی تھا۔ مصطفیٰ کامل نے سیاسی جدوجہد کے علاوہ تعلیم کے فروغ کے لیے خاص طور پر کوشش کی۔ مصری یونیورسٹی کا قیام جو مصر میں مغربی طرز کی جدید تعلیم کا پہلا اعلیٰ ادارہ تھا، ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لارڈ کرومر نے یونیورسٹی کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی، لیکن ۱۹۰۷ء میں کرومر کے جاتے ہی یہ یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ مصطفیٰ کامل نے متعدد مطبوعات کی بنیاد بھی ڈالی جن میں ایک روزنامہ، ایک ہفت روزہ اور ایک ماہنامہ بھی شامل تھے۔

اس زمانہ میں مصری دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک ترکی نواز تھا جو عثمانی سلطنت کا حامی تھا اور دوسرا برطانیہ نواز۔ مصطفیٰ کامل ترکی نواز گروہ کے سربراہ تھے۔ مصطفیٰ کامل کا قول تھا کہ دین و وطن دو جڑواں بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ وہ برطانوی اقتدار کے خاتمہ کے بعد ۱۸۴۰ء کے عثمانی مصری معاہدے کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جس کے تحت مصر پر عثمانی بالادستی قائم تھی اور جو مصری ترکی اتحاد کی علامت تھا۔ یہ معاہدہ مصر کی آزادی کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں تھا کیونکہ اس کے تحت مصر پر عثمانی اقتدار صرف اس حد تک تھا کہ مصر آستانہ

خلافت کو مقررہ خراج ادا کرتا رہے اور مصر کے لیے دارالخلافہ کی طرف سے قاضی القضاۃ مقرر کر دیا جائے۔ عثمانی خلافت کی یہ برائے نام بالادستی مصر کی آزادی کی ضمانت بھی تھی۔ مصر کے اسلامی فکر رکھنے والے ممتاز ادیب، شاعر اور اہل قلم مثلاً شوقی، بارودی، فرید وجدی عبدالعزیز چاوش اس معاملے میں مصطفیٰ کامل کے حامی تھے۔

برطانیہ نواز گروہ جس میں مفتی عبدہٗ، سعد زغلول، قاسم امین اور مصری مسیحی شامل تھے ترکوں کو ظالم اور برطانیہ کو عادل ثابت کرتا تھا اور مصطفیٰ کامل اور ان کے حامیوں کو ترکی زدہ قرار دیتا تھا اور ان پر الزام لگاتا تھا کہ وہ انگریزی استعمار کو ختم کر کے ترکی استعمار کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ محمد عبدہٗ اور ان کے ساتھیوں کو برطانوی حکومت کی تائید حاصل تھی کیونکہ یہ لوگ خدیو مصر اور ترکی کے مخالف تھے اور صرف داخلی اصلاحات کے علمبردار تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے تو برطانیہ نے ترکی سے مصر کا برائے نام آئینی تعلق بھی ختم کر دیا اور مصر کو براہ راست اپنی حفاظت میں لے لیا۔ خدیو عباس حلمی چونکہ عثمانی سلطنت کا وفادار تھا اس لیے اس کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کے چچا حسین کامل کو خدیو کی جگہ سلطان کا لقب دے کر مصر کا حکمران بنا دیا۔ لیکن عثمانی خلافت سے مصر کا تعلق اتنا جذباتی اور قریبی تھا کہ انگریزوں کے اس فیصلے کے خلاف اہل مصر نے پُرزور مظاہرے کئے اور دو مرتبہ حسین کامل پر قاتلانہ حملے بھی کئے اور مصر میں انگریزوں کے خلاف خفیہ تنظیمیں قائم کی گئیں۔ عثمانی ترکوں اور مصر کے ان قریبی دوستانہ تعلقات کا اظہار ان نظموں میں بھی کیا گیا جو اس موقع پر اور اس کے بعد مصری شاعروں نے لکھیں۔ مثلاً ایک ممتاز شاعر اور صحافی احمد محرم لکھتے ہیں:

ترک اللہ کے سپاہی ہیں۔ اگر ان کا دبدبہ نہ ہوتا تو دنیا کے اندر کوئی اذان دینے والا نہ ہوتا۔

جنگ میں ترکوں کی شکست کے بعد جب ۱۹۲۰ء میں اتحادی فوجیں دارالخلافہ استنبول میں داخل ہوئیں تو حافظ ابراہیم نے ایک نوحہ میں اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''اے ایا صوفیہ! اب جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ مگر تو ان بزرگ انسانوں کے ایام یاد رکھنا جنھوں نے تیرے اندر نمازیں ادا کیں''

جب جنگ آزادی کے دوران ترکوں نے یونانیوں کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا تو عظیم شاعر احمد شوقی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

اللہ اکبر! یہ فتوحات کس قدر حیرت انگیز ہیں۔ اے ترکوں کے خالد عربوں کے خالد کی یاد
تازہ کر۔

اور جب مصطفیٰ کمال نے خلافت کو ختم کر دیا تو شوقی نے اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا:
شادی کے نغمے نوحہ گروں کے نوحوں میں بدل گئے اور اے خلافت خوشی کی مجلسوں کے اندر
تیری مرثیہ خوانی ہونے لگی۔

یہ اقتباسات ہم نے اس لیے دیے ہیں کہ ترکی اور عرب دنیا میں قوم پرستی کے شدید جذبات کے فروغ کے بعد عربوں اور ترکوں کے باہمی اختلافات اور نفرت سے متعلق باتوں کو تو خوب نمایاں کیا گیا لیکن ان دونوں قوموں میں اور خصوصاً عوام میں ایک دوسرے سے متعلق خیر سگالی کے اور محبت کے جو جذبات تھے ان کو نہ صرف چھپایا گیا بلکہ کچلا گیا۔

مصر کی جدید سیاسی تحریک کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ اس کی بنیاد خالص مغربی افکار پر اٹھائی گئی تھی۔ آزادی کی خواہش، انسانی حقوق کا تحفظ اور استبداد کا خاتمہ یقیناً تحریک کے وہ حصے تھے جو اسلام کے سیاسی نظریات سے ہم آہنگ تھے، لیکن مصر کی سیاست میں ان کا اسلامی پہلو اتنا نمایاں نہیں ہوا جتنے مغربی سیاسی افکار نمایاں ہوئے۔ ان ہی مغربی افکار میں سے ایک تصور قوم پرستی تھا۔ کشمکش چونکہ ایک مسلمان قوم اور ایک مسیحی قوم کے درمیان تھی اور شروع دَور کے مسلمان رہنما بھی اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے اچھے مسلمان تھے اس لیے ابتدائی دَور میں ان مغربی تصورات کے غیر اسلامی پہلو نمایاں نہیں ہو سکے، لیکن بعد میں جب قوم کی قیادت اگلی نسل کے ہاتھ میں آئی تو ان تصورات اور مغربی طرز کی تعلیم کے نتیجے میں ان کا غیر اسلامی پہلو پوری طرح نمایاں ہو گیا۔ حزب الوطنی نے ''مصر، مصریوں کے لیے'' جو نعرہ ایک کافر حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لگایا اس نے جلد ہی العزت للعرب (برتری عربوں کے لیے ہے) اور نحن آل فرعون (ہم فرعون کی اولاد ہیں) کے نعروں کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح مصر نے خود کو اسلام کے عالمگیر پیغام سے بے تعلق کر لیا۔

آزادی اور سعد زغلول

مصطفیٰ کامل کے بعد جس سیاسی رہنما نے مصر کی آزادی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا وہ

سعد زغلول پاشا (۱۸۶۰ء تا ۱۹۲۷ء) ہیں۔ وہ لارڈ کرومر کے زمانے میں وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور مصر میں جدید مغربی تعلیم کے فروغ میں خاص حصہ لیا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد جب امریکہ کے صدر ولسن نے چھوٹی قوموں کے حق خود اختیار کا اعلان کیا تو مصر کی آزادی کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور امن کانفرنس اور لندن میں مصر کا معاملہ پیش کرنے کے لیے ۱۹۱۸ء میں سعد زغلول کی قیادت میں ایک وفد تشکیل کیا گیا۔ جس نے بعد میں وفد المصری کے نام سے ایک مستقل سیاسی جماعت کی شکل اختیار کر لی اور مصطفیٰ کامل کی حزب الوطنی کی جگہ جواب کمزور پڑ چکی تھی کی مقبول ترین سیاسی جماعت بن گئی۔ لیکن اس وفد کو لندن جانے کی اجازت نہیں ملی اور سعد زغلول کو ۸۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا جہاں اس زمانے میں برصغیر کے مشہور عالم مولانا محمود الحسن بھی نظر بند تھے۔ سعد زغلول اور ان کے ساتھیوں کو اگلے ماہ رہا کر دیا گیا، جس کے بعد یہ رہنما امن کانفرنس میں مصر کا معاملہ پیش کرنے کے لیے پیرس روانہ ہو گئے لیکن پیرس میں اُن کے مطالبے پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ جب قوم پرست رہنما ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے مصر واپس آنے کے بعد برطانیہ سے عدم تعاون اور برطانوی مال کے مقاطعہ (بائیکاٹ) کی زبردست مہم شروع کی جس کے نتیجے میں برطانیہ چند شرائط کے ساتھ مصر کو آزادی دینے پر راضی ہو گیا۔ لیکن وفد کے رہنماؤں نے جو مکمل آزادی چاہتے تھے مشروط آزادی حاصل کرنے سے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں پورے ملک میں برطانیہ کے خلاف زبردست ہنگامے ہوئے اور حکومت برطانیہ نے سعد زغلول پاشا اور دوسرے وفدی رہنماؤں کو دوبارہ گرفتار کر کے جزیرہ سیچلس میں جلاوطن کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی برطانیہ نے مارچ ۱۹۲۲ء کو یک طرفہ طور پر مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سلطان فواد اب شاہ مصر ہو گئے۔ ۲۳۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔

مصر کو آزادی مل جانے کے بعد ستمبر ۱۹۲۳ء میں سعد زغلول وطن واپس آ گئے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں مصری پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے جس میں وفد پارٹی کو زبردست کامیابی ہوئی' اور سعد زغلول مصر کے وزیر اعظم ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء سے مصر اگرچہ ایک آزاد ملک تھا لیکن یہ آزادی ابھی تک ناقص اور نامکمل تھی۔ انگریزی فوجیں اب بھی مصر میں موجود تھیں اور سوڈان کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا تھا۔ وفد کے رہنما ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے برابر برطانیہ پر دباؤ ڈال رہے

تھے۔ انگریزی فوجوں کی مصر سے واپسی اور سوڈان کا مصر کے ساتھ الحاق مصری قوم پرستوں کے دو سب سے بڑے مطالبے تھے۔ وفد کے برسر اقتدار آنے کے بعد مصر اور برطانیہ میں ان امور کی وجہ سے اس قدر کشیدگی بڑھ گئی کہ ۱۹۔ نومبر ۱۹۲۴ء کو سوڈان کا گورنر جنرل سرلی اسٹیک قاہرہ میں ایک مصری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس حادثہ نے سوڈان کے مستقبل کا مسئلہ اور پیچیدہ کر دیا، اور برطانیہ نے مصری فوجوں کو سوڈان سے نکل جانے پر مجبور کیا، اور اس طرح مصر اور سوڈان کے اتحاد کی برائے نام علامت کو بھی ختم کر دیا۔ سعد زغلول کو مستعفی ہونا پڑا، اور ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سعد زغلول جامعہ ازہر کے طالب علم تھے۔ ان کا شمار جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں میں کیا جاتا ہے لیکن ان کی زندگی نظریات اور افکار ان دونوں رہنماؤں سے بڑی حد تک مختلف تھے۔ انھوں نے قانون کی تربیت فرانس میں حاصل کی تھی، اور وہ مغربی تہذیب اور افکار سے بہت متاثر تھے۔ ان کا شمار ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جو مصر کو مغرب کے نقش قدم پر چلانا چاہتے تھے۔ ان کے عہد میں برطانیہ سے دشمنی کے باوجود مصر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی زندگی میں مغرب کے وہ اثرات جن کی محمد علی کے زمانے سے آبیاری کی جا رہی تھی، اپنے عروج پر پہنچ گئے۔

سعد زغلول کے بعد وفد پارٹی کی قیادت مصطفیٰ نحاس پاشا (۱۸۷۶ء تا ۱۹۶۵ء) نے سنبھالی جو سعد زغلول کے دست راست تھے اور ۱۹۲۱ء میں زغلول کے ساتھ جو دوسرے رہنما جلا وطن کیے گئے، ان میں وہ بھی شامل تھے۔ وفد اب بھی مصر کی سب سے بڑی اور مقبول سیاسی جماعت تھی۔ اس جماعت نے نحاس پاشا کی قیادت میں ۱۹۳۶ء میں اور اس کے بعد ۱۹۴۲ء کے انتخابات میں واضح کامیابیاں حاصل کیں۔

وفد پارٹی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۳۶ء کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے کے تحت قاہرہ میں برطانوی ریزیڈنسی کو سفارت خانہ بنا دیا گیا۔ اور مصر کے شہروں سے برطانوی فوجیں چلی گئیں لیکن ان کو نہر سویز کے علاقے میں رکھنے کی اجازت مل گئی۔ سوڈان ایک مرتبہ پھر مصر اور برطانیہ کے مشترکہ انتظام میں دے دیا گیا، اور مصری فوج کو سوڈان میں داخلے کی اجازت مل گئی۔

وفد پارٹی کو نحاس پاشا کی قیادت میں نہ صرف یہ کہ برطانیہ کی مداخلت کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی، بلکہ اندرون ملک شاہی جبر و استبداد کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ نحاس پاشا شاہی اختیارات

کو کم کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے شاہ فواد سے اور ان کے مرنے کے بعد شاہ فاروق سے وفد پارٹی کی مستقل کشمکش رہی۔ اس دوران میں نحاس پاشا کئی مرتبہ وزیر اعظم ہوئے لیکن ہر مرتبہ ان کو یا تو بادشاہ نے برطرف کر دیا، یا ان کو مستعفی ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

۱۹۳۸ء میں وفد پارٹی میں افتراق پڑ گیا، اور اس سال وفد کے دو ممتاز رہنماؤں احمد ماہر پاشا اور محمود نقراشی پاشا نے نحاس پاشا سے اختلاف کی بنا پر سعد زغلول کے نام پر سعدی پارٹی قائم کی جس کا دعویٰ تھا کہ وفد کے مقابلے میں وہ سعد زغلول پاشا کے نظریات کی زیادہ سچی نمائندہ ہے۔ لیکن وفد پارٹی نے اس اختلاف کے باوجود مارچ ۱۹۴۲ء کے انتخابات میں پھر کامیابی حاصل کی۔ مصطفیٰ نحاس پاشا نے جنگ کے دوران برطانیہ سے پورا پورا تعاون کیا اور ان کا آخری بڑا کارنامہ عرب لیگ کی تنظیم ہے۔ وہ لیگ کی تنظیم میں مصروف تھے کہ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں شاہ فاروق نے ان کو برطرف کر دیا۔

فوجی انقلاب اور بادشاہت کا خاتمہ

مئی ۱۹۳۶ء میں شاہ فواد کے انتقال کے بعد سے ان کے صاحبزادے شاہ فاروق (۱۹۲۰ء تا ۱۹۶۵ء) مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ وہ مصر میں تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ۱۹۳۵ء میں انگلستان گئے ہوئے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کو مصر واپس آنا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ ایک سال بعد ۲۹۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو ان کی باقاعدہ تخت نشینی ہوئی۔ شاہ فاروق نے بھی اپنے باپ کی طرح آمرانہ طریقے جاری رکھے۔ انہوں نے ذاتی زندگی میں بھی کوئی اچھا نمونہ اختیار نہ کیا اور عیش و عشرت کی زندگی میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۲ء کا زمانہ مصر میں پولیس راج کا زمانہ تھا۔ وفد پارٹی اور شاہ فاروق کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری رہی۔ اب اس کشمکش میں اخوان المسلمون کی ایک نئی جماعت بھی شامل ہو گئی جو مصر میں اسلامی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ شاہ فاروق کے آمرانہ طرز عمل کی وجہ سے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اس زمانہ میں فلسطین کی تقسیم کے اعلان نے مزید پیچیدگی پیدا کر دی۔ مصری فوجوں کی تنظیمی اور اخلاقی حالت ناقابل اطمینان تھی، لیکن جب تقسیم فلسطین کا اعلان ہوا اور انگریزی فوجوں نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین خالی کر دیا تو عوام کے دباؤ کے تحت مصری فوج بھی

اسرائیل کی نئی صیہونی مملکت کے خلاف جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہوگئی اور شام اور اردن کی طرح مصر نے بھی اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دیں لیکن مصری فوج کو اتنی بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی جو اُردن کی مختصری فوج نے حاصل کر لی۔ مصری فوج صرف قصبہ غزہ اور اس کے گرد و نواح کی مختصری پٹی پر قبضہ کر سکی اور بالآخر مصر بھی دوسرے عرب ملکوں کی طرح ۱۹۴۹ء میں اسرائیل کے ساتھ جنگ بندی پر مجبور ہوگیا۔

فلسطین میں برطانیہ کی یہود نواز پالیسی نے برطانیہ سے مصر کے تعلقات اور خراب کر دیے۔ مصر میں برطانیہ کے خلاف بڑے پیمانے پر ہنگامے شروع ہوگئے اور برطانیہ کے خلاف مصریوں میں جذبات اتنے مشتعل ہو چکے تھے کہ مصری حکومت نے ۱۹۵۱ء میں وہ معاہدہ یک طرفہ طور پر منسوخ کر دیا جو ۱۹۳۶ء میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مصر میں مقیم برطانوی فوجوں سے تصادم شروع ہوگئے۔ مصری طلبہ اور اخوان المسلمون کے رضا کاروں نے نہر سویز کے علاقے میں داخل ہو کر برطانوی فوجی اڈوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ اس نازک موقع پر جب کہ مصر کو ایک طاقتور اور مضبوط حکومت کی ضرورت تھی۔ مصری سیاست کا یہ حال تھا کہ فروری ۱۹۵۲ء سے جولائی ۱۹۵۲ء تک پانچ ماہ کی مختصر مدت میں چھ وزیر اعظم آئے اور گئے۔ معاشی حالت بھی ابتر تھی اور بے روزگاری عام تھی۔ روئی کی تجارت پر جو ملک کی خوشحالی کا بہت بڑا ذریعہ تھی چند لوگوں کی اجارہ داری قائم تھی جس کا ملک کی معیشت پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہ حالات تھے کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں مصری فوج کے ایک گروہ نے جنرل نجیب کی قیادت میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ شاہ فاروق کو مصر چھوڑنے کی اجازت دے دی گئی اور وہ اٹلی چلے گئے جہاں ۱۸۔ مارچ ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

نظریاتی کشمکش

مصر میں جو غیر اسلامی مغربی اثرات محمد علی کے زمانے میں داخل ہونا شروع ہوئے تھے وہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ مغربی ملکوں میں مصری طلبہ کی تعلیم، علماء کے طبقے کا خود کو صرف دینی تعلیم تک محدود کر لینا، جدید نظامِ تعلیم سے اسلامی اصولوں کی بیدخلی، برطانوی اقتدار، مستشرقین کا علمی تحقیق کے پردے میں اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ، مسیحی

تبلیغی اداروں اور مدرسوں کا مصر میں قیام اور مصر کی مسیحی آبادی کی طرف سے مغربی تہذیب اور نظریات کا خیر مقدم ان اسباب میں سے ہے جو مصر میں غیر اسلامی افکار کے فروغ کا باعث ہوئے۔ مصریوں میں جب سیاسی اور ساجی بیداری پیدا ہوئی تو کچھ تو ماضی کے گہرے اثرات کی وجہ سے اور کچھ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کی موجودگی کی وجہ سے غیر اسلامی افکار شروع میں غلبہ حاصل نہ کر سکے اور مصطفیٰ کامل اور ان کے ساتھیوں نے جو سیاسی تحریک چلائی اس میں اسلامی فکر کو غلبہ حاصل رہا۔ لیکن اس کے بعد جب مغربی تعلیم یافتہ نئی نسل کے ہاتھ میں قیادت آئی، جو اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور نہ ہوسکی تھی تو صورت حال بدل گئی اور مصر میں علم و ادب کے میدان میں بھی ایسے لوگ پہلی صف میں آ گئے جن کا اندازِ فکر اسلامی نہیں بلکہ مغربی تھا۔

محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۵ء): مصر کی نظریاتی کشمکش کی تاریخ میں مفتی محمد عبدہٗ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے۔ وہ آٹھ سال تک اپنے استاد کی صحبت میں رہے تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر بھی وہی انقلابی جذبہ پیدا ہوگیا تھا جو جمال الدین افغانی میں تھا۔ جب جمال الدین افغانی مصر چھوڑ کر جانے لگے تو انہوں نے اپنے ان ساتھیوں سے جو ان کو الوداع کہنے آئے تھے کہا کہ "میں نے تمہارے لیے شیخ محمد عبدہ کو چھوڑ دیا ہے۔ مصر کے لیے اس قسم کا ایک عالم کافی ہے۔"

استاد کے جانے کے بعد محمد عبدہٗ اپنے اصلاحی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد ان کو تین سال کے لیے مصر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ جلاوطنی کا یہ زمانہ انہوں نے تونس، فرانس، انگلستان اور بیروت میں گزارا۔ اس زمانے میں جمال الدین افغانی پیرس میں تھے۔ محمد عبدہٗ بھی ان کے پاس چلے گئے اور دونوں نے مل کر پیرس سے عربی زبان میں عروۃ الوثقی کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے مضامین نے اسلامی دنیا میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بڑا کام کیا۔ انگریزوں نے اس رسالہ کا داخلہ مصر میں بند کر دیا تھا۔

چند سال بعد جب جلاوطنی کا زمانہ ختم ہوگیا تو محمد عبدہٗ مصر واپس آ گئے جہاں ان کو مصر کا مفتی مقرر کیا گیا۔ مصر کے مفتی کی حیثیت سے انہوں نے ملک کے اہم قانونی مسائل پر فیصلے دیے اور بہت سے اصلاحی کام انجام دیے۔ سرسید احمد خاں کی طرح مفتی محمد عبدہٗ بھی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے مستقبل کو صرف تعلیم کے ذریعہ ہی روشن بنایا جاسکتا

ہے۔ وہ مسلمان بچوں کو غیر مسلموں کے مدرسوں میں بھیجنے کے مخالف تھے اور انہوں نے لوگوں کو ایسا کرنے سے سختی سے روکا۔ مصر کا سب سے بڑا مدرسہ جامعہ ازہر تھا جو چوتھی صدی ہجری میں قائم ہوا تھا۔ یہاں اس وقت تک پرانے طریقے پر تعلیم دی جاتی تھی۔ محمد عبدہٗ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جامعہ ازہر کے انتظام اور نظام تعلیم کی اصلاح کی اور اس عظیم دینی مدرسہ کو جدید طرز پر منظم کرنے کے لیے مفید اصلاحات کیں۔

مفتی محمد عبدہٗ کو اکثر یورپ جانا پڑتا تھا اور ان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ یورپ کے مقابلے میں مسلمان اتنے پست ہیں۔ اس لیے وہ جب بھی یورپ جاتے تھے وہاں سے مسلمانوں کی اصلاح کا ایک نیا عزم لے کر آتے تھے۔ جدید علوم سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہوں نے چالیس سال کی عمر میں فرانسیسی زبان سیکھی۔ یورپ سے ان کو یہ دلچسپی محض اس لیے تھی کہ وہ یورپ کی اچھی باتوں سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنائیں، ورنہ محمد عبدہٗ مغربی نظریات، عقائد اور تہذیب کو مسلمانوں کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ وہ خدیو اسمٰعیل کی طرح مصر کو یورپ کا حصہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسلامی دنیا کا حصہ سمجھتے تھے۔ وہ فرانس، انگلستان، جرمنی اور امریکہ کو اجنبی شیطان کہتے تھے کیونکہ ان ملکوں نے اسلامی ملکوں میں مغربی طرز کے مدرسے قائم کر کے مسلمانوں کے عقائد کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔

محمد عبدہٗ اسلام ہی کو دینی اور دنیوی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنی تحریروں اور مضامین میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کے منتخب نمائندے جو بھی قانون وضع کریں اس میں یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلامی روح کے عین مطابق ہو۔ محمد عبدہٗ درحقیقت پرانے طرز کے علماء اور جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی درمیانی کڑی تھی۔ نہ تو وہ مغرب پسندوں کی طرح یورپ والوں کی آنکھیں بند کر کے تقلید کرتے تھے اور نہ قدامت پسندوں کی طرح ہر پرانی بات کو اسلام سمجھ کر اس پر اڑے رہتے تھے۔ مفتی محمد عبدہٗ نے ان بدعتوں کی بھی سختی سے مخالفت کی جو صوفیوں کے طریقوں اور مسلمانوں کی مذہبی تقریبات میں داخل ہوگئی ہیں۔

محمد عبدہٗ اگرچہ عقائد کے لحاظ سے ایک صحیح فکر رکھنے والے عالم تھے لیکن اس کے باوجود بعض مسائل میں انہوں نے مغرب اور اسلام کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں بعض ایسے فتوے بھی دیے جن سے علماء کے ایک بڑے طبقے نے اختلاف کیا۔ محمد عبدہٗ ایک زمانہ میں

فری میسن تحریک کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ ان کے بعض خیالات میں جو آزادی پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے عرب تجدد پسند اپنے خیالات کی تائید مفتی محمد عبدہ کے فتووں سے کرتے ہیں۔ مغربی مصنفین نے بھی شیخ محمد عبدہ کے مدرسہ فکر اور تحریک اصلاح کی تعریف کی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اسلامی ہند کے عظیم رہنما سرسید احمد خاں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود مشہور عالم رشید رضا مصری ان کو مجتہد فی الدین کا درجہ دیتے ہیں۔ مفتی محمد عبدہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں تفسیر المنار جو قرآن کے بارہ پاروں کی تفسیر ہے بہت اہم ہے۔ اس کا مقدمہ اور پہلے پانچ پاروں کی تفسیر مفتی صاحب کے قلم سے ہے باقی حصہ ان کے شاگرد رشید رضا مصری نے لکھا۔ ان کی ایک اور تصنیف رسالہ التوحید ہے جس کا شاید اردو میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

قاسم امین (۱۸۶۵ء تا ۱۹۸۰ء)

محمد عبدہ اپنی بعض لغزشوں کے باوجود اسلامی فکر رکھنے والے رہنما تھے۔ لیکن ان کے بعد جن لوگوں کے افکار نے مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ اور مصر کی معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا وہ بنیادی طور پر مفتی محمد عبدہ سے مختلف تھے۔ ان میں ایک قاسم امین ہیں۔ قاسم امین نسلاً کرد تھے وہ شیخ محمد عبدہ کے شاگرد اور پیشہ کے لحاظ سے جج تھے۔ جامعہ ازہر کے طالب علم تھے۔ اگرچہ علمی دنیا میں قاسم امین کا کوئی بلند مقام نہیں لیکن ان کی دو کتابوں نے مصر میں عورتوں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا اور ان کی وجہ سے مصر میں مغربی انداز کی تحریک آزادی نسواں کا آغاز ہوا۔ ان میں پہلی کتاب تحریر المراۃ (۱۸۹۹ء) یعنی ''عورتوں کی آزادی'' ہے اور دوسری المراۃ الجدیدۃ (۱۹۰۰ء) یعنی ''جدید عورت'' ہے۔ پہلی کتاب میں قاسم امین نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں ہاتھ اور منہ کھلا رکھنے کی اجازت ہے اور پردہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے تعدادِ ازدواج اور طلاق سے بھی بحث کی ہے اور وہی مسلک اختیار کیا ہے جو اہل مغرب کرتے ہیں۔ دوسری کتاب میں قاسم امین ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا خاندانی نظام، پردہ اور شرعی احکام کی پابندی مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ہے۔ اس کتاب میں قاسم امین پر مغربیت کا پورا غلبہ ہے اور وہ مصری عورت کو مغربی عورت کی

طرح دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کتابوں نے مصر کی فکری دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ بحثوں اور جواب در جواب کا ایک سلسلہ چل نکلا جو پچاس سال تک جاری رہا۔ مصر میں آزادیٔ نسواں کی نام نہاد تحریک جس نے وہاں کے خاندانی نظام کو برہم کیا اور عریانیت اور بداخلاقی کو فروغ دیا اس کا آغاز قاسم امین کی ان ہی دو کتابوں سے ہوا۔

علی عبدالرزاق

مصر کی نظریاتی کشمکش کی تاریخ میں علی عبدالرزاق کا نام بھی بہت اہم ہے۔ قاسم امین کی طرح وہ بھی جامعہ ازہر کے طالب علم تھے اور شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد تھے، پھر انہوں نے انگلستان جا کر آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''الاسلام و اصول الحکم'' میں جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی پہلی مرتبہ خلافت کی ضرورت سے انکار کیا اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے زیادہ تر مستشرقین سے حوالے دیے ہیں، اسلامی قوانین سے انکار کیا ہے اور خلفائے راشدین کی حکومت کو ایک سیکولر حکومت قرار دیا ہے۔ ان کے خیالات کی وجہ سے علمائے ازہر نے ان کو علماء کی فہرست سے خارج کر دیا۔ علی عبدالرزاق مصر میں سیکولرازم کے پہلے بڑے مبلغ ہیں اور ان کو مصر میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ترکی میں ضیا گوک الپ کو حاصل ہے۔

سیاست کو اسلام کے اثر سے آزاد کرانے کے بعد اہل مصر کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے نظریے کی تھی جس کی بنیاد پر قومی تعمیر کی جا سکے۔ لہٰذا قوم پرستی اور وطن پرستی کے تصور نے اس کمی کو پورا کیا۔ چنانچہ موجودہ صدی کا نصف اول مصری قوم پرستی کے عروج کا دَور ہے۔ فرعونوں کے دَور کو مصر کی تاریخ کا قابل فخر دَور قرار دیا گیا اور ترکی اور ایران کی طرح اسلامی دَور کو زیادہ سے زیادہ نظر انداز کیا گیا۔ نحن آل فرعون کا نعرہ لگایا گیا۔ قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے فرعون رعمسیس کا مجسمہ تعمیر کیا گیا۔ ابوالہول کا سر ڈاک کے ٹکٹوں اور کرنسی نوٹوں پر چھاپا گیا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں نے اپنے لیے دَور فراعنہ کے مختلف بتوں میں سے کسی نہ کسی بت کو اپنا شعار قرار دیا۔ فن تعمیر میں فرعونی دور کا طرز اپنایا گیا اور سرکاری عمارتوں میں فرعونی طرز تعمیر اختیار کیا گیا۔ سعد زغلول کا مقبرہ فرعونی طرز پر بنایا گیا۔ سیر و سیاحت کے محکمہ نے بیرونی

ملکوں میں قبل از اسلام کی عمارتوں اور بتوں کی اسلامی دور کی خوبصورت عمارتوں سے زیادہ پبلسٹی کی۔ جب مصریوں کا اسلام سے تاریخی رشتہ کاٹ دیا گیا تو مصر کے مغرب پرستوں کے لیے اپنے کعبہ کا رخ مکہ معظمہ سے یورپ کی طرف موڑنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں سلام موسیٰ نے اپنی کتاب الیوم والغد (آج اور کل) شائع کی اور اس میں صاف صاف لکھا کہ "ہمیں ایشیا سے قطع تعلق کر کے یورپ سے وابستہ ہو جانا چاہیے، میں مشرق کا کافر اور مغرب کا مومن ہوں۔" ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ۱۹۲۶ء میں الشعر الجاہلی لکھی جس میں قرآن و حدیث پر لوگوں کے اعتقاد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مستقبل الثقافۃ فی المصر کے نام سے ایک اور کتاب لکھی اور اس میں رنے کے لیے ایسا تعلیمی نقشہ پیش کیا جس کا مقصد مصر کو مغرب کی طرف لے جانا ہے۔ اس زمانہ میں آزادی نسواں کی تحریک کو فروغ ہوا۔ سعد زغلول کی بیوہ صفیہ زغلول نے اس تحریک کا آغاز کیا اور ہدیٰ شعراوی نے آزادی نسواں کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس نے مصری خواتین کے لیے مغربی خواتین کو قابل تقلید نمونہ کے طور پر پیش کیا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین جدید عربی ادب کے سرخیل اور نوجوان لکھنے والوں کے محبوب اور ان کے مثالی ادیب و مفکر ہیں۔ مشرقی عربی کی جدید نسل پر شاید ان سے زیادہ کسی نے اثر نہیں ڈالا۔ وہ ایک ایسے طرز نگارش کے بانی ہیں جس کو اگرچہ بعض ناقدین اور اہل ذوق زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن اس کی سلاست، صحت زبان اور حسن مسلم ہے۔ وہ بچپن ہی میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے مکتب میں داخل ہو کر قرآن حفظ کیا، کچھ مدت جامعہ ازہر میں تعلیم پائی، لیکن ان کی کتابوں میں طالب علمی کے اس دور سے جگہ جگہ بیزاری کا اظہار نظر آتا ہے۔ جامعہ مصریہ (قاہرہ یونیورسٹی) سے ابوالعلاء المعری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ پھر پیرس چلے گئے۔ واپسی پر ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء فواد اول یونیورسٹی میں پہلے پروفیسر رہے پھر فکلٹی آف آرٹ کے ڈین ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ اسکندریہ یونیورسٹی کے ریکٹر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء وزیر تعلیم رہے اور پاشا کا خطاب پایا۔ ان کی تعلیمی خدمات پر اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کا انعام دیا۔

طٰہٰ حسین مغربی فلسفہ کے گرویدہ اور فرانسیسی ثقافت و ادب کے دلدادہ ہیں۔ ان کو فرانس

سے گہرا ذہنی اور ادبی لگاؤ ہے۔ انہوں نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کی اور ان کی اولاد کی تربیت بھی فرانسیسی ماحول میں ہوئی۔ ان کو فرانسیسی زبان وادب پر اچھی قدرت تھی ورانہوں نے فرانسیسی ادب کے ذخیرہ کو اور فرانسیسی خیالات کو عربی میں منتقل کیا۔ ان کی کتابوں میں مستشرقین کے خیالات وتحقیقات کا عکس پایا جاتا ہے۔ ذہنی اپج، طبیعت کی بے چینی اور جدت پسندی ان کی خصوصیات ہیں۔ انہوں نے بہت سے ایسے خیالات کا اظہار کیا جو ادب، تاریخ اور دین کے مسلّم اور معروف خیالات وعقائد کے خلاف تھے اور جن پر مصر کے ادبی اور دینی حلقوں میں سخت تنقیدیں ہوئیں۔

طٰہٰ حسین چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ فرانسیسی ڈرامہ پر پانچ جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ یونانی اور فرانسیسی ڈرامہ نویسوں کے ڈراموں کا عربی ترجمہ کیا۔ الایام میں اپنی تعلیمی زندگی کی سرگذشت بیان کی۔ الشعر الجاہلی (۱۹۲۶ء) اور مستقبل الثقافۃ فی المصر (۱۹۳۸ء) ان کی دوسری اہم کتابیں ہیں۔ آخر عمر میں پختگی یا سن رسیدگی کے اثر کے تحت سیرت اور صحابہ کے حالات پر بعض موثر اور دل آویز کتابیں لکھیں جن میں علیٰ ہامش السیرۃ اور الوعد الحق خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور جن کے اُردو میں بھی ترجمے ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے خیال میں مصری فکر اور دماغ یا تو بالکلیہ مغربی فکرودماغ ہے یا اس سے بہت زیادہ قریب ہے اور اس کا یونانی فکر سے جس قدر گہرا لگاؤ ہے مشرقی فکر سے اسی قدر بعد ہے۔ ان کے نزدیک اگر مصری فکرودماغ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک کسی علاقہ سے متاثر ہوا ہے تو وہ بحیرہ روم کا منطقہ اور اس کا فکرودماغ ہے۔ چنانچہ وہ مصریوں کو مغربی تہذیب کو اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔[1]

رشید رضا مصری (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۵ء)

مصر اسلامی علوم کا قدیم ترین اور اہم ترین مرکز رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہاں غیر اسلامی افکار کے خلاف ردعمل نہ ہوتا۔ شروع شروع میں مغربی نظریات کے مضر اثرات چونکہ نمایاں نہیں ہوئے تھے اس لیے ان کی منظم طریقہ پر مخالفت نہیں کی گئی صرف بعض اہل قلم کی طرف سے ان

---

(۱) ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اُردو میں سب سے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کا مقالہ فکرونظر۔

کے انفرادی طور پر ردعمل کا اظہار ہوتا رہا۔ منظم ردِعمل بعد میں شروع ہوا۔ ابتدائی دور کے ان علماء میں جنہوں نے غیر اسلامی افکار کے خلاف آواز بلند کی رشید رضا مصری، مصطفیٰ صادق رافعی اور محمد فرید وجدی کے نام نمایاں ہیں۔

رشید رضا مصری لبنان کی بستی قلمون (طرابلس) کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے مصر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ محمد عبدہٗ کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے علاوہ جمال الدین افغانی کے خیالات سے بھی بہت متاثر تھے۔ رشید رضا اتحاد اسلامی کے علمبردار اور قوم پرستی کے سیاسی نظریہ کے شدید مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قوم پرستی مسلمانوں میں صرف انتشار پھیلانے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ الحاد اور بے دینی سے قریب تر کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ وہ مصطفیٰ کمال کی سیکولرازم اور اس پر مبنی اصلاحات کے بھی مخالف تھے اور انہوں نے مصری مصنف شیخ علی عبدالرزاق کے اس نظریہ پر سخت تنقید کی کہ مصر کو ترکی کے نقشِ قدم پر چل کر سیاست کو مذہب سے الگ کر دینا چاہیے۔ انہوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب الشعر الجاہلی پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہٗ کے ان خیالات سے بھی اختلاف کیا جن میں مغربی افکار سے مرعوبیت پائی جاتی ہے۔

رشید رضا اپنے خیالات کا اظہار رسالہ "المنار" کے ذریعے کرتے تھے جو ۱۸۹۷ء میں ایک ہفت روزہ کی شکل میں نکلا لیکن بعد میں ماہنامہ کر دیا گیا۔ اس رسالے میں ان کے علاوہ مشہور لبنانی ادیب امیر شکیب ارسلان اور فرید وجدی بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ رشید رضا کی سب سے اہم کتاب تفسیر المنار ہے جو قرآن کے پہلے بارہ پاروں کی سورۂ یوسف تک تفسیر ہے اور جس کے آخری سات پاروں کی تفسیر انہوں نے لکھی۔ انہوں نے شیخ محمد عبدہٗ کی مفصل سوانح عمری بھی لکھی جو اس انداز کی ہے جیسی سید سلیمان ندوی نے اپنے اُستاد مولانا شبلی نعمانی کی سوانح لکھی ہے۔ رشید رضا کی ایک اور اہم کتاب الخلافۃ والامامۃ العظمیٰ ہے۔ ان کی بعض کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

مصطفیٰ صادق رافعی (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۷ء)

مصر کے ان جدید ادیبوں میں جو عربی میں کلاسیکی اسلوب تحریر کے ماہر ہیں مصطفیٰ صادق

رافعی کا نام نمایاں ہے۔ ان کو بیسویں صدی کا جاحظ کہا جاتا ہے۔ المعرکہ بین القدیم والجدید (جدید وقدیم کی جنگ) اور تحت رایۃ القرآن (قرآن کے جھنڈے کے نیچے) ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ان میں انہوں نے طٰہٰ حسین کی کتاب الشعر الجاہلی اور دوسری باتوں کا جواب دیا ہے۔

فرید وجدی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۴ء)

فرید وجدی کا شمار موجودہ صدی کے نصف اوّل کے عظیم ترین مصنفوں میں ہوتا ہے۔ وہ اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ مجلہ ''الحیاۃ'' اور روزنامہ ''الدستور'' کے مدیر تھے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب دائرۃ المعارف ہے جو دس جلدوں پر مشتمل عربی کی مشہور انسائیکلوپیڈیا ہے۔ لبنان کے پطرس بستانی کے بعد یہ عربی کی دوسری انسائیکلوپیڈیا ہے جو ایک شخص کی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ المدینۃ والاسلام اور الامراۃ المسلمہ ان کی دوسری اہم کتابیں ہیں۔ آخر الذکر کتاب قاسم امین کی کتاب کا جواب ہے اور اُردو میں مسلمان عورت کے نام سے ترجمہ ہوگیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب کا اُردو ترجمہ ''اسلام کے عالمگیر اصول'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لیے علمی میدان میں انہوں نے رشید رضا کے بعد سب سے زیادہ کوشش کی۔

رشید رضا، رافعی اور فرید وجدی اگرچہ اپنی زندگی میں مغربی افکار کے سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن ان کی تحریروں نے مصر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے راہ ہموار کی۔ اور غیر اسلامی افکار کا پہلا حملہ انہوں نے اپنے سینہ پر روکا۔ ان مخلص افراد کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی تحریریں انفرادی احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا انداز مدافعانہ تھا اور ان کی پشت پر کوئی ایسی تحریک موجود نہیں تھی جو اسلامی افکار کو سیاسی، معاشی اور سماجی میدانوں میں مثبت طور پر پیش کرسکے۔ اس کمی کو رشید رضا مصری ہی کے حلقے کے ایک نوجوان حسن البنا شہید نے پورا کیا۔

حسن البنا اور اخوان المسلمون

حسن البنا (۱۹۰۶ء تا ۱۹۴۹ء) مصر کی بستی محمودیہ کے ایک علم دوست اور دیندار گھرانے میں اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بچپن میں قرآن حفظ کرلیا اور ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے

۱۹۲۷ء میں سند حاصل کی۔ دیہاتی علاقوں کی نسبت شہروں میں اخلاقی انحطاط زیادہ ہوتا ہے۔ قاہرہ کی بھی یہی صورت تھی۔ حسن البنا جب اپنے قصبہ سے قاہرہ پہنچے تو ان کی حساس طبیعت پر شہر کے غیر اسلامی رجحانات نے گہرا اثر کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مصر کو یورپ کا حصہ بنایا جارہا ہے۔ اور فرعون کے دَور کی طرف پلٹنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ علماء اگرچہ غیر اسلامی نظریات کے خلاف وعظ و نصیحت تو کرتے رہتے ہیں، لیکن ان برائیوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی تحریک موجود نہیں تو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں شہر اسمٰعیلیہ میں جہاں وہ تعلیمی سند حاصل کرنے کے بعد استاد مقرر ہو گئے تھے، اخوان المسلمون کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۳ء میں اخوان کا صدر دفتر اسمٰعیلیہ سے قاہرہ منتقل کر دیا گیا۔

حسن البنا نے اعلان کیا کہ اسلام کا پیغام عالمگیر ہے، اور اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اخوان المسلمون کی تنظیم کے ذریعہ انہوں نے اپنے اسی نصب العین کو عملی جامعہ پہنانے کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی مصر کے طول و عرض میں اخوان المسلمون کی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ طلبہ اور مزدوروں کو منظم کیا گیا اور عورتوں کی تنظیم کے لیے "اخوات المسلمین" کے نام سے علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ اخوان نے مدرسے بھی قائم کیے اور رفاہ عام کے کاموں میں بھی حصہ لیا۔ انہوں نے ایک ایسا نظام تربیت قائم کیا جس کے تحت اخوان کے کارکن بہتر قسم کے مسلمان بن سکیں۔

حسن البنا نے اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ پچاس سال سے مصر میں غیر اسلامی آئین آزمائے جارہے ہیں اور وہ سخت ناکام ہوئے ہیں لہٰذا اب اسلامی شریعت کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مصر کے موجودہ دستور اور قانون کے ماخذ کتاب و سنت نہیں بلکہ یورپ کے ممالک کے دستور اور قوانین ہیں جو اسلام سے متصادم ہیں۔ حسن البنا نے مصریوں میں جہاد کی روح بھی پھونکی اور اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور بتایا کہ مصر ہی کے ایک عالم امام بدر الدین عینی شارح بخاری ایک سال جہاد کرتے تھے اور ایک سال تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور ایک سال حج کرتے تھے۔[1]

(۱) حسن البنا کے لکھے ہوئے کتابچوں اور خود حسن البنا کی زندگی کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے "حسن البنا کی ڈائری" ترجمہ خلیل احمد حامدی (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور)

اخوان نے اخبار اور رسالوں کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۳۵ء میں رشید رضا کے انتقال کے بعد ان کے رسالے "المنار" کی ادارت حسن البنا نے سنبھال لی۔ اخوان نے خود بھی ایک روزنامہ، ایک ہفت روزہ، اور ایک ماہنامہ جاری کیا۔ روزنامہ اخوان المسلمون مصر کے صف اول کے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ ان مطبوعات اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں کے ذریعہ اخوان نے اپنے اغراض و مقاصد کی پُرزور تبلیغ کی اور بتایا کہ اسلام کس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ علمی لحاظ سے اخوان کا کام اگرچہ اتنی بلند علمی سطح پر نہیں تھا جس پر پاکستان میں جماعت اسلامی نے انجام دیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت اسلامی کے علاوہ اسلامی دنیا کی کسی اور تنظیم نے فکری میدان میں اخوان کے برابر کام نہیں کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک اخوان کی دعوت مشرق کے بیشتر عرب ملکوں میں جڑ پکڑ چکی تھی لیکن اخوان کا سب سے مضبوط مرکز مصر ہی تھا۔ جنگ کے بعد اخوان نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین سے برطانیہ کے انخلاء کے بعد جہاد فلسطین میں عملی حصہ لیا اور اخوان رضا کاروں نے سرکاری فوجوں کے مقابلے میں زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ دورانِ جنگ انگریزوں نے آزادی مصر کا جو اعلان کیا تھا اسے اخوان نے فوری طور پر پورا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس سے اخوان کی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ ہوا، اور دو سال کے اندر اندر اخوان کے ارکان کی تعداد پان لاکھ تک پہنچ گئی۔ ہمدردوں کی تعداد اس سے دُوگنی تھی۔ اخوان کی روز افزوں مقبولیت سے اگر ایک طرف شاہ فاروق خطرہ محسوس کرنے لگے تو دوسری طرف برطانیہ نے مصر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اخوان پر پابندی لگائی جائے چنانچہ ۹۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مصری حکومت نے اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور کئی ہزار اخوان کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تین ہفتے بعد وزیر اعظم نقراشی پاشا کو ایک نوجوان نے قتل کر دیا۔ حسن البنا کو آخر تک گرفتار نہیں کیا گیا اور ۱۲۔ فروری ۱۹۴۹ء کی ایک شب کو اس عظیم اخوان رہنما کو ایک سازش کے تحت رات کی تاریکی میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

تقریباً چار ہزار اخوان کارکن ڈیڑھ سال تک قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے۔ اس کے بعد جب ۱۹۵۱ء میں وفد پارٹی برسر اقتدار آئی تو ان کو رہائی ملی۔ اب مصری حکومت نے ان پر یہ پابندی لگائی کہ اخوان اپنی سرگرمیاں مذہب کے دائرے میں محدود رکھیں۔ اخوان نے دین و دنیا

کی اس تفریق پر احتجاج کیا۔ اس اثنا میں مصر نے برطانیہ سے ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی تنسیخ کا فیصلہ کیا۔ اخوان نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا اور اس فوج آزادی میں شامل ہو گئے جو سویز کے علاقے میں چھاپہ مار جنگ کے لیے تیار کی گئی تھی۔

اخوان کی ان خدمات کے پیش نظر وفد کی حکومت نے اخوان پر سے پابندیاں اٹھالیں اور ان کی جائداد واپس کر دی۔

وفد پارٹی اور شاہ فاروق کے درمیان ۱۹۳۶ء کے معاہدے کے بعد بھی کشمکش جاری رہی۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق نے وفد کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اس موقع پر مشہور برطانوی اخبار (states man of nation) نے ۲۲۔ مارچ ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں لکھا:

''کسی شاہانہ فوجی آمریت سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھنا ہمارے لیے احمقانہ خام خیالی سے کم نہیں۔ وفد پارٹی خواہ خراب اور کمزور ہی کیوں نہ ہو لیکن اخوان المسلمون وفد پارٹی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ جہاں وفد پارٹی اپنی اصلیت کے اعتبار سے ایک مغربی جمہوریت پسند پارٹی ہے وہاں اخوان المسلمون مذہبی جنون کی بناء پر مغرب سے ہر قسم کے اشتراک عمل سے متنفر ہے۔ وفد پارٹی جس قدر کمزور ہو گی، اخوان المسلمون اسی قدر مضبوط ہوتی جائے گی۔ یونیورسٹیوں میں اخوان پہلے ہی سے چھائے ہوئے ہیں، اور انہوں نے کمیونسٹوں کے شانہ بشانہ اپنی علیحدہ ٹریڈ یونینیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔ اخوان کو یقین ہے کہ جس دن وفد پارٹی کا زور ٹوٹ جائے گا، اس دن اس کی قسمت کا ستارہ چمکے گا۔ اگر ہم نے وفد پارٹی کو کمزور کرنے کے شاہی منصوبے سے چشم پوشی کی تو اس سے امن وامان کے قیام میں کوئی فائدہ نہ ہو گا، بلکہ ہم آنے والے انقلاب کی باگیں ان مذہبی مجنونوں کے ہاتھ منتقل کر دیں گے جن کی تحریک کی بنیاد ہی مغرب سے نفرت پر ہے۔''

باب ۳۰

۲۔ مصر

قیام جمہوریت سے انور سادات تک

فوجی انقلاب

۲۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب گیارہ افسروں پر مشتمل مصری فوجیوں کی ایک خفیہ تنظیم لائی تھی جو آزاد افسروں کی سوسائٹی کہلاتی تھی۔ شاہ فاروق کو تخت سے علیحدہ کرنے کے ساتھ آئین منسوخ کر دیا گیا اور ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ ۷۔ ستمبر کو نئے کمانڈر انچیف جنرل نجیب [1] وزیراعظم مقرر کیے گئے۔ ۱۸۔ جون ۱۹۵۳ء کو بادشاہت کا نظام ختم کر کے مصر کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا، جس کے بعد جنرل نجیب صدر ہو گئے۔ جنرل نجیب کی سربراہی میں ایک انقلابی کمانڈ کونسل قائم کر دی گئی۔ انقلابیوں نے شروع میں محب وطن افراد کے تعاون سے اصلاحات اور تعمیر جدید کے کام کا آغاز کیا۔ شہریوں اور ممتاز افراد کی کمیٹیاں بنائی گئیں تاکہ وہ نئی حکومت کی تشکیل اور نئے آئین کی تیاری میں مدد کریں۔ ۹۔ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اصلاح اراضی کا اعلان کیا گیا۔ دو سو ایکڑ سے زیادہ زمینوں کے مالکوں سے فاضل زمین خرید کر ایسے کاشت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جن کے پاس یا تو زمین نہیں تھی یا بہت کم تھی۔ شاہی جائداد ضبط کر لی گئی اور شاہی زمینیں کم شرح پر کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ لوگوں نے ان اصلاحات پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور حکومت سے عوام کی نئی امیدیں پیدا ہو گئیں۔

---

(۱) جنرل محمد نجیب ۱۹۰۱ء میں خرطوم (سوڈان) میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے وکالت کی سند کے علاوہ مصر کی ملٹری اکیڈمی اور اسٹاف کالج میں فوجی تعلیم حاصل کی تھی۔ فلسطین کی جنگ میں ۱۹۴۸ء میں انہوں نے نمایاں شجاعت کا اظہار کیا تھا۔ انقلاب سے پہلے وہ فوجی افسروں کے کلب کے صدر تھے۔ نجیب آزاد افسروں کی تنظیم میں شامل نہیں تھے، لیکن آزاد افسروں نے ان کو اس لیے اپنا رہنما بنایا کہ وہ فوجی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور آزاد افسروں کے اصلاحی پروگرام سے ان کو ہمدردی تھی۔

انقلابیوں میں کسی کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ مستقل حکومت قائم کریں گے۔ اس لیے یہ توقع کی جاتی تھی کہ ضروری اصلاحات کے بعد شہری حکومت بحال ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا اور فوجی تسلط مضبوط ہوتا چلا گیا۔ جنرل محمد نجیب فوجی افسروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو پارلیمانی نظام حکومت کرنے اور جمہوریت کو جلد از جلد بحال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جمال ناصر جو اس انقلاب کی پشت پر اصل طاقت تھے جمہوریت کی بحالی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے انقلاب اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گا۔ جنرل نجیب اور کرنل ناصر میں اختلاف بڑھتا چلا گیا جس کے نتیجے میں نجیب کو بتدریج ان کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔ ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۴ء کو ناصر نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا اور جنرل نجیب صرف صدر رہ گئے۔ اس کے بعد ۱۴۔ نومبر ۱۹۵۴ء کو صدارت کا یہ عہدہ بھی ان سے چھین لیا گیا اور جمال ناصر صدر اور وزیر اعظم دونوں ہو گئے۔ جنرل نجیب کی حمایت میں بعض فوجی افسروں نے مظاہرہ کیا لیکن وہ بے نتیجہ ثابت ہوا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اخوان رہنما بھی جو جمہوریت کی بحالی کے حامی تھے ناصر کی سخت پالیسی کا نشانہ بنے۔ جس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

جمال عبدالناصر (۱۹۱۸ء تا ۱۹۷۰ء)

جنرل نجیب کی علیٰحدگی کے بعد مصر کا اقتدار پوری طرح جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں آ گیا اور اس کے بعد وہ اپنی وفات تک سولہ سال تک مصر پر بلا شرکت غیرے حکومت کرتے رہے۔ جمال عبدالناصر کے صوبہ رسیلوط کے ایک قصبے میں ۱۵۔ جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ قاہرہ میں مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جمال ناصر نے ۱۹۳۶ء میں فوجی کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۴۲ء میں اسی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے آزاد افسروں کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جو سیاسی اصلاحات کے خواہش مند فوجی افسروں پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ فلسطین میں انہوں نے شجاعت کا مظاہرہ کیا اور زخمی ہوئے۔ اس جنگ میں عربوں کی ناکامی کا آزاد افسروں کی تنظیم نے گہرا اثر قبول کیا اور اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں یہاں تک کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں جمال ناصر نے آزاد افسروں کی مدد سے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ انقلاب کے بعد سارے

اختیارات انقلابی کمانڈ کے سپرد کر دیے گئے جو گیارہ افسروں پر مشتمل تھی اور اگرچہ اس میں جنرل نجیب کو نمایاں حیثیت حاصل تھی لیکن اس کو کنٹرول جمال ناصر کرتے تھے جن کی حیثیت لیفٹیننٹ کرنل کی تھی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ نہر سویز سے برطانوی فوجوں کی واپسی اور سوڈان کا مصر سے الحاق مصری قوم پرستوں کے دو سب سے بڑے مطالبے تھے جن کی وجہ سے برطانیہ اور مصر میں مستقل کشمکش رہتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں سویز سے متعلق مصر اور برطانیہ کے معاہدے کی [illegible] کے بعد برطانوی فوجوں نے سویز کا علاقہ خالی کر دیا اور یہ مسئلہ بڑی حد تک مصری حکومت کی مرضی کے مطابق حل ہو گیا۔ لیکن سوڈان کا مسئلہ مصریوں کی خواہش کے مطابق حل نہ ہو سکا۔ سوڈان میں اگرچہ ایسی سیاسی جماعتیں تھیں جو سوڈان اور مصر کو ایک وفاق کی شکل میں متحد کرنے کی حامی تھیں لیکن مصر میں فوجی انقلاب کے ظہور میں آنے اور دستوری حکومت کے خاتمہ کی وجہ سے اتحاد کی حامی ان جماعتوں کا موقف کمزور ہو گیا۔ ویسے بھی مصر میں قوم پرستی کا جو رجحان فروغ پا رہا تھا، اس کی موجودگی میں سوڈان کے باشندوں کے لیے مصر سے الحاق میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ یہ اتحاد صرف اسلام کی نظریاتی بنیاد پر ہو سکتا تھا۔

چنانچہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو جب برطانیہ نے سوڈان کو آزادی دی، تو سوڈان نے ایک مکمل اور آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم رہنا پسند کیا۔

۱۹۵۶ء کے وسط میں مصر کا نیا آئین بھی تیار ہو گیا اور اس آئین کے تحت کرنل ناصر جمہوریہ مصر کے صدر منتخب ہوئے۔ اس آئین میں مصر کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا اور عبادت، تحریر و تقریر کی آزادی اور نجی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا۔

اسوان بند کا تنازعہ

صدر ناصر شروع شروع میں ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جو مغربی ملکوں کے خلاف نہیں جاتی تھی لیکن ۱۹۵۴ء کے بعد سے وہ روس اور اشتراکی ملکوں کی طرف زیادہ جھکنے لگے اور اس طرح مصر اور مغربی ملکوں کے درمیان براہِ راست کشمکش شروع ہو گئی، جس کا پہلا بڑا اظہار اسوان بند کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا۔ مصر کی خوشحالی کا تمام تر انحصار دریائے نیل پر ہے، جس کی وجہ سے مصر

کو تحفہ نیل کہا جاتا ہے۔ نیل کے پانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مصری حکومت نے اسوان کے مقام پر پرانے بند کی جگہ ایک نیا اور زیادہ بڑا بند تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ تا کہ مصر میں مزید زمین زیر کاشت آسکے اور پن بجلی بڑی مقدار میں حاصل ہو سکے۔ امریکہ، برطانیہ اور عالمی بنک نے اس منصوبے کے لیے قرض فراہم کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن ان ملکوں نے جب دیکھا کہ مصر، رُوس اور اشتراکی ملکوں کی طرف مائل ہو رہا ہے اور ایک ایسی پالیسی پر چل رہا ہے جو ان کے مفاد کے خلاف جاتی ہے تو قرض دینے کے فیصلے کو جولائی ۱۹۵۶ء میں واپس لے لیا۔ اسوان بند کی تعمیر مصری معیشت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے مصر میں امریکہ اور برطانیہ کے فیصلے کا شدید ردعمل ہوا اور صدر ناصر نے نہر سویز کو جو اب تک برطانیہ اور فرانس کی ایک کمپنی کی ملکیت تھی، مصر کی قومی ملکیت میں لے لیا اور اعلان کیا کہ اسوان کا بند نہر سویز کی آمدنی سے تعمیر کیا جائے گا۔

برطانیہ اور فرانس نے مصر کے اس فیصلے کے خلاف اسرائیل کے ساتھ مل کر سازش کی جس کے تحت ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کر کے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا۔ اگلے ہفتے برطانیہ اور فرانس نے بھی نہر سویز کے علاقے میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ برطانیہ اور فرانس کی اس جارحانہ کاروائی کا دنیا میں شدید ردعمل ہوا، رائے عامہ کے اس دباؤ کے تحت برطانیہ اور فرانس کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں اور اسرائیل نے بھی جزیرہ نما سینا خالی کر دیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے دستے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر متعین کر دیے گئے تا کہ طرفین ایک دوسرے کے خلاف جنگی کاروائی نہ کر سکیں۔

روسی اثر کا بڑھنا

نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے کر اور برطانیہ اور فرانس کے حملوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کر کے ناصر نے جس ہمت کا ثبوت دیا، اس کی وجہ سے عربوں میں بالخصوص اور دُنیا میں بالعموم مصر کا وقار بڑھ گیا لیکن مصر کے وقار میں اس اضافے کے ساتھ ہی ساتھ مصر پر روس کے اثرات میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب تک مصر کے بیشتر ترقیاتی منصوبے امریکہ اور مغربی ملکوں کی امداد سے مکمل کیے جاتے تھے لیکن سویز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد مغربی ملکوں سے مصر کے تعلقات

ختم ہو گئے۔ اس طرح بیرونی امداد کے معاملے میں جو خلا پیدا ہوا، اسے روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں نے پُر کرنے کی کوشش کی۔ اسوان بند کی تعمیر کی ذمہ داری بھی روس نے قبول کر لی۔ رُوس نے وسیع پیمانہ پر مصر کو اسلحہ بھی فراہم کرنا شروع کر دیے۔ مصر نے یہ پالیسی اگرچہ مغربی اثرات سے آزاد رہ کر قومی مقاصد کو اپنی مرضی کے مطابق پورا کرنے کے لیے اختیار کی تھی، لیکن مغرب سے پوری طرح کٹ جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کی غیر جانبدارانہ پالیسی ختم ہوگئی۔ اور مصر نہ صرف اپنے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے بلکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اپنی بقاء کے لیے روس کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ مصر کی حالت تقریباً اسی قسم کی ہوگئی جو سوکارنو کے آخری دَور میں انڈونیشیا کی ہوگئی تھی۔ ناصر نے اگرچہ انقلاب کے آغاز ہی میں کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اشتراکی نظریات پہلے سے زیادہ شدت سے مصر میں عام ہونا شروع ہو گئے، اور صدر ناصر کے دَور میں مصر میں جن سماجی اور اقتصادی نظریات کا غلبہ ہوا وہ روس کے اشتراکی نظریات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

صدر ناصر چونکہ عرب دنیا کی مقبول ترین شخصیت بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر عرب اتحاد کے لیے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اس مقصد کی تکمیل میں عرب ملکوں کے بادشاہی نظام اور غیر اشتراکی نظام سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ناصر نے ان کو ختم کرنے کے لیے جمہوری طریقوں کی بجائے سازشوں کا طریقہ اختیار کیا اور عرب ملکوں میں براہ راست مداخلت شروع کر دی۔ اس طریق کار نے عرب ملکوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ناصر عرب اتحاد نہیں چاہتے، بلکہ اپنا اقتدار چاہتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ عرب ملکوں کے اختلافات پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔

عرب اتحاد کے نقطۂ نظر سے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کا زمانہ سب سے کامیاب زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۵۸ء میں شام میں اشتراکیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے شام نے مصر سے الحاق کر لیا اور اس طرح دونوں ملکوں پر مشتمل متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی۔ بعد میں یمن بھی اس جمہوریہ کا تیسرا رُکن بن گیا، لیکن صدر ناصر کی آمرانہ پالیسی کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ کی گاڑی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ سب سے پہلے شام نے بغاوت کی اور وہ ۳۰/ ستمبر ۱۹۶۱ء کو مصر سے علیٰحدہ ہو گیا۔ اس کے بعد یمن کو خود مصر نے متحدہ عرب جمہوریہ سے خارج

کر دیا۔ اس کے باوجود مصر کے لیے متحدہ عرب جمہوریہ کی اصطلاح دس سال مزید یعنی ستمبر ۱۹۷۱ء تک استعمال ہوتی رہی۔

صدر ناصر اگرچہ اپنے حامیوں کی مدد سے عراق، شام اور اُردن میں مداخلت کرتے رہے تھے اور سعودی عرب کے خلاف انہوں نے مسلسل مہم چلائی لیکن دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مصر کی مداخلت کی سب سے نمایاں مثال یمن کی ہے۔ یہاں انہوں نے پہلے تو یمنی حریت پسندوں کے ایک گروہ سے سازش کر کے ستمبر ۱۹۶۵ء میں امام یمن کا تختہ پلٹا اور جب اس کے نتیجے میں شاہ پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو صدر ناصر نے اپنے حامیوں کی مدد کے لیے وسیع پیمانے پر فوج اور اسلحہ یمن بھیجنا شروع کر دیا اور چند ماہ کے اندر یمن میں مصری فوجیوں کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناصر کے اس جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے عرب کے ایک انتہائی پسماندہ ملک یمن میں بادشاہت کا قدیم اور فرسودہ نظام ختم ہو گیا اور جمہوریت کی داغ بیل ڈال دی گئی، لیکن یہ اقدام خود مصر کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

سینا پر اسرائیلی قبضہ

صدر ناصر یمن کی فوجی امداد کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اب مصر دنیائے عرب کا سب سے طاقتور ملک بن گیا ہے اور یہ کہ وہ اسرائیل کے مقابلے میں روس پر مکمل بھروسہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو انہوں نے طاقت کے مظاہرے کے لیے ہزاروں فوجی یمن بھیج دیے اور دوسری طرف اسرائیل کو دھمکیاں دینا اور مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جو فوج ۱۹۵۶ء سے اسرائیل اور مصر کی سرحد پر تعینات تھی صدر ناصر نے اس کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ آبنائے عقبہ کو جہاز رانی کے لیے بند کر کے اسرائیل کی ناکہ بندی کر دی۔ اسرائیل نے جو جنگ کے لیے پوری طرح تیار تھا اور جس کو امریکہ کی امداد پر بجا طور پر بھروسہ تھا مصر کی کمزوری کا اندازہ کر کے جون ۱۹۶۷ء کے پہلے ہفتہ میں بغیر کسی اعلان جنگ کے اچانک مصر پر حملہ کر دیا۔ اور مصر کا بیشتر ہوائی بیڑہ ایک ہی حملہ میں تباہ کر دیا۔ مصری فوج کا بڑا حصہ یمن میں تھا جسے بروقت بلانا ممکن نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ دن کی مختصر مدت میں اسرائیل نے نہ صرف باقی فلسطین سے مصر اور اردن کو نکال باہر کیا بلکہ شام میں جولان کے پہاڑی علاقے اور مصر میں پورے جزیرہ نما سینا پر بھی

قبضہ کرلیا۔ ہزاروں مصری فوجی قیدی بنا لیے گئے اور روسی اسلحہ اور ٹینک یا تو جنگ میں برباد ہو گئے یا اسرائیلیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ عربوں نے اپنی تاریخ میں اتنی ذلت آمیز شکست شاید کبھی نہ کھائی ہوگی اور اس کے اثرات سے ابھی تک عربوں کو نجات نہیں ملی ہے۔ اسرائیل کے مقابلہ میں اس ذلت آمیز شکست کے بعد صدر ناصر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سعودی عرب اور اُردن سے مفاہمت پیدا کی اور شاہ فیصل سے تصفیہ کے بعد، جس کے تحت مصر نے یمن میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کیا، مصری فوجیں یمن سے واپس بلا لی گئیں۔ مصر کی شکست کی سب سے بڑی وجہ مصری فوج کی نااہلی اور مصری فوجی نظام کے نقائص تھے، لیکن مصری فوج اور اسلحہ کی بڑی تعداد کو یمن بھیجنا بھی شکست کی ایک بڑی وجہ تھی۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے نتیجے میں غزہ (فلسطین) اور جزیرہ نما سینا کا ۴۲ ہزار مربع میل (ایک لاکھ آٹھ ہزار مربع کلومیٹر) کا علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں آ گیا، نہر سویز بند ہوگئی اور مصر جزیرہ نما سینا کے تیل کے چشموں سے محروم ہو گیا۔ صدر ناصر نے شکست کی ذمہ داری تسلیم کرتے ہوئے فوراً استعفیٰ دے دیا، لیکن ایک آمرانہ نظام میں یہ مشکل ہوتی ہے کہ آمر کی جگہ لینے والا آسانی سے نہیں ملتا۔ مصر میں بھی یہی ہوا۔ چونکہ کوئی متبادل رہنما سامنے نہیں آیا اس لیے ۹۔ جون کو استعفیٰ واپس لینے کے لیے قاہرہ میں مظاہرے کیے گئے اور صدر ناصر نے استعفیٰ واپس لے لیا۔ اس طرح صدر ناصر کا اقتدار تو قائم رہا، لیکن ۱۹۶۷ء کی شکست کی وجہ سے مصری فوج کی عزت خاک میں مل گئی۔ لوگ فوجیوں کو دیکھ کر فقرے چست کرتے تھے، جس کی وجہ سے فوجیوں کو عام اوقات میں وردی پہن کر سڑکوں پر نکلنے سے روک دیا گیا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ نے مصر کی معیشت کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ مصر کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ نہر سویز تھی، جس سے مصر کو ہر سال ساڑھے نو کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی تھی۔ نہر کے مشرقی کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہو جانے کے بعد نہر سویز میں جہاز رانی بند ہوگئی۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ مصر کا اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی، نہر سویز کی آمدنی کا بند ہونا بڑا تباہ کُن ثابت ہوتا، لیکن سعودی عرب، کویت اور لیبیا آڑے آئے اور تینوں نے مل کر ساڑھے نو کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد فراہم کر کے نہر سویز کی بندش سے ہونے والے نقصان کی تلافی کر دی۔

جولائی ۱۹۶۸ء میں صدر ناصر نے روس کا دورہ کیا جس کے بعد روس نے مصر کو از سرِ نو مسلح کرنا شروع کیا۔ روس نے پہلی مرتبہ زمین سے ہوا میں چلائے جانے والے کم فاصلے کے میزائل مصر کو دیے۔ ڈیڑھ سو آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے جٹ طیارے اور پانچ سو ٹینک دینے کا وعدہ کیا۔ تین ہزار فوجی مشیر اور فنی ماہر بھی فراہم کیے۔ عرب ملکوں میں سعودی عرب، کویت اور لیبیا نے وسیع پیمانے پر مالی امداد فراہم کی۔ روس اور عرب ملکوں کی اس امداد کے بعد مصر کے فوجی نقصانات کی ایک حد تک تلافی بھی ہوگئی اور اقتصادی حالت بھی سنبھل گئی۔ ۱۹۶۸ء کے آخر سے اسوان کے بلند بند نے بھی کام شروع کر دیا۔

صدر ناصر نے اگرچہ ۱۹۶۸ء میں ایک استصواب رائے کے ذریعہ عوام کا اعتماد بھی حاصل کرلیا تھا، لیکن ان کی پالیسی کے خلاف اندرونی بے چینی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، لیکن اس کا اظہار استبدادی نظام کی وجہ سے کھل کر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن جنوری ۱۹۶۸ء میں طلبہ نے پولیس راج کے خلاف جو مظاہرہ کیا تھا اس سے اس بے چینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ روس کی پالیسی سے عوام غیر مطمئن تھے لیکن اب صدر ناصر بھی اس کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ روس صرف دفاع کی حد تک اسلحہ دینا چاہتا تھا اور وہ مصر کو اتنا مضبوط نہیں بنانا چاہتا تھا کہ اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ اس کے برخلاف امریکہ نے اسرائیل کو اتنا مسلح کر دیا تھا کہ وہ اپنے پڑوس کے تمام عرب ملکوں کے خلاف بہ یک وقت جارحانہ کارروائی کرسکتا تھا۔ صدر ناصر کو اب پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ روس فوجی اور اقتصادی امداد کے ذریعہ مصر میں کمیونزم کو فروغ دینا چاہتا ہے اور فلسطین سے متعلق عربوں کی پالیسی کو اپنے مفاد کے تحت تشکیل دینا چاہتا تھا۔ آخر کار صدر ناصر نے طے کیا کہ اسلحہ اور اقتصادیات کے معاملے میں صرف ایک ملک پر انحصار ملک کے لیے مفید نہیں ہوسکتا اور ۱۹۶۹ء میں انہوں نے اس مقصد کے لیے مغرب کی طرف خصوصاً فرانس کی طرف رُخ کیا، لیکن صدر ناصر کی یہ پالیسی ابھی واضح شکل اختیار نہ کرسکی تھی کہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کو صدر ناصر کا حرکتِ قلب بند ہوجانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔

عرب قوم پرستی اور سوشلزم

صدر ناصر کے دَور پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس جگہ ان کی اس

پالیسی پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو انہوں نے مصر میں اسلامی تحریک اور خصوصاً اخوان المسلمون سے متعلق اختیار کی تھی۔ جیسا کہ اس باب کے شروع میں بیان کیا جاچکا ہے موجودہ صدی کا نصف اوّل مصر میں وطن پرستی یعنی وطن پر مبنی قوم پرستی کا دَور تھا، لیکن ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد مصر میں جس دَور کا آغاز ہوا وہ عرب قوم پرستی اور سوشلزم کا دَور ہے۔ وطن پرستی حصول آزادی کا ایک ذریعہ تھی اور اب جب مصر آزاد ہو چکا تو اس نظریہ کی قوت محرکہ ختم ہوگئی۔ مصری اب یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ ایک وسیع تر عرب دنیا کے رُکن ہیں اور ان کے بہت سے مسائل کا حل عرب دنیا کے اتحاد سے وابستہ ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دنیا اب بین الاقوامیت کی طرف جارہی ہے اور وطنی حد بندیاں کمزور پڑ رہی ہیں۔ چنانچہ اس عالمگیر رجحان سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے سوشلزم کا مسلک اختیار کیا۔ سوشلزم کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وطن پرستی اور سرمایہ دارانہ معیشت کے نظام سے مصری عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا اور مصر کے وطن پرست چونکہ سیکولرازم کے حامی تھے اس لیے انہوں نے فطری طور پر اپنے مسائل کا حل اسلام سے باہر تلاش کیا جو سوشلزم ہی ہوسکتا تھا کیونکہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں سکہ رائج الوقت تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ فلسطین کے مسئلہ کی وجہ سے عربوں کی براہ راست مغرب سے کشمکش شروع ہوگئی تھی اس لیے عرب یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ سوشلزم اختیار کر کے دنیا کے ایک بڑے بلاک سے جو مغرب کا حریف ہے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مدد حاصل کرسکیں گے۔ وطن پرستی کا جذبہ آج بھی مصریوں میں موجود ہے، آج بھی جدید تعلیم یافتہ مصریوں کی ایک بڑی تعداد آلِ فرعون ہونے پر فخر کرتی ہے، لیکن اب یہ وطن پرستی ان کے لیے پہلے کی طرح قوت محرکہ نہیں رہی۔ اب اصل قوت محرکہ عرب قوم پرستی اور سوشلزم ہے۔ اگرچہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں بہت سے دوسرے مسلم ملکوں کی طرح مصر میں بھی اسلام کو سرکاری حیثیت دی گئی تھی لیکن یہ صرف رسمی چیز تھی۔ ناصر کے دور میں مصری حکومت کی طاقت کا سرچشمہ اسلام نہیں بلکہ عرب قومیت اور سوشلزم تھے۔ صدر ناصر جدید عربی سوسائٹی اور اس کے حقوق کے متعلق وہ نقطۂ نگاہ رکھتے تھے جو اسلامی شریعت اور خدا کی مقرر کردہ حدود کا پابند نہیں تھا بلکہ اس کا تعین مغربی سوسائٹی اور جدید فکر کی

بنیاد پر کیا گیا تھا۔''۳۱۔ مئی ۱۹۶۲ء کو صدر ناصر نے جس قومی منشور ''المیثاق الوطنی'' کا اعلان کیا تھا اگر اس منشور سے عرب اور مصر کا لفظ نکال دیا جائے جو بار بار آتا ہے اور جس کی وجہ سے اس ماحول اور اس معاشرے کا پتہ چل جاتا ہے جس کے لیے یہ منشور مرتب کیا گیا تھا اور اس کو کسی سیکولر اور سوشلسٹ اسٹیٹ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا اس لیے کہ یہ سب حکومتیں عقیدہ کی آزادی اور انسان اور تہذیب انسانی پر مذاہب سے پیدا ہونے والی روحانی اقدار کے اثر و تسلط کی معترف ہیں۔''[1]

''اس انقلاب کے قائدین نے مصری سوسائٹی اور مصری فکر و دماغ کی مکمل تبدیلی اور تشکیل جدید کے لیے بہت مثبت، معین اور ٹھوس قدم اٹھائے جو دراصل پوری عرب قوم کی ذہنیت تبدیل کرنے کا ایک ابتدائی مرحلہ تھا۔ انہوں نے عربی قومیت پر ایک مذہب اور عقیدہ کی طرح زور دیا۔ انہوں نے العزت للعرب کے نعرے لگائے، ملحدین کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اہل قلم افراد اور اخبار نویسوں کو اس معاملے میں بالکل چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جو چاہیں لکھیں، دین اور اس کے شعائر کا کھلم کھلا مضحکہ اڑائیں، دین کی بے حرمتی کریں اور سوسائٹی میں بے حیائی، بے راہ روی اور فسق و فجور پھیلائیں۔ پریس کو قومیانے سے ان چیزوں میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحافت میں عریاں اور فحش تصویروں، گندے اور جنسی افسانوں، جرائم اور جنسی جذبہ کی محرک خبروں اور واقعات کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس کا در پردہ مقصد یہ تھا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی اور عقلیت کو بالکلیہ تبدیل کر دیا جائے اور اس پر مادی رنگ اور اشتراکی طرز پوری طرح غالب آ جائے۔''[2]

ناصر اور اخوان المسلمون

اس انقلاب کا عرب دنیا پر گہرا اثر پڑا۔[3] لیکن مغربی افکار کے اعلیٰ طبقے پر گہرے

(۱) ابوالحسن علی ندوی: مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۲۸

(۲) ایضاً ص ۱۲۹۔ ۱۳۰

(۳) سوشلزم پر مبنی اس مصری انقلاب کا جو اثر سوڈان پر پڑا اس کو ممتاز سوڈانی رہنما سید میرغنی نے مکہ کے روزنامہ الندوہ میں ۳۱۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ایک مضمون میں بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ مضمون کے اردو ترجمہ کے لیے دیکھئے ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور مئی ۱۹۶۲ء واضح رہے کہ میرغنی سوڈان کی بااثر مذہبی جماعت الختمیہ کے پیشوا تھے اور اشقہ پارٹی کے سربراہ تھے جو مصر اور سوڈان کے اتحاد کی علمبردار اور جمال ناصر کی پُرجوش حامی تھی۔

اثرات کے باوجود یہ نیا معاشرہ اور نیا نظام اہل مصر کے لیے قبول کرنا آسان نہ تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہاں اخوان المسلمون کی زبردست اسلامی تحریک عوام اور نوجوانوں میں کافی جگہ بنا چکی تھی۔ انقلاب ۱۹۵۲ء کے موقع پر وفد پارٹی اور اخوان المسلمون صرف دو جماعتیں بااثر تھیں۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں وفد اور دوسری جماعتوں کو ختم کر دیا گیا۔ صرف اخوان باقی رہے انہوں نے انقلاب کا پُر جوش خیر مقدم کیا تھا بلکہ ناصر کی ڈائری میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اخوان کے فوجی شعبے کے انچارج میجر محمود پہلے سپاہی تھے جنھوں نے فوج میں آزادی کی رُوح پھونکی اور خفیہ گروہ منظم کیے اور انقلاب کے خطرناک دنوں میں امن و امان قائم رکھنے میں پوری پوری مدد دی۔

اخوان کے اسی تعاون کا نتیجہ تھا کہ فوجی انقلاب کے بعد سے ان پر تمام پابندیاں ہٹالی گئیں اور ان کی جائداد اور املاک واپس کر دی گئی تھیں۔ لیکن اب اخوان کے لیے آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ حکومت نے ان کو صرف ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دی اخوان کے لیے مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا یہ تصور نا قابل قبول تھا۔ اخوان اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اصلاحات کرنا چاہتے تھے اور آئینی حکومت بحال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وفد کے رہنماؤں اور اخوان نے سیاسی جماعتوں کی بحالی اور آئینی حکومت کے قیام کے لیے مہم چلائی اور اس مقصد کے لیے جنرل نجیب کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی جو اخوان کے حلقوں کی ایک محبوب شخصیت تھی لیکن انقلابی کمانڈ کونسل کے دوسرے رہنما جمال عبدالناصر کسی اور ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ اخوان کا نصب العین واضح تھا لیکن ناصر کا مخفی۔ اور جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ناصر کا راستہ آمریت سیکولرزم اور مغربی مادیت کے مراحل سے گزر کر سوشلزم تک جانے والا تھا، اور اخوان کا راستہ جمہوریت کی وادی سے ہو کر احیائے اسلام کے نصب العین تک جاتا تھا۔ جب اخوان نے جنرل نجیب کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی تو جمال ناصر نے ان کو پہلے وزارت عظمیٰ سے پھر صدارت کے عہدے سے الگ کر دیا اور یہ عہدے خود سنبھال لیے۔ جنرل نجیب کی برطرفی [1] سے وہ پل ٹوٹ گیا جو اخوان اور فوجی افسروں کو ملائے ہوئے تھا، اور اب اخوان اور ناصر کے درمیان

(۱) جنرل نجیب نے اپنی سوانح مصر کا مستقبل (egypt's destiny) میں انقلابی کمیٹی کے اختیارات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور یہ شکایت کی تھی کہ ان کو موثر کردار ادا کرنے کی بجائے ایک عضو معطل بنا دیا گیا ہے۔

براہ راست کشمکش شروع ہوگئی۔

حسن الہضیبی

حسن البنا کے بعد اخوان کی قیادت حسن الہضیبی (۱۸۹۱ء تا ۱۹۶۵ء) کے سپرد کی گئی۔ حسن البناء عربی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے، اور ان کی تعلیم بھی قدیم انداز پر ہوئی تھی۔ ہضیبی نے ان کے برخلاف جدید تعلیم حاصل کی تھی، وہ عمر میں بھی حسن البناء سے کئی سال بڑے تھے۔ ہضیبی نے ۱۹۱۵ء میں مصری کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی، اور مارچ ۱۹۲۴ء تک وکالت کی۔ اس کے بعد انہوں نے ۲۷ سال تک جج کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ وہ عدالت عالیہ کے قانونی مشیر بھی رہے۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اخوان المسلمون کی تنظیم کے مرشد عام یعنی سربراہ منتخب ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اخوان ابتلا اور آزمائش کی پہلی منزل سے گزر چکے تھے اور وفد کی نئی حکومت نے ان پر سے پابندیاں اٹھالی تھیں۔

حسن ہضیبی نے اخوان کی قیادت سنبھالنے کے بعد شاہ فاروق، ناصر، دونوں کے عہد میں پوری کوشش کی کہ حکومت سے اخوان کا کوئی تصادم نہ ہو، لیکن اخوان اور انقلابی فوجیوں کی بڑی تعداد کے درمیان جو نظریاتی اختلافات تھے وہ بڑھتے چلے گئے۔ حسن ہضیبی نے اپنے ایک بیان میں جو انقلاب کے فوراً بعد جاری کیا گیا تھا اس کی وضاحت کی تھی کہ انقلاب کے بعد اخوان کی منزل مقصود کیا ہے۔ اس بیان میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ اس پر زور دیا تھا کہ مصر میں جلد از جلد ایسی مجلس آئین ساز منتخب کی جائے جو ملت اسلامیہ کے اساسی عقاید پر مبنی دستور تیار کرے۔ ہضیبی کے اس بیان سے فوجی حکام بالعموم اور جمال ناصر بالخصوص اخوان سے ناراض ہوگئے۔ اس کے بعد متعدد ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے یہ خلیج اور کشادہ ہوگئی۔ حکومت نے اخوان کو سرکاری جماعت نیشنل ریلی میں ضم کرنا چاہا تو اخوان نے خود کو ایک دینی جماعت کہہ کر اس میں ضم ہونے سے انکار کر دیا۔ اخوان کو تین وزارتیں بھی پیش کی گئیں لیکن انہوں نے یہ پیش کش بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم حکومت کے بے لوث خیر خواہ ہیں۔ اگر حکومت اچھا کام کرے گی تو ہم تائید کریں گے لیکن اگر غلط کرے گی تو ٹوکیں گے۔

جب اخوان کسی طرح قابو میں نہیں آئے تو جمال ناصر نے جو جنرل نجیب کے دَور میں رئیس مجلس الوزراء تھے، عوام کے خلاف الزام تراشیاں شروع کر دیں اور ان پر دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا الزام لگایا۔ حسن ہضیبی نے ناصر کے نام ایک خط میں ان تمام الزاموں کی تردید کی اور یقین دلاتے ہوئے ناصر کو لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ رات دن بغیر کسی محافظ کے تنہا کسی بھی جگہ اطمینان سے آ جا سکتے ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی اخوان آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے جس کا اندیشہ موہوم آپ کو لاحق ہے۔

ہضیبی نے خط میں یہ بھی لکھا کہ "آپ پر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آزادی چھن جانے اور زبان بند ہو جانے کی وجہ سے قوم کا دم گھٹ گیا ہے، اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انہیں روشن دلائل کے ساتھ واضح طور پر بتا دیا جائے کہ جس راستے پر ہم گامزن ہیں وہ قوم کی سلامتی اور بھلائی کا راستہ ہے یا جس پر آپ بلاتے ہیں وہ صحیح راستہ ہے۔ یہ بات واضح ہو جائے تو ساری قوم مطمئن ہو سکتی ہے۔"

یہ تھے وہ حالات جن کی وجہ سے اخوان اور حکومت میں تصادم ناگزیر ہو گیا۔ ۱۳۔ جنوری ۱۹۵۴ء کو اچانک اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا، اور ہضیبی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اخوان کی سرگرمیاں اس پابندی کے بعد بھی ختم نہیں ہوئیں۔ ۷۔ جولائی ۱۹۵۴ء کو مصری حکومت نے جب انگریزوں سے معاہدہ کیا تو اخوان نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اس معاہدہ کو برطانیہ کے ہاتھ مصر کو فروخت کر دینے کے مترادف قرار دیا۔ اس معاہدے کی مخالفت کرنے کی وجہ سے حکومت نے روزنامہ اخوان المسلمون کو ۱۰۔ ستمبر ۱۹۵۴ء کو بند کر دیا۔ ۲۶۔ اکتوبر کو ناصر کے اُوپر قاتلانہ حملہ ہوا، جس نے ناصر کو اخوان کے خلاف کاروائی کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اخوان بار بار تردید کرتے رہے لیکن ناصر نے اس حملہ کا ذمہ دار اخوان ہی کو قرار دیا اور اس کی آڑ لے کر اخوانی کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ مصر کے مشہور اخبار "المصری" کے ایڈیٹر احمد ابوالفتح کا بیان ہے کہ چند ہفتوں کے اندر اندر گرفتار ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان میں سید قطب اور عبدالقادر عودہ جیسے مفکر اور ادیب بھی

شامل تھے۔ ۷۔نومبر ۱۹۵۴ء کو فوجی عدالت [(۱)] نے چھ ممتاز رہنماؤں کو صفائی کی سہولتیں فراہم کیے بغیر سزائے موت دے دی۔ حسن ہضیبی کو بھی سزائے موت دی گئی، لیکن بڑھاپے کی وجہ سے یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔

مارچ ۱۹۶۴ء میں جب مصر میں ہنگامی حالت کا خاتمہ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، ان میں اخوان بھی تھے۔ لیکن ایک سال بعد ہی اخوان پھر ابتلا اور آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں پکڑ دھکڑ کی ایک نئی مہم شروع ہو گئی جس کے دوران سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چھ ہزار اخوان گرفتار کر لیے گئے۔ غیر سرکاری اطلاع کے مطابق یہ تعداد بیس ہزار سے پچاس ہزار تک بیان کی گئی ہے جس میں سات سے آٹھ سو تک عورتیں بھی شامل تھیں۔ ناصر نے رُوس میں کہا کہ اخوان نے میرے قتل کی سازش کی ہے، میں نے پہلے ان کو معاف کر دیا تھا لیکن اب معاف نہیں کروں گا۔ حسن ہضیبی بھی دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور ان کو تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی، جس کی تاب نہ لا کر وہ ۸۔نومبر ۱۹۶۵ء کو شہید ہو گئے۔

---

(۱) جن رہنماؤں کو سزائے موت دی گئی، ان کے نام ہیں۔ (۱) عبدالقادر عودہ۔ (۲) محمد فرغلی۔ (۳) یوسف طلعت۔ (۴) ابراہیم طیب۔ (۵) ہنداوی دویر۔ (۶) محمد عبداللطیف۔ ان میں عبدالقادر عودہ پر یہ الزام تھا کہ ان کے ذریعہ جنرل نجیب اور اخوان کے درمیان رابطہ قائم تھا اور انہوں نے عوامی عدالت اور اس کے فرامین پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی تھی۔ جب انہیں موت کی سزا کا حکم سنایا گیا تو مسکرا کر بولے ''شکریہ''۔ وہ اس وقت بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ پھانسی پانے سے پہلے انہوں نے بلند آواز سے کہا میرا خون عنقریب ایک ظالم نظام کے لیے معیبت بن جائے گا، وہ اس تیزی سے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھے کہ دونوں جلاد پیچھے رہ گئے۔ شیخ محمد فرغلی ایک عابد و زاہد اور مجاہد انسان تھے۔ سویز کی جھڑپوں میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف بڑی شجاعت کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے پھانسی پانے سے پہلے مسکراتے ہوئے کہا کہ میری سعادت مندی کا کیا کہنا میں اپنے اللہ سے ملنے جا رہا ہوں۔ یوسف طلعت اور ابراہیم طیب اخوان کے مرکزی دفتر کے کارکن تھے۔ ان میں یوسف طلعت نے تختہ دار چڑھنے سے پہلے کہا، اے اللہ ان لوگوں نے میرے ساتھ برائی کی انہیں معاف کر دے''۔ ابراہیم طیب ایڈوکیٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ شہید کی موت مر رہا ہوں۔'' محمود عبداللطیف پر ناصر پر گولی چلانے کا الزام تھا۔ وہ محکمہ داخلہ میں ملازم تھے۔ اور جنگ فلسطین میں داد شجاعت دے چکے تھے انہوں نے بھی آخری وقت اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے شہادت سے سرفراز کیا۔ ان مظلوم شہیدوں میں سے صرف ہنداوی دویر نے یہ کہہ کر کمزوری کا اظہار کیا کہ میں ناصر سے معافی کا انتظار کر رہا تھا۔ ان پر محمود عبداللطیف کو پستول مہیا کرنے کا الزام تھا وہ قاہرہ کے ایک وکیل تھے۔

سید قطب شہید

اس مرتبہ جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے۔ان میں سب سے ممتاز شخصیت سید قطب (۱۹۰۶ء تا ۱۹۶۶ء) کی تھی جو نہ صرف اخوان کے حلقے کے بلکہ اپنے زمانے میں مصر کے سب سے بڑے اسلامی مفکر اور ادیب تھے۔انہوں نے جامعہ ازہر اور مصری یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔اس کے بعد وہ مصری یونیورسٹی ہی میں پروفیسر ہو گئے، پھر انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے۔اسی زمانے میں وہ وزارت تعلیم کی طرف سے جدید طریقہ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے لیے امریکہ گئے جہاں ان کا دو سال قیام رہا۔امریکہ میں قیام کا یہ زمانہ سید قطب کے ذہنی انقلاب کا زمانہ ثابت ہوا۔وہ مغرب کے مادہ پرست نظام سے متنفر ہو گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانیت کی اصل فلاح صرف اسلام میں ہے۔چنانچہ امریکہ سے واپسی پر وہ اخوان المسلمون سے وابستہ ہو گئے۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں فوجی انقلاب آیا اور اخوان کا پہلا دور ابتلا ختم ہوا تو سید قطب جماعت کے شعبہ توسیع دعوت کے رئیس مقرر ہوئے۔اسلام سے متعلق کتابیں شائع کرنا اور ان کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانے کا انتظام کرنا سید قطب ہی کے سپرد تھا۔وہ ۱۹۵۴ء میں مختصر مدت کے لیے روزنامہ اخوان المسلمون کے مدیر بھی مقرر ہوئے لیکن یہ اخبار دو ماہ بعد ہی اینگلو مصری معاہدے کی مخالفت کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔اخوان کے دوسرے دور ابتلاء میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سید قطب بھی تھے جن کو ۱۳۔جولائی ۱۹۵۵ء کو عوامی عدالت کی طرف سے ۱۵ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ناصر سید قطب کی علمی عظمت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے ایک سال بعد ان کو اس شرط پر رہا کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ معافی مانگ لیں۔لیکن سید قطب نے جنہوں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا، معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔اس کے بعد ان کو وزارت تعلیم کی پیش کش کی گئی لیکن سید قطب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ وزارت کا قبول کرنا اس وقت تک لا حاصل ہے۔جب تک مصر کے پورے نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اختیار نہ ہو۔ظاہر ہے کہ ناصر اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔نتیجہ یہ نکلا کہ سید قطب کو قید سے رہائی نہ مل سکی۔مارچ ۱۹۶۴ء میں جب ہنگامی حالت کے خاتمہ پر سیاسی قیدی رہا کیے گئے، تو سید قطب بھی رہا ہو گئے۔لیکن ایک سال بعد جب اخوان کے خلاف پھر مہم شروع ہوئی جو

اخوان کا تیسرا دورِ ابتلاء و آزمائش تھا تو سید قطب پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اس مرتبہ ان کے بھائی محمد قطب اور دو بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب بھی گرفتار کر لی گئیں۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۶۶ء کو حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں سید قطب اور ان کے ساتھیوں پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا۔ ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل پیروی کرنے والا نہیں تھا۔ باہر کے لوگوں نے پیروی کرنی چاہی تو ان کو اجازت نہیں ملی۔ بالآخر ۲۵۔ اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب کو حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔

سید قطب تقریباً بائیس کتابوں کے مصنف تھے ان میں العدالۃ الاجتماعیہ ان کی سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس کے فارسی، ترکی، انڈونیشی اور انگریزی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں، اردو میں اس کا ترجمہ ''اسلام میں عدل اجتماعی'' کے نام سے ہوا ہے۔ اُن کی دوسری اہم کتاب ''السلام العالمی والاسلام'' (عالمی امن اور اسلام) ہے۔ مراکش کے مشہور عالم اور قومی رہنما علال الفاسی جو خود بھی ایک ممتاز ادیب اور مصنف ہیں اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ کاش یہ میری تصنیف ہوتی۔ سید قطب کی تیسری اہم کتاب ''معالم فی الطریق'' ہے جس کا اُردو میں ''جادہ و منزل'' کے نام سے ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں سید قطب نے بتایا ہے کہ اسلام کا ایک مستقل راستہ اور طریق کار ہے۔ انہوں نے اس میں عربی قوم پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ ''اسلامی تہذیب کبھی بھی محض عربی تہذیب یا قومی تہذیب نہ تھی وہ ہمیشہ اسلامی اور نظریاتی تہذیب تھی'' سید قطب کو اسی کتاب کی وجہ سے سزائے موت ملی اور اُن پر الزام لگایا گیا کہ یہ کتاب مولانا مودودی سے متاثر ہو کر لکھی گئی اور سید قطب نے عدالت میں اعتراف کیا کہ ان کی دعوت اور مولانا مودودی کی دعوت میں کوئی فرق نہیں۔''

سید قطب نے فی ظلال القرآن کے نام سے آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر بھی لکھی۔ وہ افسانہ نگار، شاعر، ادبی نقاد بھی تھے۔ ان کو پھانسی دے کر مصری حکومت نے نہ صرف مصر کو بلکہ اسلامی دنیا کو تخلیقی صلاحیت رکھنے والے ایک مفکر سے محروم کر دیا۔ مصر کے فوجی انقلاب کو ایک پُر امن انقلاب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہم ناصر کی حکومت کے اخوان المسلمون پر مظالم کا حال پڑھتے ہیں تو یہ دعویٰ کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک اسلامی تحریک پر شاید اتنی شدید ضرب کسی نے نہیں لگائی جتنی جمال ناصر نے مصر میں لگائی اور نہ کبھی کسی دَور میں اتنے بڑے اہل قلم اور مفکر

موت کے گھاٹ اتارے گئے اور خواتین کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۶۵ء کی مہم میں جن خواتین کونشانہ ستم بنایا گیا اور گرفتار کیا گیا ان میں زینب الغزالی، حسن الہضیبی کی اہلیہ، ان کی صاحبزادی اور بہو اور سید قطب شہید کی دو بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب شامل ہیں۔ اخوان کے رسالہ الدعوۃ نے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جو اعداد وشمار شائع کیے اس کے مطابق ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کے دوران اسٹھ ہزار اخوان کارکن گرفتار کیے گئے، جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں سب شامل تھیں۔ ان میں صرف ایک ہزار پانچ سو چالیس افراد پر مقدمے چلائے گئے۔ باقی لوگ بلا مقدمہ بند رہے۔

ستمبر ۱۹۶۸ء میں سوشلسٹ یونین کے ایک اجتماع میں صدر ناصر نے بتایا کہ ۱۹۶۵ء میں جو چھ ہزار اخوان گرفتار کیے گئے تھے، ان میں سے آٹھ سو ابھی تک قید ہیں۔ یہ لوگ سخت کٹر قسم (hard core) کے ہیں۔ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں ان کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ ان کا واحد طریقہ عمل تشدد ہے۔ اخوان کو اسلحہ کے استعمال وتخریبی کاروائی اور قتل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جب ہنگامی حالت کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا تھا، تو یہ تمام لوگ رہا ہو جاتے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ وہ پھر سے اپنے مسلح خفیہ حلقے بنالیں گے۔ اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیں گے۔ اس موقع پر صدر ناصر نے اعتراف کیا کہ ان لوگوں کو بغیر مقدمے کے نظر بند رکھا گیا ہے۔ صدر ناصر نے اپنے اس بیان میں کمیونسٹوں کے انداز میں اخوان کے ان رہنماؤں پر جو مغربی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں رہتے ہیں امریکی امداد کا الزام بھی لگایا، لیکن امریکہ یا مغرب کے لیے اخوان کتنے مفید ثابت ہوسکتے ہیں، اس کا اندازہ ہر شخص برطانوی اخبار اکونومسٹ کے اس تبصرے سے کرسکتا ہے جو پیچھے گذر چکا ہے۔

ہم نے اخوان اور صدر ناصر کی کشمکش کو کافی تفصیل سے بیان کردیا ہے۔ اخوان کے نظریات، جنگ فلسطین میں ان کا پرجوش حصہ، نہر سویز کی چھاپہ مار جنگ میں ان کے کارنامے اور برطانوی مصری معاہدے کی ان کی طرف سے مخالفت، ایسی مثالیں ہیں جن کی موجودگی میں اخوان پر مغربی ملکوں کا آلہ کار ہونے کا الزام مضحکہ انگیز نظر آتا ہے۔ تشدد اور قوت کے ذریعہ حکومت کا تختہ پلٹنے کا الزام بھی بے وزن نظر آتا ہے۔ اخوان رہنماؤں کی طرف سے اس کی بار بار تردید کی گئی اور یہ الزام کبھی بھی کھلی عدالت میں ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اخوان رہنماؤں کو صفائی کی آزادانہ سہولت سے محروم کرنا حکومت کے موقف کی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اخوان اور مصر کے فوجی حکام کے درمیان شدید قسم کا نظریاتی اختلاف پایا جاتا تھا۔ اخوان جمہوری اور دستوری حکومت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ پر بضد تھے۔ اور فوجی حکومت چونکہ ہر فوجی حکومت کی طرح اقتدار سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی اور اپنے نظریات کو بزور ٹھونسنا چاہتی تھی، اس لیے دونوں طاقتوں میں تصادم ہوگیا۔ حکومت کے پاس طاقت تھی۔ اس لیے اس نے اخوان کو کچل دیا۔ اخوان نے ہوسکتا ہے غلطیاں کی ہوں لیکن وہ جمہوریت اور اسلام کے علمبردار کی حیثیت ہی سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اہل پاکستان کے لیے خاص طور پر اخوان المسلمون کا نام اس لیے بھی احترام کا باعث ہے کہ مصر کے پرستانہ ماحول میں اخوان المسلمون واحد جماعت تھی جس نے پاکستان بننے سے پہلے تقسیم ہند کی تائید کی تھی اور قائداعظم جب لندن جاتے ہوئے قاہرہ پہنچے تھے تو اخوان رضا کاروں نے ان کا پُرجوش خیر مقدم کر کے اتحاد اسلامی کا عملی ثبوت دیا تھا۔

عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں میں صدر ناصر کے حامی اخوان پر ان مظالم کی عرصہ تک پردہ پوشی کرتے رہے، لیکن جب جمال ناصر کے انتقال کے بعد مصر میں تحریر اور تقریر کی آزادی بحال ہوئی تو ناصر کے دَور کے یہ تاریک گوشے پوری روشنی کے ساتھ دنیا کے سامنے آگئے اور دستاویزی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ناصر کے دَور میں اخوان اور دوسرے مخالف لوگوں پر جو مظالم کیے گئے وہ ان سے زیادہ ہولناک تھے جتنا بیان کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ ان مظالم میں ہر اسلامی ملک کی طرح مصر میں بھی سوشلسٹ اور کمیونسٹ عناصر کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ ایک مصری جج کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے جاسوسی کے لیے جو سسٹم نافذ کر رکھا تھا اس کی مثال کمیونسٹ ملکوں کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ (1) اسی طرح ایک مصری صحافی لکھتا ہے کہ: ''عبدالناصر کے دور میں جب ہم گھروں سے نکلتے تھے تو ہمیں اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ہم گھر واپس جاسکیں گے۔'' ان مظالم میں نائب صدر علی صبری، وزیر داخلہ شعراوی جمعہ جو خفیہ پولیس کا سربراہ بھی تھا۔ اور وزیر جنگ محمد فوزی کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ علی صبری نے سوشلسٹ یونین کے اندر ایک خفیہ تنظیم قائم کر رکھی تھی جس کا نگران وزیر مملکت سامی شرف تھا اور

---

(1) تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، ستمبر، اکتوبر 1971ء، مضمون خلیل احمد حامدی۔

صرف قاہرہ میں اس کے ارکان کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ شعراوی جمعہ تشدد کا امام اور فیلسوف کہلاتا تھا۔ خفیہ پولیس نے آج تک تعذیب کے فن میں جو جدید ترین اختراعات کی ہیں یہ ان سب سے آشنا تھا بلکہ فن تعذیب میں کئی ایجادوں کا سہرا اس کے سر ہے۔ یہ نظریہ اسی کی ایجاد ہے کہ اگر ملزم حسب منشا بیان دینے سے انکار کرے تو جیل کے اندر اس کے سامنے اس کی بیٹیوں اور بہنوں کو پولیس کے کتوں کے آگے ڈال دیا جائے۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینا، زرعی اور صنعتی اصلاحات اور مغرب کی سامراجی قوتوں کے مقابلہ میں جرأت مندانہ اقدامات صدر ناصر کے ایسے کام ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کے روشن کارناموں کو ان کے استبدادی مزاج اور اخوان اور مخالف عناصر پر ہولناک مظالم نے داغدار کر دیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں صدر ناصر کا نام اسلامی تحریک کو کچلنے والوں، اسلامی اقدار اور پیغام کو دبانے والوں اور غیر اسلامی افکار کو فروغ دینے والوں میں سرفہرست ہوگا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کے دَور میں ہوا جس نے مصر سے باہر افریقہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے قابل قدر کوششیں بھی کیں۔ ناصر کی طبیعت کا یہ تضاد ظاہر کرتا ہے کہ اسلام سے زیادہ ان کو اپنا اقتدار عزیز تھا۔ تاریخ میں ایسی ہی ایک مثال ہم کو حجاج بن یوسف کی ملتی ہے جس کے اسلامی کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا جن کی وجہ سے بہت سے سادہ لوح علماء اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ لیکن دنیا اس کو ہمیشہ ایک بدترین جابر اور ظالم کے نام سے یاد رکھے گی۔[2]

---

(۱) ایضاً نیز ترجمان القرآن اگست، ستمبر ۱۹۷۵ء اور دسمبر ۱۹۷۶ء

(۲) جو لوگ صدر ناصر کے دور کے مظالم کی تفصیلات پڑھنا چاہتے ہیں وہ ذیل کی کتابیں ملاحظہ کریں جو صدر ناصر کی وفات کے بعد مصر سے شائع ہوئیں اور ان لوگوں کے خودنوشت حالات پر مشتمل ہیں جو ان مظالم کا شکار ہوئے۔ ان میں پہلی کتاب کا اُردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے۔

۱۔ احمد رائف: البوابہ السودا۔ (سیاہ دروازہ) ۲۔ کمال فرمادی: یومیات سجین (قیدی کا روزنامچہ) ۳۔ علی جرشہ: سنوات فی السجن (جیل کے چند سال) علی جرشہ مصری کونسل آف اسٹیٹ کے رُکن تھے اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک قید رہے۔ ۴۔ الصامتون یتکلمون (خاموش رہنے والے مہرِ سکوت توڑتے ہیں) اس کتاب میں کئی لوگوں نے جن میں ناصر کے دَور کے دو وزیر کمال الدین حسین اور عبداللطیف بغدادی بھی شامل ہیں مظالم کی ہولناک داستان بیان کی ہے۔ ۵۔ سنوات عصیبہ (مصیبت کے سال) یہ کتاب مصر کے سابق اٹارنی جنرل عبدالسلام کی لکھی ہوئی ہے۔ (ترجمان القرآن)

انور سادات کا دور

جمال ناصر کے انتقال کے بعد مصر کے نائب صدر انور السادات (پیدائش ۱۹۱۸ء) مصر کے قائم مقام صدر مقرر کیے گئے، اس کے بعد قومی اسمبلی نے ان کو صدر منتخب کرلیا اور پھر استصواب رائے عامہ کے ذریعہ اس انتخاب کی توثیق کی گئی۔ انور سادات صدر ناصر کے قریبی ساتھیوں میں تھے اور ۱۹۵۲ء کے انقلاب میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ انور سادات کو اقتدار میں آئے ہوئے اس سال دس سال ہوجائیں گے۔ اس مختصر مدت میں مصر نے داخلی اور خارجی محاذوں پر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ان کے تدبر کا واضح ثبوت ہیں۔

داخلی محاذ پر ان کا سب سے بڑا کارنامہ عہد ناصر کی دہشت گردی اور ظلم و تشدد کا خاتمہ ہے۔ انور سادات نے پولیس راج ختم کرکے قانون کی بالادستی قائم کی۔ قیمتوں میں کمی کی اور ملکی اور غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرکے اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کی۔ انہوں نے خفیہ تنظیم کے خلاف آواز بلند کی اور وہ تمام کاغذات اور ٹیپ سرعام نذر آتش کردیے جن میں ہر شخص کی عزت پر حملے کیے گئے تھے اور جو مخالفوں پر ظلم و تشدد کی بنیاد تھے۔ مئی ۱۹۷۱ء میں سادات نے نائب صدر علی صبری، وزیر جنگ محمد فوزی اور وزیر داخلہ شعراوی جمعہ کو جو ناصر کے دور میں دہشت گردی کے ذمہ دار تھے عہدوں سے الگ کرکے جیل میں ڈال دیا۔ اس کے بعد انور سادات نے اخوان المسلمون کے کارکنوں اور رہنماؤں کو اور ان دوسرے لوگوں کو بھی بتدریج قید خانوں سے رہا کردیا جو حکومت کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔

جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے تو شروع میں انور سادات نے مئی ۱۹۷۱ء میں روس سے دوستی کا پندرہ سالہ معاہدہ کیا جس کے تحت روس نے وسیع پیمانے پر مصر کو اسلحہ اور اقتصادی امداد فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ لیکن روس کے منافقانہ طرز عمل نے انور سادات کو جلد ہی روس سے بیزار کردیا۔ اب انہوں نے امریکہ سے مفاہمت کرلی اور ۱۹۷۲ء میں ان بیس ہزار روسی مشیروں کو جو مصر میں موجود تھے اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے، روس واپس کردیا۔

اس کے بعد صدر سادات نے اسرائیل کی طرف توجہ کی۔ نہر سویز کو مصر کی معیشت میں بنیادی اہمیت حاصل تھی، لیکن یہ نہر ۱۹۶۷ء سے بند پڑی ہوئی تھی۔ آمدنی کے اس ذریعہ سے محروم

ہو جانے کی وجہ سے مصر کو سعودی عرب، کویت اور لیبیا کی اقتصادی امداد پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے صدر سادات نے یہ پیش کش کی کہ اگر اسرائیلی نہر کے مشرقی ساحل سے واپس ہو جائیں تو نہر سویز کھول دی جائے گی۔ جب اس کوشش میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی تو ٦۔ اکتوبر ١٩٧٣ء کو مصر نے حملہ کر دیا اور مصری فوجوں نے نہر پار کر کے اسرائیلی فوجوں کو مشرقی ساحل سے بیدخل کر دیا۔ اگرچہ ٢٤۔ اکتوبر کو جنگ بندی سے پہلے اسرائیلی فوجوں نے جوابی حملہ کر کے نہر کے جنوب مغربی کنارہ پر تین سو مربع میل پر مشتمل مصری علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا لیکن مذاکرات کی میز پر اسرائیل کو ناکامی ہوئی اور اس کو نہ صرف نو مفتوحہ علاقہ چھوڑنا پڑا بلکہ ستمبر ١٩٧٥ء میں ایک معاہدہ کے تحت اسرائیل جزیرہ نما سینا کے ڈھائی ہزار مربع میل کے علاقہ کو جس میں تیل کے کنویں اور مطلا اور گدی کے درے شامل تھے چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ اس طرح مصر نے ٢٧ سال کی کشمکش کے بعد پہلی مرتبہ اسرائیل کے مقابلے میں ایسی کامیابی حاصل کی جس نے ١٩٦٧ء کی شرمناک شکست کی جزوی طور پر تلافی کر دی۔ انور سادات نے مصر کا قومی دن ٢٣۔ جولائی کی بجائے ٦۔ اکتوبر مقرر کر کے اس شاندار کامیابی کو ایک یادگار دن بنا دیا۔ ١٩٧٥ء میں نہر سویز بھی بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے کھول دی گئی اور اس سے ہونے والی آمدنی نے مصر کو عرب ملکوں کی مالی امداد کی محتاجی سے آزاد کر دیا۔

انور سادات نے اقتدار میں آنے کے بعد ١٩٧٢ء میں شام و مصر کا وفاق بنانے کی ایک بار پھر کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد لیبیا اور مصر کا وفاق بنانے کے لیے ١٩٧٣ء میں ایک معاہدہ کیا۔ لیکن کچھ تو صدر قذافی کی غیر ذمہ دارانہ جذباتی باتوں نے اور کچھ مصریوں کے اس خوف نے جو ان کو ان اخلاقی پابندیوں سے تھا جو صدر قذافی سے اتحاد کی شکل میں قبول کرنی پڑتیں، اس معاہدہ کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور ١٩٧٤ء میں مصر نے اتحاد کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ مصری باشندوں کی زندگی مغربی ثقافت کے زیر اثر اتنی مغرب زدہ ہو چکی ہے کہ ان کو اب اخلاقی پابندیوں سے ہول ہوتا ہے۔ بعد میں اسرائیل کے بارے میں مصر کی پالیسی سے لیبیا کے اختلافات اس حد تک بڑھے کہ جولائی ١٩٧٧ء میں دونوں ملکوں کے درمیان فوجی تصادم بھی ہو گیا اور وہ اسلحہ جو دشمن کے خلاف استعمال ہونا تھا وہ مسلمان ملکوں کی باہمی جنگ میں تباہ ہو گیا۔

اسرائیل سے مفاہمت

روس سے مصر کے تعلقات پہلے ہی خراب ہو چکے تھے اب امریکہ کے طرز عمل کو اپنے حق میں پا کر انور سادات نے امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد امریکہ سے جو سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے ۱۹۷۵ء میں وہ بحال ہو گئے۔ امریکہ نے بھی مصر کو اس کے بعد سے وسیع پیمانے پر مالی اور فوجی امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔ صدر سادات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جنگ کے ذریعہ اسرائیل سے مقبوضہ عرب علاقے خالی کرانا ممکن نہیں۔ روس نے اس ضمن میں مصر اور عربوں کو پہلے ہی مایوس کر دیا تھا جس کے بعد صدر سادات اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف امریکہ کے تعاون ہی سے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اب وہ اسرائیل کو تحفظ کا یقین دلا کر جس سے امریکہ کو دلچسپی ہے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں انہوں نے اس سلسلے میں کئی اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے اسرائیل سے براہِ راست اقدامات شروع کیے۔ خود اسرائیل گئے اور اسرائیلی وزیر اعظم بیگن کو مصر آنے کی دعوت دی اور ستمبر ۱۹۷۸ء میں امریکہ میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر اسرائیل کے ساتھ "مشرق وسطیٰ میں امن کے ایک ڈھانچہ" پر دستخط کیے جس کے تحت اسرائیل نے مقبوضہ علاقہ کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا قبول کر لیا۔ صدر سادات عرب اسرائیل مسئلہ کا ایک جامع حل چاہتے تھے اور وہ شام اور دوسرے عرب ملکوں کو بھی جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملی ہوئی ہیں اس منصوبہ میں شامل کرنا چاہتے تھے، لیکن بیشتر عرب ملکوں نے جو اسرائیل سے کسی صورت میں براہ راست مذاکرات کے حامی نہیں تھے اس منصوبہ کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ صدر سادات کو ۲۶۔ مارچ ۱۹۷۹ء کو واشنگٹن میں اسرائیل کے ساتھ تنہا معاہدہ پر دستخط کرنا پڑے۔ عرب ملکوں نے خصوصاً شام اور عراق نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ ۲۴۔ ستمبر ۱۹۷۸ء کو دمشق میں ایک کانفرنس کے بعد شام الجزائر، جنوبی یمن اور لیبیا نے مصر سے سفارتی تعلقات توڑ لیے اور پھر معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد مارچ ۱۹۷۹ء میں بغداد کانفرنس میں بیشتر عرب ملکوں نے مصر سے تعلقات ختم کر دیے۔ لیبیا نے نہر سویز کھلنے کے بعد ہی سے مصر کی مالی امداد بند کر دی تھی اب سعودی عرب اور کویت نے بھی مالی امداد بند کر دی۔

کیمپ ڈیوڈ میں سمجھوتہ کا جو ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے اس کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ اس

میں فلسطین کے عرب علاقے اور بیت المقدس کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح حل پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصر اور اسرائیل کے درمیان ابھی تک اختلافات ہیں اور ظاہر ہے جب تک یہ مسئلہ عربوں کے لیے اطمینان بخش طریقے سے حل نہیں ہوتا مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن قائم نہیں ہوسکتا۔ بہر حال اسرائیل سے سمجھوتہ کے بعد مصر نے اپنا مسئلہ بڑی حد تک حل کر لیا ہے۔ جزیرہ نما سینا کا بیشتر حصہ اسرائیل نے خالی کر دیا ہے اور سینا کا صدر مقام العریش اب مصر کے پاس ہے اور باقی سینا بھی جلد خالی ہو جائے گا۔ فلسطین میں غزہ کی پٹی بھی مصر کو واپس مل جائے گی۔ یاسر عرفات کا کہنا ہے کہ انور سادات نے سینا کی مٹھی بھر ریت کے لیے بیت المقدس کو فروخت کر دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ سینا مٹھی بھر ریت نہیں ہے۔ ۴۲ ہزار مربع میل پر مشتمل ایک وسیع علاقہ ہے۔ تیل کے چشموں اور معدنی وسائل سے مالا مال علاقہ ہے۔ اس کو لے کر مصر نے نہ صرف اپنی اقتصادیات کو بہتر کر لیا ہے بلکہ مصر کی سرحد کو ایک سو پچیس میل مشرق کی طرف بڑھا کر مصر کی زرخیز وادی کو دفاعی نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ محفوظ کر لیا ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ اسرائیل سے جنگ کی صورت میں عرب ملکوں میں مصر ہی سب سے مضبوط طاقت ہے اور اس کی مضبوطی عربوں کی مضبوطی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں اس تصفیہ کو عام طور پر پسند کیا گیا ہے اور جب وسط ۱۹۷۹ء میں انور سادات نے اسرائیل سے معاہدہ پر استصواب رائے کرایا تو ۹۹ فیصد لوگوں نے معاہدے کے حق میں رائے دی۔

۲۵۔ جنوری ۱۹۸۰ء کو سینا کا دو تہائی حصہ مصر کو مل گیا۔ باقی حصہ ۱۹۸۰ء تک مل جائے گا۔
۱۸۔ فروری ۱۹۸۰ء کو قاہرہ میں اسرائیل کا سفارت خانہ بھی قائم ہو گیا۔

سادات اور اسلام

صدر سادات جب اقتدار میں آئے تو مصر میں ۱۹۶۵ء کا عارضی آئین نافذ تھا۔ اس کے بعد ۱۱۔ ستمبر ۱۹۷۱ء کو مستقل آئین نافذ کر دیا گیا۔ متحدہ عرب جمہوریہ کا نام ترک کر دیا گیا اور مملکت کو ''عرب جمہوریہ مصر'' کا نام دیا گیا۔ آئین کے تحت مصر کا جمہوری اور سوشلسٹ نظام محنت کش طبقہ کے اتحاد پر قائم ہے اور یہ نظام ملک کے تاریخی ورثہ اور روح اسلام سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسلام ریاست کا مذہب ہے۔ عدالت کے بغیر کسی کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی تلاشی لی

جا سکتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے آئین کا یہ پہلو یقیناً صدر ناصر کے زمانہ کے آئین کے مقابلہ میں بہت حوصلہ افزا ہے۔ فروری ۱۹۷۴ء سے اخباروں پر سے سوائے فوجی امور کے سنسر شپ ختم کر دی گئی ہے۔ ۱۹۷۶ء کے آخر میں متحدہ عرب پریس مقتدرہ (اتھارٹی) توڑ دی گئی تا کہ اخبارات آزادانہ طریقہ سے کام کر سکیں۔

صدر سادات ''جمہوری سوشلزم'' کے علمبردار ہیں جس کی رو سے انہوں نے فرد اور معاشرہ دونوں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے جب کہ ان سے پہلے معاشرہ کی خاطر فرد پر ظلم جائز تھا۔ سادات کے الفاظ میں ''جمہوری سوشلزم قزاقی نہیں ہے اور نہ وہ اجارہ داری (custodian ship) ضبطی اور نظر بندی کا نام ہے۔ اب یہ حالات واپس نہیں آ سکتے۔'' صدر ناصر کے زمانہ میں صرف ایک سیاسی جماعت ''سوشلسٹ یونین'' موجود تھی۔ ۱۹۷۷ء میں تین مزید سیاسی پارٹیوں کو جو سوشلزم کی حامی تھیں قائم کرنے کی اجازت ملی۔ اس کے بعد اگلے سال غیر سوشلسٹ جماعتوں کو بھی کام کرنے کی اجازت مل گئی لیکن جب یکم جون ۱۹۷۸ء کو مصری پارلیمنٹ نے صدر سادات کو یہ اختیار دیا کہ وہ داخلی اور خارجی پالیسی پر تنقید کرنے والوں کے خلاف کاروائی کر سکتے ہیں تو دائیں بازو کی جماعتوں نے جن میں نئی وفد پارٹی بھی شامل تھی اپنی جماعتوں کو توڑ دیا۔ ۱۹۷۹ء کے وسط میں جب مصر میں انتخابات ہوئے تو پارلیمنٹ کی ۳۹۲ نشستوں میں سے تین سو تیس نشستوں پر صدر سادات کی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نے قبضہ کر لیا۔ انتیس نشستیں سوشلسٹ لیبر پارٹی نے حاصل کیں۔

اخوان المسلمون کو ابھی تک جماعت قائم کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ لیکن اب اخوان کے کارکنوں اور رہنماؤں پر کوئی پابندی نہیں۔ اخوان کا رسالہ الدعوۃ جولائی ۱۹۷۶ء سے دوبارہ نکلنا شروع ہو گیا ہے اور اتنا مقبول ثابت ہوا کہ پہلا شمارہ پچاس ہزار چھپا اور اسی دن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہر شمارہ پچاسی ہزار چھپ رہا ہے۔ ایک علمی اور دینی رسالے کی ایسی مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اخوان مصر میں آج بھی ایک زندہ قوت ہیں۔

آج کل مصر میں اخوان کے رہنما عمر تلمسانی ہیں۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں جو ہفت روزہ المجتمع (کویت) میں شائع ہوا ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ہم اچھے شہریوں کی طرح رہتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں ذہانت جرأت اور نظم وضبط کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ حکومت ایک

قانونی تنظیم کی حیثیت سے ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ ان دنوں ہم بنیادی طور پر تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں، لیکن حقیقتاً ان کے لیے بھی آزاد ماحول اور کھلی فضا درکار ہے۔ ہم حکومت سے مطالبہ کررہے ہیں کہ وہ ہم پرسے پابندیاں ختم کردے تاکہ ہم آزادی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ کی طرف بلاسکیں۔ ہم انتظامیہ میں حصہ دار بننے کے خواہش مند نہیں ہیں اور ہم کسی ایسی انتظامیہ میں حصہ دار نہیں بن سکتے جو ہماری آئیڈیالوجی کے خلاف ہو، لیکن اگر حکومت قرآنی تعلیمات اور طریقوں کو اختیار کرے اور پھر ہمیں شرکت کی دعوت دے تو ایسی حکومت میں شریک ہونے میں ہمیں کوئی تامل نہ ہوگا۔ (۱)

سوڈان میں مزدوروں کی عالمی تنظیم کے سربراہ حسن البنا شہید کے ایک عزیز جمال البنا ہیں۔ مصر کی بہت سی مزدور تنظیموں نے ان کی اس تنظیم سے الحاق کرلیا ہے۔ (۲)

اخوان کی تنظیم اگرچہ بحال نہیں ہوئی لیکن نوجوانوں نے ''الجماعۃ الاسلامیہ'' کے نام سے یونیورسٹیوں میں حلقے قائم کرلیے ہیں اور یونیورسٹیوں کی طلبہ یونینوں پر ایک بار پھر ان کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اب مصر میں ایک بار پھر اسلامی قانون کے لیے آواز بلند ہورہی ہے۔ مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسن ذہبی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ''مسجد کے ذریعے جو کچھ بنایا جارہا ہے ٹیلیویژن کے ذریعہ اسے ڈھایا جارہا ہے۔'' ۱۹۷۶ء سے عام اجتماعات میں شراب ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اگرچہ کلب، ہوٹل اور سیاحوں کے اڈے مستثنیٰ ہیں۔ (۳) بلاسودی بنک کاری کے لیے بھی راہ ہموار کی جارہی ہے۔ ۱۹۷۷ء سے ''مصری اسلامی فیصل'' بنک کام کررہا ہے جس میں مصر کا حصہ اکاون فیصدی ہے اور جو نفع میں شرکت کے اصول پر کام کرتا ہے۔

تعمیر و ترقی

مصر رقبہ کے لحاظ سے اسلامی دنیا کا..... بڑا ملک ہے اور تین لاکھ ۸۶ ہزار مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے لیکن ملک کا بیشتر حصہ صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہے۔ آباد اور زیر کاشت

(۱) روزنامہ جسارت ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

(۲) روزنامہ جسارت ۲۵۔ ستمبر ۱۹۷۸ء

(۳) ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۷۶ء

علاقہ کا رقبہ صرف ½ ۱۳ ہزار مربع میل ہے۔ مزروعہ زمین دریائے نیل کے دونوں کناروں پر چند میل سے زیادہ کشادہ نہیں ہے۔ قاہرہ سے بحیرۂ روم تک ایک سو میل لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا قطعہ ارض جو دریائے نیل کے ڈیلٹا پر مشتمل ہے سب سے بڑا مزروعہ علاقہ ہے اور اس کا شمار دنیا کے گنجان ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ مصر کی مزروعہ زمین زرخیزی میں بے مثل ہے اور ساری کی ساری نیل کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ مصری انقلاب کے بعد اسوان کے بند سے پانی حاصل کر کے ڈیلٹا کے علاقے میں مزید زمین زیر کاشت لائی گئی ہے۔ گیہوں، چاول، روئی اور گنا سب سے اہم زرعی پیداوار ہیں۔ مصر کی روئی دنیا کی بہترین روئی سمجھی جاتی ہے۔ پھل بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔

معدنیات میں لوہا، فاسفیٹ بھی نکالا جاتا ہے لیکن سب سے اہم معدنی پیداوار پٹرول ہے۔ جزیرہ نما سینا میں پٹرول کے سب سے اہم ذخیرے ہیں لیکن اب بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ اور بحیرہ احمر کے ساحل کے ساتھ پٹرول کے نئے ذخیرے ملے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں کل ۹۶ لاکھ ٹن پٹرول نکالا گیا تھا لیکن ۱۹۷۵ء میں یہ مقدار ڈیڑھ کروڑ ٹن ہوگئی۔ شکر سازی، پارچہ بانی اور سیمنٹ بڑی صنعتیں ہیں۔ انقلاب کے بعد سے قاہرہ کے نواح میں حلوان کے مقام پر فولاد سازی کا کارخانہ بھی کام کر رہا ہے۔ سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات کے تعاون سے اسلحہ سازی کی صنعت قائم کی جا رہی تھی لیکن اسرائیل سے سمجھوتہ کے بعد یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ بعض ضروری اسلحہ مصر میں بنائے جاتے ہیں۔ سیر و سیاحت زرمبادلہ کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھی لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس کو نقصان پہنچا۔ اب اس کو پھر فروغ ہو رہا ہے اور ۱۹۷۸ء میں چھ لاکھ سیاح مصر آئے۔ نہر سویز سے گزرنے والے جہازوں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے وہ مصر کی آمدنی اور خوشحالی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

صنعتوں میں بیرونی ملکوں کے لیے سرمایہ کاری کے جو مواقع صدر سادات نے فراہم کیے ہیں اس کا نتیجہ حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے اور ۱۹۷۹ء تک ایک ارب ۶۸ کروڑ ڈالر کی بیرونی سرمایہ کاری ہوئی۔ اس میں عرب ملکوں کا حصہ صرف ۲۷ کروڑ ڈالر تھا۔ باقی سرمایہ کاری مغربی ملکوں نے کی۔ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۵ء تک ایک کروڑ مصری سماجی تحفظ کے تحت آ چکے تھے اور ۹۵ فیصدی کا بیمہ کیا جا چکا تھا۔

مصر میں تعلیم ہر سطح پر مفت ہے۔ قاہرہ میں کئی یونیورسٹیاں ہیں جن میں ایک امریکن یونیورسٹی ہے۔ جامعہ ازہر میں دینی تعلیم کے ساتھ وہ تمام مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو دوسری یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اب ازہر میں خواتین بھی داخلہ لے سکتی ہیں۔ اسکندریہ، منصورہ، طنطا اور اسیوط میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں چھپن لاکھ مصری زیر تعلیم تھے۔

مصری صحافت اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور ترکی کے علاوہ کسی اسلامی ملک کے اخبارات اشاعت کی کثرت میں مصری اخباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ الاخبار سات لاکھ، الاہرام چار لاکھ اور الجمہوریہ ڈھائی لاکھ روزانہ چھپتے ہیں۔ ہفت روزہ الاہرام کی اشاعت گیارہ لاکھ ہے۔ ہفت روزہ الاخبار کا معیار بھی بلند ہے۔ ہفت روزہ المصور کی اشاعت ایک لاکھ ۶۲ ہزار ہے۔ صدر ناصر کے زمانے میں تمام اخبارات عرب سوشلسٹ یونین کے کنٹرول میں دے دیے گئے تھے اور ان کو چار بڑے ناشروں کے ذریعہ شائع کیا جاتا تھا: دارالاہرام، دار الہلال، دار اخبار الیوم اور دار الجمہوریہ۔ ان کے تحت الاہرام، اخبار الیوم، الجمہوریہ اور دوسرے اخبار شائع ہوتے تھے۔ دار الہلال کا ادارہ رسالوں کا ناشر تھا۔ الجمہوریہ عرب سوشلسٹ یونین کا ترجمان تھا۔ الاخبار انوار سادات کے پاس تھا اور الجمہوریہ علی صبری کی نگرانی میں اور الاہرام صدر ناصر کی نگرانی میں تھا۔

دارالحکومت قاہرہ آبادی کے لحاظ سے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اور عربی زبان کی صحافت اور مطبوعات کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہے۔ جہاں کے کتب خانے عرب دنیا میں سب سے بڑے اور قیمتی کتب خانے ہیں۔ قاہرہ کی آبادی ستر لاکھ اور اسکندریہ کی پچیس لاکھ ہے۔ دمیاط، پورٹ سعید، سویز دوسرے اہم شہر ہیں۔

جدید مصری ادب

جدید مصری ادب اتنا وسیع ہے کہ اس کے ساتھ ایک صفحہ میں انصاف نہیں ہوسکتا۔ مصریوں نے گزشتہ نصف صدی میں فکر، دین، تحقیق وتنقید، تاریخ وسوانح اور ادب لطیف میں بے مثال لٹریچر پیدا کیا ہے اور اسلامی دنیا میں ترکی اور اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں شاید اتنا وسیع

لٹریچر موجود نہیں۔ ادیبوں میں دو بھائی محمد تیمور (۱۸۹۱ء تا ۱۹۲۱ء) اور محمود تیمور شاعر اور مقالہ نگار ابراہیم المازنی (۱۸۹۰ء تا ۱۹۴۹ء) توفیق الحکیم، مصطفیٰ لطفی المنفلوطی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۲۴ء) جن کی بعض ناولوں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے قابل ذکر نام ہیں۔ سوانح نگاروں میں غالباً محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۶ء) جن کی سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت ابوبکرؓ، اور سیرت عمر فاروق اعظمؓ کے اُردو میں ترجمے ہو چکے ہیں اور عباس محمود العقاد متوفی ۱۹۶۴ء جن کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی اُردو میں ہو گئے ہیں سب سے بڑی شخصیت ہیں۔ علمائے دین اور مفکرین میں رشید رضا مصری، فرید وجدی اور سید قطب شہید اور ان کے ساتھیوں کا تذکرہ اسی باب کے شروع میں کیا جا چکا ہے۔ سید قطب کے بھائی محمد قطب نے بھی اسلامی موضوعات پر کثرت سے لکھا ہے اور ان کی کئی کتابوں کے انگریزی اور اُردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ شیخ محمد خضری (۱۸۷۲ء تا ۱۹۲۷ء) بھی اس صدی کے ممتاز عالم اور مورخ ہیں۔ اصول فقہ، تاریخ فقہ اسلامی، سیرت الخلفاء، محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیہ، تہذیب الاغانی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ تاریخ فقہ اسلامی اور محاضرات کا اُردو میں تاریخ الامت کے نام سے سات جلدوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے طٰہٰ حسین کی الشعر الجاہلی پر تنقید بھی لکھی ہے۔ موجودہ علماء میں شیخ ابوزہرہ کا نام ممتاز ہے۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی کے لاکالج کے وائس پرنسپل اور اسلامی قانون کے استاد ہیں۔ انہوں نے مصر میں جمال ناصر کی آمریت کے دَور میں بھی جرأت سے کام لیا اور اسلامی روایات کا تحفظ کیا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، ابن حزم اور امام جعفر صادق سے متعلق ان کی ضخیم تحقیقی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی کتاب المذاہب الاسلامیہ کا بھی اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

خدیو اور شاہانِ مصر

محمد علی پاشا	۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء
عباس اوّل	۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۴ء
سعید	۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۳ء
اسماعیل	۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء
توفیق	۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۲ء
عباس دوم حلمی	۱۸۹۲ء تا ۱۹۱۴ء
حسین کامل	۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۱ء
فواد اوّل	۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۶ء
فاروق	۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۲ء
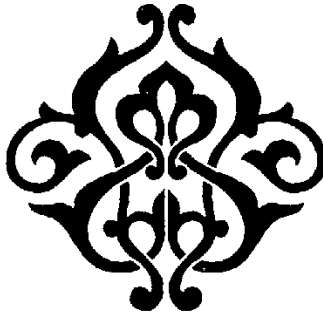
باب ۳۱

سوڈان کی ڈیموکریٹک جمہوریہ

سوڈان دنیا کے قدیم ترین ملکوں میں سے ہے۔ مصر کی طرح سوڈان میں بھی دریائے نیل کی وادی دنیا کی بعض قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ سوڈان کا شمالی حصہ عہد قدیم میں نوبیہ کہلاتا تھا اور نوبیہ کی قدیم تہذیب دراصل مصری تہذیب تھی جس کے اثرات شمالی سوڈان میں مصر کی سلطنت قدیم (۲۹۰۰ ق م تا ۲۵۰۰ ق م) کے زمانے ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد خود نوبیہ میں ۸۰۰ ق م کے قریب ناپاتا (napata) اور میرو (meroe) کی سلطنتیں قائم ہوئیں جو ۳۰۰ء تک موجود تھیں۔ ان سلطنتوں کے زمانے میں مصر پر بھی اہل نوبیہ کا قبضہ ہو گیا تھا اور سوڈان کی اس سلطنت کی حدود بحیرہ رُوم تک پہنچ گئی تھیں۔ خرطوم اور مصر کے درمیان حال ہی میں جو کھدائی ہوئی ہے، اس سے ان قدیم تہذیبوں کے بکثرت آثار دریافت ہوئے ہیں جو اہراموں، عبادت گاہوں، محلوں اور مجسموں کی شکل میں ہیں۔

ناپاتا اور میرو کے زوال کے بعد سوڈان میں عیسائیت کو فروغ ہوا۔ اگرچہ سوڈانیوں نے چھٹی صدی عیسوی تک مسیحیت قبول نہیں کی تھی۔ لیکن اگلی چند صدیوں میں شمالی سوڈان کا بڑا حصہ مسیحی مذہب قبول کر چکا تھا۔ سوڈان کی مسیحی ریاستوں میں دُنقلہ (dongola) اور ایلوا کی حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ یہ سلطنتیں چودھویں صدی بلکہ اس کے بعد تک قائم رہیں۔ اس کے بعد ان کے کھنڈروں پر اسلامی حکومتوں کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

اسلامی دور

مسلمانوں نے نوبیہ پر ساتویں صدی عیسوی ہی سے حملے شروع کر دیے تھے یہ خلافت راشدہ کا زمانہ تھا۔ لیکن مسلمان ان حملوں میں نوبیہ پر قابض نہیں ہو سکے۔ آٹھویں صدی میں عرب قبائل بہت بڑی تعداد میں بحیرہ احمر کے راستے مشرقی سوڈان میں داخل ہونے اور سنار کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ عربوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ نیگرو باشندوں کے

ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور ایک وقت وہ آ گیا کہ سنار کے علاقے میں عربوں کی اکثریت ہوگئی اور یہاں کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔ پندرھویں صدی تک مسلمانوں کا اس تمام علاقے پر قبضہ ہو گیا جو بارہ درجے عرض بلد کے شمال میں ہے، اور اب شمالی سوڈان کہلاتا ہے۔ پندرھویں صدی میں یہاں دو طاقتور اسلامی حکومتیں قائم تھیں ایک سنار کے سلاطین جو فنج (fung) کہلاتے تھے اور دوسرے مغرب میں وارفور کے سلاطین۔ فنج حکمران عدلان (۱۵۹۶ء تا ۱۶۰۳ء) کے زمانے میں جو مغل شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا۔ سنار کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور بغداد اور قاہرہ تک سے اہل علم سنار پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ سنار کی تاریخی جامع مسجد جو اب تک موجود ہے، اسی عدلان کے پڑپوتے نے بنوائی تھی۔ فنج خاندان کے عہد میں جسے اٹھارھویں صدی میں زوال ہوا، پورا شمالی سوڈان اسلام قبول کر چکا تھا۔

فنج خاندان کے زوال کے بعد سوڈان انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ یہ صورت حال تھی کہ مصری حکمران محمد علی پاشا نے ۱۸۲۰ء میں نوبیہ اور اگلے سال سنار فتح کر لیا۔ اس کے بعد مصری تسلط آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں استرائیہ (equatoria) یعنی موجودہ سوڈان کا انتہائی جنوبی صوبہ بھی مصری سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

مہدی سوڈانی

مصری حکومت نے سوڈانی باشندوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جس کا سوڈانیوں پر شدید ردعمل ہوا۔ اور ۱۸۸۳ء میں انہوں نے ایک درویش صفت انسان محمد احمد کی رہنمائی میں جو مہدی سوڈانی ۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۵ء کے نام سے مشہور ہیں، علم بغاوت بلند کر دیا۔ مہدی سوڈانی کے پیرووں نے جو درویش کہلاتے تھے، دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ مصری حکومت نے بغاوت کچلنے کے لیے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن گورڈن کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جنرل گورڈن مارا گیا۔ اور ۲۶۔ جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہدی سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک

حکومت کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ ایک مصلح بھی تھے۔ انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ جمال الدین افغانی سے بھی ان کی مصر میں ملاقات ہوئی تھی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ تمام زندگی احکام اسلام کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سوڈان کے شہر بربرہ میں اپنے استاد کا پیش کیا ہوا کھانا محض اس وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا تھا کہ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے تصوف میں اپنے شیخ سے محض اس وجہ سے قطع تعلق کر لیا کہ شیخ نے اپنے بچوں کے ختنہ کی تقریب میں ناچ گانے کا انتظام کیا تھا۔

۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدی سوڈانی سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہو گئے۔ انہوں نے کئی سال سے دریائے نیل کے ایک جزیرہ آبا (ABA) میں رہائش اختیار کر لی تھی، اور یہیں سے انہوں نے اپنی تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک ۲۹۔ جون ۱۸۸۱ء میں اس وقت شروع ہوئی جب مہدیؑ نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب و سنت کی بالادستی قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ اس مقصد کے لیے لوگوں کو جان و مال کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور یہ کہ ان کے پیرووں کو چاہیے کہ وہ جزیرہ آبا میں ہجرت کر کے آ جائیں۔ بس اس کے بعد سے سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوئیں۔

مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارہ پر خرطوم کے بالمقابل ام درماں کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اصلاحات نافذ کرنی شروع کر دیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے اور جن لوگوں کو سابقہ حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا ان کو ان کی زمینیں واپس کر دی گئیں۔ مہدی سوڈانی نے اُن رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں اور سوڈانی باشندوں میں رائج ہو گئی تھیں۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور عورتوں کو پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ شادی بیاہ پر فضول خرچیوں سے روکا گیا اور جہیز پر پابندیاں عاید کی گئیں۔ مہدی سوڈانی اپنے پیرووں سے حسب ذیل حلف لیتے تھے۔

''ہم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی

اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خیر باد کہہ دیں گے اور خدا کی خوشنودی کے لیے کام کریں گے، اور یہ کہ جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے"

مہدی سوڈانی کا جانشین خلیفہ عبداللہ ۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۸ء حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہوگیا اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچز کی قیادت میں ۱۸۹۸ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن جدید اسلحہ سے لیس فوج کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر ۱۸۸۹ء میں جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر پھر مصری اور برطانوی تسلط قائم ہوگیا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں مشہور درویش سپہ سالار عثمان دغنہ جس نے مہدی سوڈانی کے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا تھا، گرفتار ہوگیا۔ کچز نے جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر مہدی سوڈانی کی قبر کھدوادی اور ہڈیاں جلا ڈالیں اس کے بعد ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء میں درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں، لیکن وہ کچل دی گئیں۔

انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروؤں کو اپنے دور میں بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن اب سوڈان میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مہدی محمد احمد سوڈان کی تحریک بیداری کے پیش رو تھے۔ ان کی ہڈیاں اگرچہ کچز نے قبر سے نکلوا کر جلا ڈالیں لیکن ام درمان میں ان کا مقبرہ آج سوڈان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

برطانوی دور

مصر کا قبضہ کچز کی سرکردگی میں جو مصری فوج کا سردار کہلاتا تھا، سوڈان پر مصری قبضہ دراصل مصری حکومت کی بحالی نہیں تھا۔ بلکہ سوڈان پر انگریزی تسلط کا پیش خیمہ تھا۔ کہنے کو ۱۹۔ جنوری ۱۸۹۹ء میں مصر اور برطانیہ میں ایک معاہدہ ہوگیا تھا جس کے تحت سوڈان پر برطانیہ اور مصر دونوں کی بالادستی تسلیم کی گئی تھی لیکن سوڈان کے حقیقی حکمران انگریز ہی تھے۔ ۱۹۲۴ء میں سوڈان کے انگریز گورنر جنرل کے قتل کے بعد مصر کا رہا سہا آئینی سہارا بھی ختم کر دیا گیا اور سوڈان براہِ راست

برطانیہ کے تسلط میں آ گیا۔

انگریزی دور ۱۸۹۹ء تا ۱۹۵۶ء میں مصر کی طرح سوڈان میں بھی آبپاشی کا وسیع نظام قائم کیا گیا۔ دریائے نیل پر کئی بند بنائے گئے اور نہریں نکالی گئیں، سڑکیں بنائی گئیں، ریل کی پٹڑیاں بچھائی گئیں۔ سوڈان کی مجلس قانون ساز بھی اس زمانہ میں ۱۹۔ جون ۱۹۴۸ء کو قائم کی گئی۔ انگریزوں نے جہاں مذکورہ بالا قابل تعریف کارنامے انجام دیے، وہاں انہوں نے مصر اور سوڈان کے درمیان افتراق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی اور جنوبی سوڈان کو باقی ملک سے علیحدہ کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنوبی سوڈان کے تین صوبوں میں غیر مسلم اکثریت ہے اور وہاں کے باشندے حبشی النسل ہیں جب کہ باقی سوڈان کے باشندے عربی النسل ہیں۔ اور زبان بھی عربی بولتے ہیں۔ ان باشندوں کی اکثریت مظاہر پرست ہے اور بت پرستانہ عقاید رکھتی ہے۔ برطانوی دور میں ان کے درمیان مسیحیت پھیلانے کی پوری کوشش کی گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی صوبوں کے باشندوں کا ایک بڑا طبقہ سوڈان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگا ہے۔

آزادی حاصل کرنے سے پہلے سوڈان کے باشندے دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک گروہ مصر اور سوڈان کے اتحاد کا حامی تھا۔ اور دوسرا مصر سے مکمل علیحدگی چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کو اشقہ پارٹی کی حمایت حاصل تھی، جس کے رہنما اسماعیل ازہری تھے۔ سوڈان کے ایک بااثر صوفی سلسلے خاتمیہ کے رہنما سید سر علی میر غنی اسی گروہ کے ساتھ تھے۔ دوسرا گروہ جو علیحدگی کا حامی تھا اس کے قائد مہدی سوڈانی کے صاحبزادے سر عبدالرحمن (۱۸۸۵ء تا ۱۹۶۱ء) تھے۔ وہ سوڈان کی دوسری بااثر جماعت امہ پارٹی کے رہنما تھے۔ سوڈانیوں کے درمیان ان اختلافات کی وجہ سے سوڈان کے مصر کے ساتھ الحاق کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو برطانیہ نے سوڈان کو آزاد کر دیا۔

آزادی کے بعد

آزادی حاصل کرنے کے بعد اشقہ پارٹی کے رہنما اسماعیل ازہری نے پہلی حکومت بنائی۔ یہ بات اگرچہ مصر سے الحاق کے حامیوں کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن مصر اس وقت صدر ناصر کی قیادت میں قوم پرستی اور آمریت کے جس راستے پر جا رہا تھا اس میں سوڈانیوں کے لیے کوئی

کشش نہیں تھی۔ اخوان المسلمون کے ساتھ مصری حکومت کے سلوک نے اس اسلامی رشتہ کو بھی کمزور کر دیا جو وادی نیل کی وحدت قائم رکھنے میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ازہری کی حکومت بھی ٹوٹ گئی اور سوڈانی قوم پرستی کی سب سے بڑی علمبردار جماعت امہ پارٹی کے ایک رہنما عبداللہ خلیل نے ایک نئی حکومت بنائی۔ اب مصر کے ساتھ سوڈان کے الحاق کی ہر امید ختم ہو چکی تھی لیکن مصر اب بھی سوڈان میں خفیہ طور پر توڑ جوڑ کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نومبر ۱۹۵۸ء میں سوڈان بھی ایک ایسے ہی انقلاب سے دو چار ہوا، جس سے اس زمانے میں اسلامی دُنیا کے کئی ملکوں کو سابقہ پڑ رہا تھا۔ سوڈانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ابراہیم عبود نے ۱۷۔نومبر کو آئینی اور جمہوری حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کر دی۔ تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا گیا۔ اور جب سیاسی رہنماؤں نے آئینی حکومت بحال کرنے کے لیے زیادہ دباؤ ڈالا تو جولائی ۱۹۶۱ء میں دونوں ممتاز سیاسی رہنماؤں یعنی عبداللہ خلیل اور اسماعیل ازہری کو گرفتار کر لیا گیا۔ سید عبدالرحمن کو ان کے اثر کی وجہ سے گرفتار نہ کیا جا سکا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۶۱ء میں وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ جنرل عبود کی آمریت چار سال تک قائم رہی۔ بالآخر حریت پسند عوامی طاقتوں کے آگے ان کو ہتھیار ڈالنا پڑے، اور وہ ۱۵۔نومبر ۱۹۶۴ء کو مستعفی ہو گئے اور سوڈان میں ایک بار پھر جمہوری نظام قائم ہو گیا۔

پاکستان کی طرح سوڈان میں بھی آزادی کے بعد دستور سازی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ سوڈان میں اسلامی عناصر کافی مضبوط تھے اور آزادی کے بعد سوڈان کو ایک اسلامی دستور ملنے والا تھا۔ لیکن فوجی انقلاب نے منزل دُور کر دی۔ عبود کی آمریت کے خاتمہ کے بعد مئی ۱۹۶۵ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ امہ پارٹی نے جس کے رہنما اب امام ہادی المہدی اور صادق المہدی تھے، اسماعیل ازہری کی حزب الاتحاد الدیمقراطی (Unionist Democratic Party) کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیا کہ سوڈان کا دستور اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو۔ یہ صورت حال کمیونسٹوں کے لیے پریشانی کا موجب بنی جو سوڈان کو ایک لادینی سوشلسٹ ملک بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۹ء میں فوج کے ہم خیال افسروں کی مدد سے ان سوشلسٹ عناصر نے جمہوری حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور سوڈان میں سوشلسٹ آمریت قائم کر دی۔ بیشتر سوشلسٹ ملک کی طرح سوڈان میں بھی تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور

اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ام درمان کی اسلامی یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ اخوان المسلمون اور امہ پارٹی کے رہنماؤں کو خاص طور پر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ جزیرہ آبا پر جو مہدی سوڈانی کے پیروؤں کا سب سے بڑا مرکز تھا حملہ کیا گیا۔ اس حملے میں امہ پارٹی کے رہنما اور مہدی سوڈانی کے پوتے ہادی المہدی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۷۰ء سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ وہ اپنے بھائی صدیق المہدی کے انتقال کے بعد ۱۹۶۱ء سے انصار اور امہ پارٹی کے رہنما تھے۔ امہ پارٹی کے دوسرے رہنما صادق المہدی کو جو ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء سوڈان کے وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے اور صدیق مہدی کے صاحبزادے ہیں کمیونسٹ رہنما عبدالخالق محجوب کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔ ملک کے بزرگ رہنما اور آزادی کے معمار اسماعیل ازہری کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں پُراسرار حالات میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

جعفر محمد نمیری کا دورِ صدارت

سوڈان کے اس سوشلسٹ انقلاب کے بانی، سوڈانی فوج کے ایک افسر جعفر محمد النمیری تھے جو اس وقت بھی برسراقتدار ہیں۔ وہ ام درمان کے مضافات میں ایک متوسط گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں دینی تعلیم حاصل کی اور قرآن کی ۲۳ سورتیں بھی حفظ کیں۔ اس کے بعد صوبہ نیل ازرق کے صدر مقام ودمدنی میں ثانوی تعلیم حاصل کی۔ مئی ۱۹۴۹ء میں خرطوم کے فوجی کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے فارغ ہو کر ۱۹۵۲ء میں فوج میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں انہوں نے مصر میں اعلیٰ فوجی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے قبرص، لیبیا، مغربی جرمنی اور مصر میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں۔

کرنل نمیری شروع سے سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مصر میں تعلیم کے دوران صدر ناصر کے مداح بن گئے اور ۱۹۵۳ء میں سوڈان سے برطانوی تسلط ختم کرنے کے لیے خفیہ سوسائٹی قائم کی جو جنوری ۱۹۵۶ء میں سوڈان کو آزادی ملنے کے بعد توڑ دی گئی۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے پھر خفیہ سوسائٹی قائم کی، لیکن سوڈان نے اس مرتبہ ان کو گرفتار کر لیا اور فوج سے برطرف کر دیا۔ ۱۹۵۸ء میں ان کو جنوبی کمانڈ میں جوبا کے مقام پر تعینات کیا گیا۔ یہاں انہوں نے پھر خفیہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جب سوڈان میں فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے

ہوئے تو ان کی تنظیم کے ارکان نے مجمع پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔جس کے نتیجے میں جنرل عبود مستعفی ہو گئے اور سوڈان میں پارلیمانی حکومت بحال ہو گئی۔

کرنل نمیری نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کا زمانہ امریکہ میں گزارا جہاں انہوں نے ریاست کنساس میں لا یبون ورتھ (leaven worth) کے اسٹاف کالج سے فوجی سائنس میں ماسٹر کی سند حاصل کی۔سوڈان واپس آنے کے بعد وہ جنوری ۱۹۶۷ء میں فوجی انقلاب لانے کی کوشش میں گرفتار ہو گئے،لیکن پھر رہا کر دیے گئے۔۱۹۶۹ء تک خفیہ تنظیم کے افسروں کی تعداد سڑسٹھ تک پہنچ گئی اور نمیری کرنل ہو گئے۔اسی سال ان کو خرطوم کے فوجی کالج میں کمانڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔اس موقع سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور آٹھ سو فوجیوں کی مدد سے ۲۵۔مئی ۱۹۶۹ء کو خون خرابے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لیا۔کیونکہ سوڈانی فوج کی بڑی تعداد جنوب میں مصروف جنگ تھی۔اب وہ انقلابی کمانڈ کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے ملک کے صدر بن گئے اور جنرل ہو گئے۔

جنرل نمیری نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تمام سیاسی جماعتیں توڑ دیں۔چونسٹھ سیاست دانوں اور تمام اعلیٰ فوجی افسروں کو گرفتار کر لیا اور سوڈان کی حکومت کا نام ڈیموکریٹک جمہوریہ سوڈان رکھا اور سوشلزم کے ذریعہ ملک کو ترقی دینے کے عزم کا اظہار کیا۔نوجوانی میں صدر نمیری مہدیویوں سے وابستہ تھے،لیکن اب ان کے خلاف ہو گئے اور ان کی تنظیم الانصار کو توڑنے کے لیے انہوں نے کمیونسٹوں کا سہارا لیا اور اکتوبر ۱۹۶۹ء میں سوڈانی کابینہ میں تین کمیونسٹ وزیر شامل کیے،جس پر انصار نے مارچ ۱۹۷۰ء میں احتجاجی مظاہرہ کیا۔اس مظاہرے کو صدر نمیری نے سختی سے کچل دیا اور ایک ہزار انصار مارے گئے۔لیکن نمیری کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کمیونسٹوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔چنانچہ جب ان کو معلوم ہوا کہ کمیونسٹ وزیر سرکاری رازوں سے اپنی پارٹی کو مطلع کر دیتے ہیں تو انہوں نے نومبر ۱۹۷۰ء میں ان وزیروں کو برطرف کر دیا۔ایک سال بعد ۱۲۔فروری ۱۹۷۱ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ سوڈان سے کمیونزم کے تمام آثار مٹا دیے جائیں گے۔۱۹۔جولائی ۱۹۷۱ء کو روس اور بلغاریہ کی مدد سے سوڈانی فوج کے کمیونسٹ افسروں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے صدر نمیری کو گرفتار کر کے میجر ہاشم العطاء کی سربراہی میں حکومت قائم کر لی۔لیکن یہ حکومت تین دن سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔فوج نے نمیری کا ساتھ دیا اور مصر اور لیبیا سے بھی ان کو امداد ملی۔مصر نے نہر سویز کے علاقے میں تعینات سوڈانی دستوں کو بھی

طیاروں کے ذریعے سوڈان پہنچا دیا۔ لیبیا نے سوڈان کے وزیر دفاع میجر جنرل خالد حسن عباس کو جو یوگوسلاویہ میں تھے سوڈان پہنچا دیا اور انہوں نے ۲۲۔ جولائی کو صدر نمیری کو قید سے آزاد کرالیا۔ باغی افسروں کو گولی ماردی گئی اور فوج سے سارے کمیونسٹ نکال دیے گئے۔

۳۰۔ ستمبر ۱۹۷۱ء کو استصواب رائے کے بعد جس میں ان کو چالیس لاکھ ووٹ ملے محمد جعفر نمیری باضابطہ سوڈان کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے واحد سیاسی پارٹی کی حیثیت سے سوڈانی سوشلسٹ یونین قائم کی اور جنوری ۱۹۷۲ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انقلابی کمانڈ کونسل توڑ دی گئی۔ نیا مستقل آئین ۱۹۷۳ء میں منظور کیا گیا۔ اس کے تحت سوڈان میں ڈھائی سو افراد پر مشتمل قومی عوامی اسمبلی قائم کی گئی ہے جس میں ستر نشستیں مزدور اداروں کے لیے مخصوص ہیں۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔

جنوبی سوڈان

سوڈان کے داخلی مسئلوں میں سب سے اہم مسئلہ جنوبی سوڈان کے تین صوبوں کا ہے جو رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے پورے سوڈان کا ایک چوتھائی ہے۔ یہ علاقہ جنگلوں سے پٹا پڑا ہے، بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ غیر مزروعہ زمین وافر ہے اور زراعت کو ترقی دینے کے سب سے زیادہ امکانات اسی خطہ میں ہیں۔ لیکن یہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ اگرچہ ان میں مسیحیوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن مظاہر پرستوں کی قیادت ان ہی مسیحی رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے جن کو ساری دنیا کے مسیحی ملکوں خصوصاً مسیحی تبلیغی اداروں کی حمایت حاصل ہے۔ ان کی طرف سے جنوبی سوڈان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنانے اور اس علاقہ کو سوڈان سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۲ء تک جنوبی صوبوں میں کئی بار بغاوتیں ہوئیں۔ صدر نمیری نے اس مسئلہ کو طاقت کی بجائے سیاسی مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اس خطہ کو اندرونی خودمختاری دے کر بظاہر حل کرلیا ہے۔ اب اس علاقے میں جس کا صدر مقام جوبا ہے ایک اسمبلی قائم ہے۔ دستور کے تحت اس علاقے کا صدر سوڈان کا نائب صدر ہے۔ دفاع، امورِ خارجہ، معاشی اور سماجی ترقیات، تعلیم، سکہ، فضائی اور بین العلاقائی ٹرانسپورٹ، مواصلات، اور ٹیلی کمیونی کیشن، قومیت، نقل مکانی، کسٹم اور بیرونی تجارت کے علاوہ ہر معاملے

میں علاقے کو خود مختاری حاصل ہے۔ علاقائی اسمبلی مرکزی حکومت کے ایسے قانون کو ملتوی کر سکتی ہے جو اس کے خیال میں جنوب کے مفاد میں نہ ہو۔ جنوبی سوڈان کی علاقائی اسمبلی کے انتخابات نومبر ۱۹۷۳ء میں ہوئے اور قومی عوامی اسمبلی کے اپریل ۱۹۷۴ء میں ہوئے۔ شمال اور جنوب کے درمیان پُرامن مصالحت صدر نمیری کا اہم کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اس تصفیہ کے نتیجہ میں جنوب کے متحد سوڈانی قومی محاذ نے بیس سال تک مخالفت کرنے کے بعد خود کو ختم کر لیا ہے۔ اس کے لیڈر فلپ عباس کو نمیری نے ۱۹۶۹ء میں جلاوطن کر دیا تھا۔ اب ان کو معافی دے دی گئی ہے۔

صدر نمیری نے سوڈان میں کمیونسٹوں کی طاقت تو توڑ دی لیکن دائیں بازو کے عناصر کی طاقت توڑنے میں وہ ناکام رہے۔ ان کے سب سے طاقتور مخالف انصار تھے، جن کو لیبیا کے صدر قذافی کی تائید حاصل تھی اور جن کے رہنما صادق المہدی کی صدر قذافی سرپرستی کر رہے تھے۔ لیبیا میں انصار کے جلاوطن رضا کاروں کو فوجی تربیت دی جا رہی تھی اور اسلحہ فراہم کیا جا رہا تھا۔ جنوری ۱۹۷۳ء میں اور پھر جولائی ۱۹۷۶ء میں انصار نے صدر نمیری کا تختہ الٹنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور بغاوت ہر بار کچل دی گئی۔ اس دوران میں سوڈان کی خارجہ پالیسی میں کئی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے مصر کی طرح سوڈان نے بھی امریکہ سے تعلقات ختم کر لیے تھے۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد یہ دیکھ کر روس کی حکومت لیبیا اور حبش کی طرف جھک رہی ہے اور روس سوڈانی کمیونسٹوں سے مل کر سازش کر رہے ہیں۔ صدر نمیری نے ۱۹۷۲ء میں امریکہ سے تعلقات بحال کر لیے اور مصر سے جہاں اب صدر سادات برسر اقتدار تھے نیز سعودی عرب سے تعلقات کو اور زیادہ مستحکم بنایا۔ ۱۹۷۷ء میں سوڈان سے روسی مشیروں کو نکال دینے کے بعد سوڈان نے اسلحہ بھی امریکہ سے حاصل کرنا شروع کر دیے۔ اسی سال ۱۹۷۷ء، حبش میں کمیونسٹ انقلاب آ گیا اور اری ٹیریا کی آزادی کی جدوجہد جس کی سوڈان پشت پناہی کر رہا تھا اور سوڈان کی مالی امداد بھی کر رہا تھا۔ صدر نمیری نے ان بدلتے ہوئے حالات میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ غیر مسلم طاقتوں اور سوشلسٹ عناصر پر اعتماد کرنے کی بجائے ان کو اسلامی عناصر پر اعتماد کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں ان کو خود اپنے وطن کے اسلامی عناصر کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے صادق المہدی سے تصفیہ کی گفتگو شروع کر دی۔ اسی دوران فروری ۱۹۷۸ء میں سوڈان میں انتخابات ہوئے جو نمیری کے برسر اقتدار آنے کے بعد

پہلے انتخابات تھے۔ ان میں تقریباً نصف نشستوں پر مخالف جماعتوں کے لوگ کامیاب ہو گئے۔ نمیری کے لیے اب صادق المہدی سے تصفیہ ضروری ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۲۔ اپریل ۱۹۷۸ء کو قومی محاذ کے ارکان سے جن کی قیادت صادق المہدی کر رہے تھے نمیری نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ معاہدہ کے تحت محاذ نے وعدہ کیا کہ وہ چھاپہ مار سرگرمیاں بند کر دے گا اور اسلحہ حکومت کے سپرد کر دے گا۔ دوسری طرف حکومت سوڈان نے انصار اور اخوان سے تعلق رکھنے والے لیے سو قیدی جن کی بڑی تعداد طلبہ پر مشتمل تھی رہا کر دیے۔ حکومت نے صادق المہدی اور تمام جلاوطن رہنماؤں کو سوڈان واپس آنے کی اجازت دے دی اور وعدہ کیا کہ ان کو مکمل حقوق اور آزادی حاصل ہوگی۔

صادق المہدی

امہ پارٹی کے رہنما صادق المہدی (پیدائش ۱۹۳۵ء) صدیق المہدی کے صاحبزادے اور ہادی المہدی کے بھتیجے ہیں۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے سوڈان کی فوجی حکومت کی ہمیشہ مخالفت کی اور جب جنرل عبود کے بعد پارلیمانی حکومت بحال ہوئی تو ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء وہ سوڈان کے وزیر اعظم بھی رہے۔ جب جعفر نمیری برسر اقتدار آئے تو صادق المہدی نے ان کے سوشلزم کی طرف ضرورت سے زیادہ رجحان پر انتباہ کیا۔ مارچ ۱۹۷۰ء میں جزیرہ آبا پر حملے کے دوران جب ان کے چچا ہادی المہدی شہید ہو گئے تو نمیری نے صادق المہدی کو جلاوطن کر دیا۔ انہوں نے باہر رہ کر ایک قومی محاذ قائم کیا اور لیبیا کے صدر قذافی کے تعاون سے نمیری کی حکومت پلٹنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۲ء میں نمیری نے صادق المہدی سے ملاقات کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مئی ۱۹۷۶ء میں مہدی کے دو ہزار آدمیوں نے خرطوم میں ہتھیار اٹھائے، لیکن یہ بغاوت چوبیس گھنٹے کے اندر کچل دی گئی اور کئی سو لوگوں کو پھانسی دے دی گئی، جس پر صادق المہدی نے نمیری کو عوام کا قاتل قرار دیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۷۷ء میں پورٹ سوڈان میں پھر نمیری اور صادق المہدی کی ملاقات ہوئی۔ اس بار یہ ملاقات کامیاب ہوئی اور اپریل میں فریقین میں معاہدہ ہو گیا اور تمام سیاسی مخالفوں کو عام معافی دے دی گئی۔ صادق المہدی بھی اگرچہ سوڈان واپس آ گئے لیکن حکومت سے ان کے تعلقات ابھی تک غیر یقینی ہیں۔ وہ سوڈان کی اسلامی حیثیت

کو محفوظ بنانا چاہتے ہیں اور شہری آزادیاں بحال کرنا چاہتے ہیں۔ صدر نمیری نے جنوبی صوبوں کو جو خود مختاری دی ہے، صادق المہدی نے اس کی حمایت کی ہے۔ صادق المہدی جنوبی صوبوں میں اسلام کی اشاعت و توسیع چاہتے ہیں اور ان کو توقع ہے کہ جنوب کی خود مختاری سے اس کام میں مدد ملے گی۔ لیکن صادق المہدی مصر اور اسرائیل کے درمیان معاہدے کے مخالف ہیں۔ وہ جنوبی سوڈان سے متعلق ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔

اسلامی عناصر سے تصفیہ کے بعد صدر نمیری نے وسط ۱۹۷۹ء میں سوڈانی سوشلسٹ یونین کے پولیٹیکل بیورو کے ۲۷ ممبروں میں سے نو کو نکال دیا۔ نائب صدر ابراہیم کو جو ۱۹۷۰ء میں انصار کے قتل عام کے ذمہ دار تھے برطرف کر دیا اور اخوان اور سوڈان کی ایک با اثر مذہبی جماعت الختمیہ کا تعاون حاصل کیا۔ اور ان کے تین افراد کو حکومت میں شامل کر کے سوڈانی قوانین کو شریعت کے مطابق بنانے کا کام سپرد کیا ہے۔ ان میں سابق یونینسٹ پارٹی کے رہنما احمد سعید حامد کو وزیر ٹرانسپورٹ مقرر کیا گیا ہے اور اخوان رہنما حسن ترابی کو اٹارنی جنرل مقرر کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی عناصر سے صدر نمیری کا یہ تعاون کہاں تک چلتا ہے۔

اخوان المسلمون اور ڈاکٹر حسن ترابی

سوڈان میں اسلامی قوتیں کافی طاقتور ہیں۔ صادق المہدی کے الانصار اور سید میر غنی سوڈانی کی مذہبی جماعت الختمیہ دو بڑے مذہبی گروہ ہیں جو اسلامی نظام کے علمبردار ہیں۔ سید میر غنی ایک زمانہ میں مصر اور سوڈان کے ادغام کے پرزور حامی تھے اور سابق اشقہ پارٹی کے پشت پناہ تھے، لیکن صدر ناصر کی پالیسی نے ان کو اتحاد کا مخالف بنا دیا۔[1] لیکن ان دونوں گروہوں کے اثرات قبائلی عصبیت اور صوفیانہ مذہبی پیشوائی اور طریقت کی بنیاد پر ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان مذہبی جماعتوں کی بجائے اخوان المسلمون سے زیادہ متاثر ہے، جس کے سب سے بڑے رہنما ڈاکٹر حسن ترابی ہیں، جو وسعت مطالعہ، ذہانت اور فکری گہرائی کے لحاظ سے اسلامی دنیا کی عظیم شخصیتوں میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔

---

(۱) مصری انقلاب پر سوڈانی رہنما اور الختمیہ جماعت کے سربراہ میر سید میر غنی کے تاثرات کے لیے دیکھیے ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور مئی ۱۹۶۱ء میں سید میر غنی کا مضمون "مصر کے موجودہ حالات کا جائزہ۔"

ڈاکٹر حسن ترابی نے خرطوم یونیورسٹی میں تعلیم پائی، اس کے بعد لندن یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور پھر فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ فرانس سے واپس آنے کے بعد جنرل عبود کے دور حکومت میں وہ خرطوم یونیورسٹی کے لاکالج کے پرنسپل ہو گئے۔ فوجی حکومت کے خلاف جب بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلی تو ڈاکٹر حسن ترابی نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ اس مہم میں ''محاذ اسلامی منشور'' کے سیکرٹری تھے جو اخوان المسلمون اور دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اتحاد سے وجود میں آیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں جب کمیونسٹ سوڈان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگے تو ڈاکٹر ترابی نے ان کے خلاف مہم چلائی اور ان کی کوششوں سے اسلامی دستور کا مسودہ تیار ہوا۔ لیکن جب کرنل جعفر نمیری نے ۱۹۶۹ء میں اپنی حکومت کا تختہ پلٹا تو ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں ان کو رہائی ملی لیکن جب وہ سعودی عرب، کویت، انگلستان اور امریکہ میں طلبہ کی اسلامی تنظیموں کے دورے کے بعد واپس سوڈان آئے تو ان کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی یہ گرفتاری ۱۹۷۸ء تک جاری رہی۔ اس سال جب صادق المہدی سے تصفیہ کے بعد اخوان کے کارکن رہا ہوئے تو ڈاکٹر حسن ترابی بھی رہا کر دیے گئے۔ حسن ترابی انصار رہنما صادق المہدی کے برادر نسبتی ہیں۔ صدر نمیری نے ان کو اٹارنی جنرل مقرر کیا ہے اور ان کو سوڈانی سوشلسٹ یونین کے پولٹ بیورو کا رکن بنا لیا گیا ہے۔ ان کے سپرد سوڈان کے قوانین کو شریعت اسلامی کے مطابق بنانا ہے۔ حسن ترابی کئی مرتبہ پاکستان آ چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والی جنگ کے موقع پر سوڈان کے اسلامی محاذ نے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کی تائید کی تھی اور ڈاکٹر حسن ترابی نے پاکستان آ کر حکومت پاکستان کو اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں۔ ڈاکٹر حسن ترابی پاکستان کے قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کے کام میں مدد دینے کے لیے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر ۱۹۷۸ء میں بھی دو مرتبہ پاکستان آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر حسن ترابی حسب ذیل کتابوں کے مصنف ہیں۔

(۱) الصلوٰۃ عماد الدین (۲) الایمان واثرہ فی الحیاۃ (۳) القضیہ الدستوریہ (دستوری مسئلہ) یہ آخری کتاب انہوں نے جیل میں لکھی تھی۔

سوڈان میں اخوان المسلمون کے دوسرے رہنماؤں میں رشید طاہر کا نام اہم ہے۔ رشید طاہر جعفر نمیری سے پہلے سوڈان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن اور وزیر انصاف رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر حسن ترابی جب ستمبر ۱۹۷۸ء میں پاکستان آئے تھے تو انہوں نے مولانا مودودی سے ملاقات کے دوران سوڈان میں اسلامی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ:

''سوڈان میں لوگ اشتراکیت کے علمبرداروں کے وعدوں سے مایوس ہو چکے ہیں اور حکام نے بھی اپنی مسلسل ناکامیوں کے بعد اسلام کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ نظامِ اسلام کی حامی جماعتوں کا تعاون حاصل کر رہے ہیں اور ہم بھی پچیس سال بعد ملنے والے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اسلامی نظام کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اور میرا دورۂ پاکستان اس سلسلے کی ایک کڑی ہے''۔ انہوں نے بتایا کہ ''سوڈان میں نوجوانوں کی اکثریت اسلام کی شیدائی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت اسلام کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتی ہے، لیکن نظامِ اسلام کے عملی نفاذ کے سلسلے میں تحقیقی اور عملی کام نہ ہونے کے سبب اس نظام کو نافذ کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر حسن ترابی نے بتایا کہ ''حسن البنا شہید کے ایک عزیز جمال البنا کو مزدوروں کی عالمی تنظیم کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے اور مصر کی بہت سی مزدور تنظیموں نے ان کی تنظیم سے الحاق کر لیا ہے۔

ڈاکٹر حسن ترابی نے انگریزی ماہنامہ ''مڈل ایسٹ'' کو ایک تازہ انٹرویو میں سوڈان میں اخوان کی سرگرمیوں اور نمیری کی حکومت سے تعاون کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''۱۹۴۰ء کے بعد طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے اسلامی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ یہ تحریک کمیونسٹوں کی نیشنل لبریشن نامی تنظیم کے جواب میں قائم کی گئی تھی جو اس زمانے میں طلبہ کو کنٹرول کر رہی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں اس تنظیم کو ''اخوان المسلمون'' کا نام دیا گیا اور ہم نے دوسری دینی جماعتوں سے تعاون کیا۔ جنرل عبود نے جب سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی تو ہم زیر زمین چلے گئے اور ہمارا اثر کمیونسٹوں سے بڑھ گیا۔ چنانچہ اکتوبر کے انقلاب میں پہل ہم نے کی۔ کمیونسٹ اگرچہ بعد میں شریک ہوئے، لیکن انقلاب کے بعد وہ اہم عہدوں پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ہم نے ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اسلامی منشور جاری کیا اور دینی جماعتوں کو اسلامی آئین کے اصول کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۶۶ء میں ہم نے پارلیمنٹ کو آمادہ کیا کہ وہ

---

(۱) روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۲۵۔ ستمبر ۱۹۷۸ء

کمیونسٹوں کی تنظیم کو توڑ دے۔ہم نے امہ پارٹی سے پارلیمانی اتحاد کیا۔ہم ایک ایسا آئین بنانا چاہتے تھے جو اسلامی دفعات پر مبنی ہوتا کہ ہمیں آئین تحفظ مل سکے۔لیکن مئی ۱۹۶۹ء میں نمیری کے اقتدار میں آ جانے سے ہمیں سب سے پہلے جیل جانا پڑا، کیونکہ نئی حکومت پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا۔پھر ہم نے حزب مخالف کے قومی محاذ میں شرکت کی جو صادق الہدی کی امہ پارٹی اور شریف الہندی کی نیشنل یونین پر مشتمل تھی۔

حسن ترابی نے بتایا کہ ''جولائی ۱۹۷۷ء کے تصفیہ کے بعد جب میں نے حکومت سے تعاون کیا تو شروع میں اخوان نے پسند نہیں کیا، لیکن ہم نے ان کو یقین دلایا کہ اندر سے کام کرنا ہمارے لیے مفید ہوگا۔جب تک نمیری اپنے وعدے پر قائم ہیں اور ہمیں کام کرنے دیتے ہیں ہم مطمئن ہیں اور نمیری کی حمایت کرنا ہمارے لیے مفید ہے اس لیے کہ اگر نمیری کی جگہ کوئی اور آ گیا تو وہ ان کے مقابلے میں کم مذہبی ہوگا اور کم روادار ہوگا''۔حسن ترابی نے آگے چل کر بتایا:

''لیکن اب تک حکومت سے تعاون کا نتیجہ مایوس کن نکلا ہے۔اسلام کو نافذ کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔اس مقصد کے لیے جو خصوصی کمیٹی قائم کی گئی ہے اس کی رفتار بہت سست ہے۔شراب اور جوئے پر پابندی اور سود کے خلاف جو قانون اسمبلی میں پیش کیے گئے ہیں ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔لیکن سماجی سطح پر ہمیں کامیابی ہو رہی ہے اور اگر اس سطح پر اسلامی آگے بڑھتا ہے تو ہمیں سیاسی سطح پر کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ ملک بتدریج انقلاب کے ذریعہ اسلامی ہو جائے گا۔ہم جنوب کے لیے علاقائی خود مختاری کا مطالبہ کرنے والے پہلے لوگ تھے۔سوڈان میں ہم نے سیکولرازم کو ختم کر دیا ہے۔لیکن صرف نمیری ہمارے حامی ہیں ورنہ حکومت میں اسلامی عناصر بہت کم ہیں۔انصار کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ صادق الہدی کیوں حکومت میں شامل ہوئے تھے اور کیمپ ڈیوڈ کے معاہدہ کی وجہ سے کیوں الگ ہو گئے۔بہر حال اس معاملے میں سوڈان کھل کر مصر کی تائید نہیں کرسکتا کیونکہ ہم سعودی عرب کی امداد کے محتاج ہیں۔'' ڈاکٹر حسن ترابی نے آخر میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''اگر حکومت نے اسلام کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کیا تو ہم انقلاب لائیں گے۔''[1] سوڈان ان چند ملکوں میں شامل

(۱) ماہنامہ مڈل ایسٹ (انگریزی) ۱۹۷۶ء

ہے جہاں حکومت کی اجازت سے غیر سودی بنکوں کے لیے کام شروع کر دیا ہے۔

تعمیر و ترقی

سوڈان رقبہ کے لحاظ سے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ ملک کا رقبہ نو لاکھ ۶۷ ہزار مربع میل (۲۵ لاکھ مربع کلومیٹر) ہے اور ۱۹۷۳ء کے تخمینہ کے مطابق آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ ہے۔ دارالحکومت خرطوم کی آبادی پانچ لاکھ ہے۔ ام درمان جو دریائے نیل کے دوسرے کنارے پر خرطوم کے بالمقابل واقع ہے دوسرا بڑا شہر ہے۔ پورٹ سوڈان سب سے بڑا بندرگاہ ہے جس کی آبادی سوا لاکھ کے قریب ہے۔

سوڈان کا شمالی حصہ جو ملک کے تین چوتھائی حصہ پر مشتمل ہے صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کا صرف وہ حصہ زیر کاشت ہے جو دریائے نیل اور دریائے نیل ازرق کی نہروں سے سیراب ہوتا ہے یا جو جنوبی علاقے سے متصل ہے۔ ملک کی بیشتر زرعی پیداوار اس حصہ میں ہوتی ہے اور یہی علاقہ مویشی بانی کا مرکز ہے۔ جنوب کا علاقہ جنگلوں اور دلدلوں پر مشتمل ہے۔ نیل ابیض، نیل ازرق اور دریائے اتبارہ کی وادیاں انتہائی زرخیز ہیں۔ ان دریاؤں پر بند باندھ کر مصر کی طرح وسیع علاقے کو سیراب کیا جاتا ہے۔ نیل ابیض اور نیل ازرق کا درمیانی علاقہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ دارالحکومت خرطوم اسی میں واقع ہے۔ جزیرہ جدید ترین کاشت کا اہم مرکز ہے۔ یہاں ۱۹۲۶ء سے جزیرہ زرعی اسکیم زیر عمل ہے جس کے تحت رقبہ زیر کاشت اب بیس لاکھ ایکڑ تک پھیل گیا ہے۔ دریائے اتبارا پر خشم الجربہ کے مقام پر جو بند آزادی کے بعد تعمیر کیا گیا ہے اس سے تین لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے۔ اتبارہ اور نیل ازرق پر دو نئے بند زیر تعمیر ہیں۔

سوڈان اسلامی دنیا کے ان ملکوں میں سے ہے جس میں زرعی ترقی کے امکانات وسیع ہیں۔ پورے ملک میں بیس کروڑ ایکڑ زمین قابل کاشت[1] ہے۔ لیکن اس میں صرف نو فیصدی رقبہ زیر کاشت ہے۔ سوڈان میں زراعت کی توسیع کے سب سے زیادہ امکانات جنوبی علاقہ میں ہیں جہاں دس کروڑ ایکڑ قابل کاشت زمین میں صرف چالیس لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے۔ یہاں

---

(۱) پاکستان میں پانچ کروڑ ایکڑ زمین زیر کاشت ہے جو سات کروڑ آبادی کی غذائی ضرورت پوری کرتی ہے۔ اس بات سے سوڈان کے زرعی ترقی کے امکانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ سوڈان کی آبادی دو کروڑ بھی نہیں ہے۔

دریائے نیل اور اس کے معاونوں کا جال بچھا ہوا ہے اور بارش بہت ہوتی ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ جنگلات کو صاف کر کے اور دلدلوں کو خشک کر کے یہاں زیادہ سے زیادہ زمین پر کاشت کی جائے۔ صدر نمیری سوڈان کو عرب دنیا کا غلہ گھر بنانا چاہتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ساری قابل کاشت زمین پر کاشت شروع ہو جائے تو سوڈان ساری دنیا کو غلہ فراہم کر سکتا ہے۔ جنوبی علاقے میں دو سو اسی کلومیٹر لمبی ایک نہر مصر کی مدد سے تعمیر کی جارہی ہے جس کا نام جونگلی (jonglei) نہر ہے۔ اس کی تعمیر سے نیل ابیض میں پانی کی روانی میں اضافہ ہو جائے گا اور جنوبی سوڈان کی دلدلوں کو خشک کیا جا سکے گا۔

سوڈان کی سب سے قیمتی زرعی پیداوار لمبے ریشے کی روئی ہے۔ سوڈان دنیا میں سب سے زیادہ گوند پیدا کرنے والا ملک ہے۔ مونگ پھلی اور روغنی تخم بھی اہم برآمدی فصل ہیں۔

سوڈان میں متعدد معدنیات پائی جاتی ہیں، لیکن ابھی تک ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں سولہ ہزار ٹن کرومیم لگایا گیا تھا۔ حال ہی میں جنوبی سوڈان میں پٹرول کے چشموں کا بھی پتہ چلا ہے، لیکن ابھی تیل نہیں نکالا جاتا۔ ملک میں تیل صاف کرنے کے دو کارخانے ہیں اور پورٹ سوڈان سے خرطوم تک کویت کی مالی مدد سے تیل کی پائپ لائن ڈالی جارہی ہے۔ صنعت ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ پارچہ بافی سب سے بڑی صنعت ہے۔ ۱۹۶۹ء کے انقلاب کے بعد سے کارخانے قومی ملکیت میں لے لیے گئے ہیں۔ اخبارات بھی قومی ملکیت میں ہیں۔ لیکن اب بیرونی سرمایہ حاصل کرنے کے لیے حکومت نے اپنی پالیسی بدل دی ہے۔

ملک کی چالیس فیصد آبادی عربی النسل ہے۔ مسلمانوں کا تناسب اسی فیصد ہے۔ عیسائی صرف چار لاکھ ہیں۔ باقی مظاہر پرست ہیں۔ شخصی قوانین کے لیے اسلامی عدالتیں قائم ہیں۔ سرکاری زبان عربی ہے۔

سوڈان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت ہے۔ خواندگی کی شرح بیس فیصدی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں طلبہ کی تعداد چودہ لاکھ تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ خرطوم یونیورسٹی ہے۔ اس کے علاوہ قاہرہ یونیورسٹی کی ایک شاخ خرطوم میں قائم ہے۔ ام درمان میں دینی علوم کی یونیورسٹی ہے۔

سوڈان کے نو صوبوں میں سے شمال کے چھ صوبوں کی آبادی تقریباً سب مسلمان ہے۔ لیکن جنوب کے تین صوبوں (۱) بالائی نیل (۲) بحر الغزال (۳) اور صوبہ خط استوا کی بیشتر آبادی مظاہر پرست ہے۔ مسلمان اور عیسائی یہاں بہت کم ہیں، لیکن غیر مسلموں کی قیادت عیسائی رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ غیر مسلم آبادی کے یہ صوبے سوڈان کے لیے ایک نازک مسئلہ بن گئے ہیں۔

نقشے میں اوپر کے ہندسے صوبوں کے رقبہ کو مربع میل میں ظاہر کرتے ہیں اور نیچے کے ہندسے صوبوں کی آبادی کو۔

مشرقی افریقہ

مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد حبش میں آباد ہے جہاں کی دو کروڑ بیس لاکھ آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۴۳ فیصدی سے پچاس فیصدی تک تخمینہ کیا گیا ہے۔ حبش میں ہرار، روسی اور اریٹیریا کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور صوبہ وُلّو کی بھی آدھی آبادی مسلمان ہے۔

صومالیہ اور فرانسیسی صومالی لینڈ کی آبادی تقریباً تمام کی تمام مسلمان ہے اور کینیا کا شمال مشرقی صوبہ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اور وہاں کے باشندے نسلاً صومالی ہیں۔

اکسوم وہ شہر ہے جو عہد رسالت میں حبش کا دار الحکومت تھا اور جہاں مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

مشرقی افریقہ میں
مسلم اکثریت کے علاقے
جبوتی
عدیس ابابا
ہرار
بربرا
صوبہ ہرار (حبش)
سوڈان
شمال
مشرقی
صوبہ
کینیا
کینیا
مقدیشو
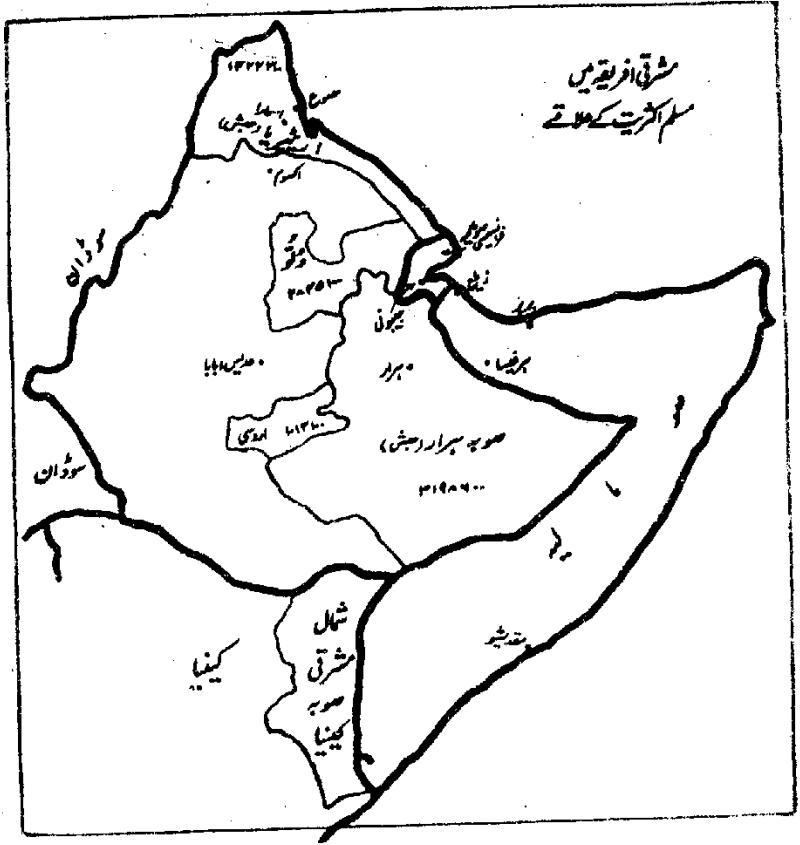
باب ۴۲

صومالیہ کی ڈیموکریٹک جمہوریہ

صومالیہ، مشرقی افریقہ کے اس حصے میں واقع ہے جس کو جغرافیہ کی ایک اصطلاح میں قرن افریقہ یا افریقہ کا سینگ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل گینڈے کے سینگ سے بہت مشابہ ہے۔ صومالیہ کی تاریخ سلطنت زنج اور قدیم حبش کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ حبش کے مشہور مجاہد حکمراں احمد جران [1] نسلاً صومالی تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں صومالیہ کے مختلف حصوں پر مغربی قوموں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک حصہ پر برطانیہ اور ایک حصے پر فرانس قابض ہوگیا اور انہوں نے اپنے اپنے مقبوضات کو برطانوی صومالی لینڈ اور فرانسیسی صومالی لینڈ کے نام دیے۔ ۱۸۸۷ء میں صومالیہ کے باقی حصے پر اٹلی نے قبضہ کرلیا اور اس کو اطالوی صومالی لینڈ کا نام دیا۔ یہ علاقے دوسری عالمی جنگ تک ان یورپی قوموں کے قبضے میں رہے۔ جنگ کے دوران اٹلی نے ۱۹۴۰ء میں برطانوی صومالی پر قبضہ کرلیا، لیکن برطانوی فوجوں نے جوابی حملہ کرکے ۱۹۴۱ء میں اپنا علاقہ بھی لے لیا اور اطالوی صومالی لینڈ پر بھی قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ ۱۹۵۰ء تک برقرار رہا۔ اٹلی کی نئی حکومت جنگ کے بعد اطالوی صومالی لینڈ سے دست بردار ہوگئی لیکن اقوام متحدہ نے ۲۱۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو اطالوی صومالی لینڈ کو آزادی حاصل کرنے تک اپنی تولیت میں لے لیا، لیکن اس کا انتظام ۲ دسمبر ۱۹۵۰ء کو اطالوی حکومت کے سپرد کردیا۔ ۲۹۔ فروری ۱۹۵۶ء کو نوتشکیل یافتہ مجلس قانون ساز کے انتخابات ہوئے جن میں ستر نشستوں میں سے ۴۳ نشستوں پر حریت پسند صومالی نوجوانوں کی لیگ نے قبضہ کرلیا۔ اس دوران میں برطانوی صومالی لینڈ میں بھی حکومت خوداختیاری کی طرف قدم اٹھایا جارہا تھا اور برطانیہ نے ۲۶۔ جون ۱۹۶۰ء کو برطانوی صومالی لینڈ کو آزادی دے دی جس کے بعد برطانوی صومالی لینڈ اور اطالوی صومالی لینڈ نے ایک دوسرے میں ضم ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اس طرح آزاد صومالیہ کی موجودہ مملکت یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو وجود میں آگئی۔

---

(۱) سلطنت زنج اور حبش کی قدیم تاریخ کے لیے دیکھئے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب نہم اور ۳۵

آئین کے تحت صومالیہ میں پارلیمانی نظام قائم کیا گیا جس میں وزیر اعظم کا تقرر صدر کرتا تھا۔ صومالیہ کے پہلے صدر عدن عبداللہ عثمانی تھے۔ جنوبی صومالی لینڈ یعنی سابق برطانوی صومالی لینڈ کی سب سے بااثر جماعتیں صومالی قومی کانگریس اور صومالی ڈیموکریٹک یونین تھیں۔

صومالیہ کے تعلقات شروع ہی سے اپنے دو پڑوسی ملکوں حبش اور کینیا سے کشیدہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صومالی باشندوں میں جو قومی تحریک کام کر رہی ہے اس کا مقصد صومالی نسل کے تمام باشندوں کو متحد کرنا ہے۔ ان صومالی باشندوں کی ایک اچھی خاصی تعداد صومالیہ سے باہر حبش اور کینیا میں آباد ہے۔ حبش کے صوبے ہرار کی اور کینیا کے شمال مغربی صوبہ کی تقریباً تمام آبادی صومالی نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے اور صومالیہ ان صوبوں کا اپنے ملک سے الحاق کرنا چاہتا ہے۔ صومالی لینڈ کی تمام جماعتیں اس معاملے میں متحد تھیں۔ اس کے علاوہ فرانسیسی صومالی لینڈ پر بھی جو اس وقت تک آزاد نہیں ہوا تھا صومالیہ اپنے حق کا دعویدار تھا۔ حبش کے صومالی باشندوں کی تحریک آزادی کی حوصلہ افزائی کرنے پر کینیا اور حبش کے درمیان کشیدگی یہاں تک بڑھی کہ ۱۹۶۳ء میں کینیا اور صومالیہ کے درمیان سفارتی تعلقات ختم ہو گئے اور ۱۹۶۴ء میں حبش اور صومالیہ کے درمیان سرحدی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد صدر عدن عبداللہ عثمان نے اس معاملے کو پُرامن طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو جب کہ عبدالرشید علی شرمارکے صومالیہ کے صدر تھے فوج اور پولیس نے قانونی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ پارلیمنٹ اور عدالت عالیہ کو توڑ دیا گیا اور آئین معطل کر دیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتوں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد سے ایک اعلیٰ انقلابی کونسل جس کے سربراہ میجر جنرل محمد سیاد برے (Siad Barre) (پیدائش ۱۹۱۲ء) ہیں صومالیہ پر حکومت کر رہی ہے۔

انقلابی حکومت

نئی حکومت نے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد بدعنوانیوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔ مئی ۱۹۷۰ء میں کئی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ۱۹۷۲ء میں تمام مدرسے بھی قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر جنرل محمد سیاد برے نے

صومالیہ کو ایک سوشلسٹ ریاست قرار دیا۔ روس اور چین کی امداد کا خیر مقدم کیا گیا اور ان ملکوں کے اثرات سے صومالیہ کو ایک سوشلسٹ ریاست قرار دیا۔ روس اور چین کی امداد کا خیر مقدم کیا گیا اور ان ملکوں کے اثرات صومالیہ میں بڑھنے لگے۔ چین نے بارہ سو میل لمبی سڑکیں تعمیر کرنے اور سگریٹ اور ماچس کے کارخانے لگانے کی ذمہ داری قبول کی۔ جولائی ۱۹۷۴ء میں روس سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا گیا۔ اور بندرگاہ بربرہ میں روسی بحریہ کو سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ۱۹۷۴ء میں صومالیہ کو عرب لیگ نے رکن بنا کر اس کو ایک عرب ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔

ابتدائی سالوں میں حکومت نے کئی ایسے اقدامات بھی کیے جن کو مخالف مذہب کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۶ء میں حکومت پر تنقید کرنے کے جرم میں کئی علماء کو قتل کرا دیا۔ وراثت کے شرعی قوانین میں تبدیلیاں کیں اور دارالحکومت مقدیشو میں اسلامی یکجہتی کے انسٹی ٹیوٹ کو بند کر دیا۔ لیکن ان کارروائیوں کے ساتھ ہی اسی زمانے میں سعودی عرب کا تعاون حاصل کیا اور سعودی حکومت نے اسی لاکھ ڈالر کے خرچ سے مقدیشو میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جو مشرقی افریقہ کی سب سے شاندار مسجد ہے۔ ۱۹۷۶ء کے اوائل میں جنرل سیاد برے نے صومالی انقلابی یونین کی پہلی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے یہ عجیب و غریب بات کہی کہ اسلام اور سائنٹیفک سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں۔ انہوں نے کہا:

"اسلام اور سائنٹیفک سوشلزم کے گہرے مطالعہ کے بعد صومالیہ کے انقلابی رہنما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام اور سائنٹیفک سوشلزم ایک دوسرے سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں اور جو لوگ ان دونوں میں لڑائی چاہتے ہیں اور غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ نہ اسلام میں مخلص ہیں اور نہ سائنٹیفک سوشلزم میں مخلص ہیں۔ اہل صومالیہ روس کے بہت ممنون ہیں اور اس کی امداد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ موجودہ دوستی دونوں ملکوں کے ترقی پسندانہ نظریہ پر مبنی ہے۔"

صومالیہ کو جلد ہی مصر اور بعض دوسرے ملکوں کی طرح روس اور سوشلسٹ ملکوں کی ترقی پسندی اور دوستی کے خلوص کا اندازہ ہو گیا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں حبش میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد روس نے صومالیہ کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اس کی ہمدردیاں حبش سے ہو گئیں۔ روس نے حبش کے صومالی علاقہ کی آزادی کے لیے صومالیہ سے تعاون کرنے کی بجائے حبش، اریٹیریا اور

صومالیہ کی وفاقی یونین قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے صدر سیاد برے نے رد کر دیا۔

حبش سے تنازعہ

حبش میں اور غادن کی سطح مرتفع پر جو صومالیہ سے ملحق ہے دس لاکھ صومالی مسلمان آباد ہیں جو صدیوں سے حبشی مظالم کا شکار ہیں اور ہر قسم کی آزادی سے محروم ہیں۔ صومالیہ والے اس علاقہ کو مغربی صومالیہ کہتے ہیں۔ سیاد برے خود بھی اوغادن کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں یہاں کے مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد شروع کر دی کہ یہاں کے حریت پسند رہنما عبد اللہی حسن محمود نے اعلان کیا کہ ''ہم حبش کا علاقہ لینا نہیں چاہتے بلکہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ صدر برے نے بھی اس موقع پر اعلان کیا کہ ''صومالیہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حبش صومالیہ کے علاقہ پر قابض رہے اور حبش کو سوشلسٹ کہلائے جانے کا مستحق بننے کے لیے صومالی باشندوں کا حق خود اختیاری تسلیم کر لینا چاہیے۔'' اس کے بعد صدر برے نے حریت پسندوں کی مدد کے لیے اپنی فوجیں حبش میں داخل کر دیں اور انہوں نے حبشی فوجوں کو شکست دے کر اوغادن پر قبضہ کر لیا اور شہر ہرار کا محاصرہ کر لیا۔ روس نے صومالیہ اور حبش کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے پہلے تو صومالیہ، اری ٹیریا اور حبش پر مشتمل ایک وفاقی یونین قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور جب صومالیہ نے یہ تجویز رد کر دی تو حبش کی کھل کر مدد کرنا شروع کر دی۔ افریقہ کے سوشلسٹ ملکوں نے بھی اپنے سوشلسٹ حلیف کی کوئی مدد نہیں کی کیونکہ وہ سوشلسٹ ہونے کے ساتھ ایک مسلمان ملک بھی تھا حتیٰ کہ جنوبی یمن کے کمیونسٹ حکمرانوں نے جو صومالیہ کے پڑوسی تھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے انہوں نے بھی صومالیہ کی مدد نہیں کی بلکہ حبش تک روسی سامان جنگ پہنچانے میں روسی طیاروں کو سہولتیں فراہم کیں۔ امریکہ سے صومالیہ کے تعلقات پہلے ہی خراب ہو چکے تھے اس لیے اُدھر سے مدد کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اب جب سوشلسٹ بھائیوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں تو صومالیہ تنہا رہ گیا۔ حبش نے روسی ہتھیاروں اور کیوبا کے سپاہیوں کی مدد سے جلد ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ ہزاروں لوگوں نے جیبوتی اور صومالیہ میں پناہ لی۔ صومالیہ کی ۳۲ ہزار فوج جو افریقہ کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی تھی آٹھ ماہ کی جنگ میں پوری طرح تباہ ہو گئی۔ ٹینک اور طیارے بھی تباہ ہو گئے۔ صدر سیاد برے نے ۱۵۔ مارچ ۱۹۷۸ء کو اوغادن سے فوجیں واپس بلانے کا اعلان

کر دیا اور ۲۴۔ مارچ کو حبش نے اعلان کیا کہ وہ پورے صوبہ ادعادن پر قابض ہو چکا ہے۔
۹۔ اپریل ۸ے۱۹۷ء کو صدر سیاد برے کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی لیکن ناکام رہی۔
معلوم نہیں اب سیاد برے کا سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں کیا خیال ہے لیکن اپنے سوشلسٹ رفیقوں کی بے وفائی کے بعد انہوں نے اسلامی ممالک کی طرف رُخ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور افغانستان میں روسی جارحیت کے بعد یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صومالیہ اپنے ملک میں امریکہ کو فوجی اڈہ دینے کو تیار ہے۔

تعمیر و ترقی

صومالیہ کا بیشتر حصہ ریگستانی میدانوں اور خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ حبش سے متصل پہاڑی علاقوں میں بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس سطح مرتفع پر مویشی بانی کا خاص پیشہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی ٹھنڈی اور صحت بخش ہے۔ زراعت صرف ان علاقوں میں ہوتی ہے جہاں بارش کافی ہے یا پھر دیبی شبیلی اور جوبا نامی دریاؤں کی وادی میں ہوتی ہے۔ ان دریاؤں کے دونوں کناروں پر ایک سو میل سے زیادہ لمبی زرخیز زمین کی پٹی ہے جو چند سو گز سے لے کر چار میل تک چوڑی ہے۔ ملک کا سب سے زرخیز حصہ یہی ہے اور اطالویوں نے اپنے زمان میں ان وادیوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار ایکڑ پر گنے کیلیے اور مکئی کی کاشت شروع کی تھی اور اس وقت یہی چیزیں ملک کی اہم زرعی پیداوار ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں جب زبردست قحط پڑا تھا زرعی ترقی کے پروگرام میں تیس ہزار طلبہ اور رضا کاروں نے حصہ لیا اور ایک لاکھ بیس ہزار خانہ بدوشوں کو جن کے مویشی مر گئے تھے جنوب میں آباد کیا گیا۔ ملک کی ستر فیصد برآمد مویشیوں اور ڈیری کی مصنوعات پر مشتمل ہے۔ ابوظہبی اور عرب ملکوں کی مدد سے جوبا کی وسطی وادی میں آٹھ کروڑ اسی لاکھ پونڈ کی مدد سے گنے کی کاشت اور شکر سازی کا ایک منصوبہ مکمل کیا جا رہا ہے جو صومالیہ کا سب سے بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے۔ اس منصوبہ کی تکمیل پر ۱۹۸۱ء سے چالیس ہزار ٹن شکر سالانہ تیار ہونے لگے گی۔ ساحلی سمندر میں مچھلیوں کی کثرت ہے اس لیے ماہی گیری کے کاروبار کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ روس نے اس میں امداد فراہم کی ہے۔
معدنیات میں ٹن، جپسم، یورے نیم اور لوہے کے معمولی ذخیروں کا پتہ چلا ہے۔ شکر،

سیمنٹ اور تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم کرنے کے منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں۔

صومالیہ میں ریلیں نہیں ہیں اور سڑکیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ اب چین اور عالمی بنک کی مدد سے سڑکوں کو وسیع پیمانے پر تعمیر کیا جا رہا ہے اور بندرگاہ مقدیشو کو ترقی دی جا رہی ہے۔

قومی زبان صومالی ہے اور سرکاری زبانیں عربی، انگریزی اور اطالوی ہیں۔ صومالی زبان کا اب تک کوئی رسم الخط نہیں تھا، ۱۹۷۲ء میں لاطینی حروف پر مبنی رسم الخط اختیار کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ خواندگی کا تناسب چند سال پہلے تک دس فیصد تھا۔ اب تعلیم کو تیزی سے ترقی دی جا رہی ہے جس کی وجہ سے خواندگی کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے۔ مقدیشو یونیورسٹی میں ۱۹۷۰ء میں طلبہ کی تعداد صرف ۳۳۷ تھی اب ان کی تعداد دو ہزار آٹھ سو ہو گئی ہے۔

صومالیہ کا رقبہ دو لاکھ ۴۶ ہزار مربع میل (۶ لاکھ ۳۸ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۶ء) ۳۲ لاکھ ہے۔ دارالحکومت مقدیشو کی آبادی ۱۹۷۳ء میں ساڑھے تین لاکھ تھی۔ ہرغیہ اور کسمایو اور بربرہ دوسرے اہم شہر ہیں۔ ہرغیہ چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک خوش آب و ہوا شہر ہے۔ تاریخی شہر زیلع بھی جہاں عہد قدیم میں کئی بلند پایہ عالم پیدا ہوئے صومالیہ میں واقع ہے۔

باب ۳۳

جمہوریۂ جیبوتی

جیبوتی خلیج عدن کے شمال مغربی کنارہ پر صومالیہ اور اری ٹیریا کے درمیان واقع ہے۔ پہلے اس کو فرانسیسی صومالی لینڈ کہتے تھے۔ فرانس نے اس علاقہ پر انیسویں صدی کے آخر میں اس زمانے میں قبضہ کیا تھا جب برطانیہ اور فرانس نے صومالی لینڈ کے دوسرے حصوں پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ۱۸۹۶ء کا سال تھا۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو فرانس نے جیبوتی کا درجہ ''آبادی'' سے بڑھا کر ''علاقہ'' کا کردیا اور اندرونی خود مختاری دے دی اور ایک مجلس قانون ساز قائم کردی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں جب صومالیہ آزاد ہوگیا اور اس نے جیبوتی کا صومالیہ سے الحاق کا دعویٰ کیا کیونکہ یہاں کی نصف سے کچھ زیادہ آبادی صومالی ہے۔ حبش بھی جیبوتی کا دعویدار تھا کیونکہ اری ٹیریا کے الحاق سے پہلے جیبوتی حبش کے لیے واحد بندرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ تو صومالیہ اور حبش کے دعووں کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ جیبوتی کے حبشی النسل باشندوں کی ایک بڑی تعداد آزادی کے حق میں تھی جیبوتی کئی سال تک آزادی حاصل نہ کرسکا۔ جیبوتی کے رہنماؤں کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر جیبوتی بالکل آزاد ہوگیا تو اس پر حبش یا صومالیہ قبضہ کرلیں گے اس لیے وہاں کی حکومت نے ۱۹۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو استصواب رائے کے بعد اپنا آئینی تعلق فرانس سے قائم کرلیا اس پر جیبوتی میں شدید ہنگامے ہوئے اور وہاں کے صومالی باشندوں نے مکمل آزادی اور صومالیہ سے الحاق کا مطالبہ کیا۔

فرانس سے اس نئے تعلق کے بعد جیبوتی کو فرانسیسی پارلیمنٹ میں نمائندگی مل گئی اور جیبوتی کا نام فرانسیسی صومالی لینڈ سے بدل کر افارس اور اساس (Issas) کا فرانسیسی علاقہ ہوگیا۔ ۱۹۷۳ء میں سیاسی جماعت اتحاد و ترقی نے انتخابات میں کامیابی حاصل کی جو فرانس سے الحاق کی حامی تھی۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں پارلیمنٹ کے صدر علی عارف برہان آزادی کے حامی ہوگئے اور پارٹی کا نصب العین بھی بدل گیا۔ ۱۹۷۶ء کے استصواب رائے عامہ میں اکثریت نے آزادی کی حمایت کی۔ اس کے بعد حبش اور صومالیہ اپنے اپنے مطالبوں سے دست بردار ہوگئے اور جیبوتی کی آزادی کا

حق تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ۲۷۔ جون ۱۹۷۷ء کو جیبوتی آزاد ہو گیا اور اقوام متحدہ اور عرب لیگ کا ممبر بنا لیا گیا۔ آزادی کے بعد ملک کا نام جیبوتی رکھا گیا۔

حسن (Gouled) پیدائش ۱۹۱۶ء جو جیبوتی کی آزادی کے معمار ہیں پہلے صدر منتخب ہوئے۔ وہ صومالیہ اور عربوں کے حامی ہیں۔ سعودی عرب سے گہرا تعلق ہے۔ ان کی کوششوں سے جیبوتی عرب لیگ میں شامل ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں جب صومالیہ اور حبش کے درمیان لڑائی ہوئی تو صدر حسن نے واضح طور پر اعلان کیا کہ جیبوتی ریلوے کے ذریعہ حبش کو اسلحہ نہیں بھیجا جائے گا۔ فرانس کے چار ہزار فوجی ابھی کچھ مدت جیبوتی میں مقیم رہیں گے۔

جیبوتی کا رقبہ آٹھ ہزار آٹھ سو مربع میل (۲۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ڈھائی تین لاکھ کے قریب ہے۔ نصف آبادی صومالی نسل سے ہے اور یہ قبائل اساس (Issas) کہلاتے ہیں۔ چھ سات فیصد باشندے عربی النسل ہیں اور باقی حبشی النسل قبائل سے تعلق رکھتے ہیں اور افارس (afars) کہلاتے ہیں۔ حبش میں ان ہی قبائل کو دناقیل کہا جاتا ہے۔ جیبوتی کے تمام باشندے مسلمان ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اساس اور افارس کی نمائندگی کرتی ہیں اور ملک کا اتحاد ان دونوں قبائل کے اتحاد سے وابستہ ہے۔

جیبوتی ایک بے آب و گیاہ مملکت ہے۔ گلہ بانی اور نمک نکالنا معاشی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ فی الحال فرانس کی اقتصادی امداد جیبوتی کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ باشندے خانہ بدوش ہیں۔

دارالحکومت کا نام جیبوتی ہے اور ملک کا نام بھی اسی شہر کے نام پر رکھا گیا ہے۔ حبش کے صدر مقام عدیس ابابا سے جیبوتی تک ریلوے لائن موجود ہے۔ اری ٹیریا کے الحاق سے پہلے جیبوتی حبش کی واحد بندرگاہ تھی اور اب بھی حبش کی ایک تہائی تجارت اسی بندرگاہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ شہر کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ جیبوتی کا ہوائی اڈہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

باب ۳۴

اری ٹیریا

کشمیر کی طرح اریٹریا بھی اسلامی دنیا کے ان علاقوں میں سے ہے جن کے مستقبل کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ اس خطے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ایک ہزار قبل مسیح میں اس علاقہ پر یمن کا قبضہ تھا۔ اس زمانہ میں مقامی حبل باشندے عربوں میں جذب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں اریٹریا پر حبش کا قبضہ ہوا جس کا صدر مقام سرحد کے قریب اکسوم کے مقام پر تھا۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں اریٹریا گوشۂ گمنامی میں چلا گیا اور یہ صورت اٹھارہویں صدی تک قائم رہی۔ اس دوران اری ٹیریا کی سطح مرتفع کے علاقہ پر کبھی کبھی حبش کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ ۱۵۵۷ء میں اریٹریا کا ساحلی علاقہ ترکوں اور پرتگالیوں کی کشمکش کا مرکز بن گیا اور ترکوں نے بندرگاہ مصوع فتح کرلیا جو ساڑھے تین سو سال تک ان کے پاس رہا۔ اسی زمانہ میں صومالی رہنما احمد جران کو عروج حاصل ہوا جس نے اریٹریا اور حبش کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۲۰ء میں محمد علی پاشا والی مصر کی فوجوں نے اریٹریا کے مغربی نشیبی حصوں پر قبضہ کرلیا۔ ترکوں نے بھی مصوع سے نکل کر اندرونی حصوں پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۶۵ء میں مصر نے باب عالی (سلطنت عثمانیہ) سے مصوع حاصل کرلیا۔ اس کے بعد مصریوں نے کیرن تک پہاڑی علاقہ فتح کرلیا اور کئی سال تک قابض رہے۔

۱۸۶۹ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان ایک اطالوی کمپنی نے اساب (assab) کے قریب مقامی سلطان سے زمین خریدی جسے ۱۸۸۲ء میں اطالوی حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد اٹلی پورے اریٹریا پر قابض ہو گیا اور یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو اریٹریا کی نوآبادی قائم کردی گئی۔ علاقہ کا نام ایک قدیم رومی نام (mare erythraeum) کے نام پر اریٹریا رکھا گیا۔ اٹلی کا قبضہ ۱۹۴۱ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد دوسری جنگ کے دوران برطانیہ اریٹریا پر قابض ہو گیا اور یہ قبضہ ۱۹۵۲ء تک قائم رہا۔ چونکہ علاقے کے مستقبل کے بارے میں بڑی طاقتیں کوئی فیصلہ نہ کرسکیں اس لیے متفقہ فیصلہ ہونے تک اریٹریا کا علاقہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۵۔ ستمبر ۱۹۵۲ء کو

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی تجویز کے مطابق بعض شرائط کے تحت اریٹریا حبش کے سپرد کر دیا گیا۔ ان شرائط کے تحت اریٹریا کی ایک خود مختار حکومت قائم کی گئی جس کو محاصل، مالیات اور پولیس کے شعبوں پر اختیار حاصل تھا۔ ایک علاقائی اسمبلی قائم کی گئی اور اریٹریا کو حبش کے وفاق کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ لیکن دس سال بعد ۱۴۔ نومبر کو ایک سازش کے تحت شرائط کی خلاف ورزی کی گئی اور حبش کی پارلیمنٹ اور اریٹریا کی اسمبلی نے اس وفاق کو ختم کر دیا اور اریٹریا کو حبش میں ضم کر دیا۔ اریٹریا کی آبادی میں مغربی ذرائع کے مطابق ۵۵ فیصد مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے دعوے کے مطابق یہ تناسب اور زیادہ ہے۔ ساحلی علاقہ، جنوبی اور مغربی علاقے سب مسلمان ہیں۔ صرف سطح مرتفع کے علاقہ میں عیسائی اکثریت ہے۔ حکومت حبش کے اس فیصلے کو اریٹریا کے مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا۔ عیسائیوں کے ایک حصہ نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ ۱۹۶۶ء میں یہاں کے مسلمانوں نے مسلح بغاوت شروع کر دی اور ۱۹۷۸ء تک وہ اریٹریا کے نوے فیصد حصہ پر قابض ہو چکے تھے، لیکن اس کے بعد روس اور کیوبا حبش کی مدد کو آ گئے اور حبش کی حکومت نے ۱۹۷۸ء کے وسط میں صومالیہ کے حملہ کو پسپا کرنے کے بعد اریٹریا کے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کو بھی کچل دیا۔

حریت پسند تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک اریٹریا کا لبریشن فرنٹ (ELF) ہے۔ دوسرا پیپلز لبریشن فرنٹ (EPLF) ہے۔ یہ بالترتیب عراق اور سوڈان کے زیر اثر ہیں۔ ایک تیسرا اور مختصر گروپ عثمان صالح کا ہے جس کی پشت پر سعودی عرب کی حکومت ہے۔ لیکن اب یہ حریت پسند صرف چھاپہ مار جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ میں ان کی تعداد ۴۵ ہزار تک ہو گئی تھی۔

اریٹریا کا رقبہ ½۴۵ ہزار مربع میل اور آبادی ۱۹۷۸ء میں اٹھارہ اور بیس لاکھ کے درمیان تھی۔ ملک کا بیشتر حصہ بنجر اور خشک ہے۔ صرف سطح مرتفع کا علاقہ جہاں صدر مقام اسمان (بلندی ۷۸۰۰ فٹ) اور کیرن (½۴ ہزار فٹ) واقع ہیں خوش آب و ہوا اور زرخیز ہے۔

المغرب العربی

۱۔لیبیا	۶ لاکھ ۷۹ ہزار مربع میل ۱۷ لاکھ ۵۹ ہزار مربع کلومیٹر	۲۶ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔تونس	۶۳ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۶۴ ہزار مربع کلومیٹر	۶۰ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔الجزائر	۹ لاکھ ۹۔ ہزار مربع میل ۲۴ لاکھ مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۸۰ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۴۔مراکش	۲ لاکھ ۴۷ ہزار مربع میل ۷ ½ لاکھ مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۸۲ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۵۔موریتانیا	۳ لاکھ ۹۷ ہزار مربع میل ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار مربع کلومیٹر	۱۵ لاکھ (۱۹۷۸ء)

نوٹ: مراکش (المغرب) کے رقبہ میں سابق ہسپانوی صحرا شامل ہے۔
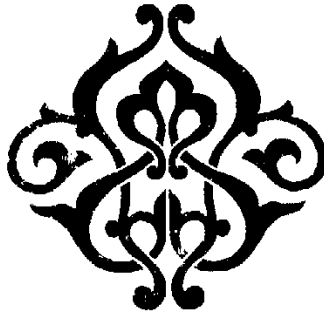
باب ۳۵

لیبیا

سنوسی تحریک کا گہوارہ

موجودہ صدی سے پہلے اسلامی دور میں لیبیا نام کا کوئی ملک نہیں تھا۔ موجودہ لیبیا کا نصف شمال مشرقی حصہ برقہ کہلاتا تھا۔ اور یہ علاقہ عام طور پر مصر کی حکومت کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ نصف شمال مغربی حصہ طرابلس کہلاتا تھا اور بالعموم تونس کی حکومت کے تحت ہوتا تھا۔ طرابلس پر تونس کی بالادستی حفصی دورتک قائم رہی، اگرچہ اس زمانے میں ۱۳۲۴ء تا ۱۴۰۰ء تک کی مدت میں یہاں بنی ثابت اور بنی عمار کی نیم خودمختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ بنی حفص کو جب زوال ہوا تو اسپین نے تونس اور طرابلس کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور ۱۵۱۰ء میں اسپینی حکمران فرڈیننڈ نے طرابلس فتح کر لیا اور اس کو مالٹا کے مسیحی نائیٹوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد عثمانی ترکوں نے ادھر کا رخ کیا اور ۱۵۵۱ء میں امیر البحر سنان پاشا نے طرابلس اور بنغازی کو عثمانی سلطنت کا ایک حصہ بنا دیا۔ تین سال بعد عثمانیوں نے لیبیا کے جنوبی حصے کو بھی جو صحرائے اعظم کا حصہ ہے اور فزان کہلاتا ہے، اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح وہ ملک وجود میں آیا جو اب تک لیبیا کہلاتا ہے۔ لیکن عثمانی سلطنت جب تک قائم رہی، اس سرزمین کو طرابلس کے نام ہی سے پکارا گیا۔ ۱۷۱۱ء سے ۱۸۳۵ء تک ایک نیم خودمختار ترک خاندان ''قرہ مانلی'' طرابلس پر حکمران رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ براہ راست مرکزی عثمانی حکومت کے تحت آ گیا۔

سنوسی تحریک

انیسویں صدی میں لیبیا کے جنوبی صحرائی علاقے میں سنوسی تحریک کا آغاز ہوا جس کے بانی سید محمد ابن علی سنوسی ۱۷۸۷ء تا ۱۸۵۹ء) تھے۔ محمد سنوسی الجزائر کے شہر مستغانم کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ قرآن حفظ کرنے اور ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فاس (مراکش) کی جامع قروئین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے مشرق کا رُخ کیا

لیکن قاہرہ کا ماحول ان کو موافق نہیں آیا۔ جامعہ ازہر کے علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ علاوہ ازیں ان کو والیٔ مصر علی کی اصلاحات بھی پسند نہ آئیں اور انہوں نے ان غیر اسلامی سرگرمیوں کی علانیہ مذمت کی۔ قاہرہ سے محمد سنوسی مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں ۱۸۳۷ء میں انہوں نے پہلا زاویہ قائم کیا بعد میں یہی زاویے یا حلقے سنوسی تحریک میں مرکزی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس قسم کے زاویے انہوں نے اپنے قیام کے دوران مختلف مقامات پر قائم کیے اور ان زاویوں سے انہوں نے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانا شروع کیا۔ آخر میں انہوں نے برقہ یا سائرینکا کے صحرا میں جغبوب کے نخلستان میں ۱۸۵۳ء میں اپنی دعوت کا مرکز قائم کیا اگرچہ بعد میں انہوں نے یہ مرکز جنوب میں کئی سو میل کے فاصلے پر نخلستان کفرہ میں منتقل کر دیا لیکن جغبوب کو بھی سنوسی تحریک میں ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا۔ سنوسی تحریک کا مقصد کتاب وسنت کی بنیاد پر عالم اسلام کا دینی احیاء تھا۔ وہ احمد بن حنبل، غزالی، ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب سے بہت متاثر تھے اور ان کی تحریک محمد بن عبدالوہاب کی ہمعصر نجدی تحریک سے بہت زیادہ مشابہ تھی۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے علاوہ محمد سنوسی نے صحرائے اعظم میں خانہ بدوشوں کی بستیاں آباد کرنے اور کھیتی باڑی شروع کرنے کی حوصلہ افزائی کی، دراصل سنوسیوں کی یہی بستیاں زاویہ کہلاتی تھیں۔ ہر زاویہ اقتصادی لحاظ سے خود کفیل ہوتا تھا۔ یہی زاویے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے مرکز بن گئے۔ سعودی عرب کے اخوان کی طرح سنوسی ایک ہی وقت میں مبلغ، معلم اور کسان تھے اور جب انہیں جہاد کی دعوت پہنچتی تو وہ میدان جنگ کا رُخ اختیار کر لیتے۔

سید محمد سنوسی کے صاحبزادے سید مہدی (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۲ء) کے زمانے میں سنوسی تحریک کی قوت اور اثر ونفوذ عروج پر پہنچ گیا۔ کفرہ نے ایک دارالعلوم کی شکل اختیار کر لی۔ وہاں کے کتب خانہ میں مختلف علوم کی آٹھ ہزار کتابیں تھیں۔ صحرائے اعظم میں کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرنا کچھ کم حیرت کی بات نہیں تھی۔ سنوسی مبلغوں کی تبلیغی کوششوں سے دنیا کے سب سے بڑے صحرا میں نہ صرف یہ کہ چوری، قتل و غارت اور دوسرے جرم ختم ہو گئے بلکہ صحرا کے جنوبی حصوں میں آباد سیاہ فام نسل کے باشندوں میں اسلام بھی پھیلا۔ سید محمد نے اپنے پیروؤں کی فوجی تربیت اور جنگی مشقوں کا انتظام بھی کیا اور اس طرح ان رضا کار مجاہدوں کی مدد سے وہ ایک وسیع عریض صحرائی سلطنت کے حکمران بن گئے۔

فرانس اور اٹلی سے تصادم

انیسویں صدی کے آخر میں جب فرانس نے مغربی افریقہ پر قبضہ کرنا چاہا تو سنوسیوں سے اس کا تصادم ہو گیا۔ سید مہدی کے انتقال کے وقت ان کے صاحبزادے سید محمد ادریس کی عمر صرف بارہ سال تھی، اس لیے تحریک کی قیادت ان کے چچا زاد بھائی سید احمد شریف (۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۳ء) نے سنبھالی۔ فرانس نے سنوسیوں کے خلاف ۱۹۰۲ء میں فوجی کاروائی شروع کی، سید احمد شریف دس سال تک فرانس کا مقابلہ کرتے رہے لیکن اس جنگ میں سنوسی تحریک کو نقصان پہنچا اور صحرائے اعظم کے جنوبی علاقوں میں اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔

فرانس سے جنگ ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سنوسیوں کا اٹلی سے تصادم ہو گیا، یہ حملہ شمال کی سمت سے لیبیا پر ہوا تھا۔ سنوسی اگرچہ لیبیا کی صحرائی زندگی پر چھائے ہوئے تھے لیکن لیبیا انتظامی لحاظ سے عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور ساحلی علاقوں اور شہروں میں ترکی حکومت مستحکم تھی۔ اطالوی باشندے کچھ عرصے سے ساحلی علاقوں میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے کاروباری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اٹلی نے اپنے سیاسی عزائم کو پورا کرنے کے لیے ان ہی اطالوی باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے بہانے سے لیبیا میں مداخلت شروع کر دی۔ یہ وہی طریقہ تھا جس پر برطانوی حکومت مصر میں اور فرانسیسی حکومت شمالی افریقہ میں عمل کر چکی تھی۔ اٹلی نے ۲۶۔ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور ۵، اکتوبر کو طرابلس پر قبضہ کر لیا۔

ترکوں کے لیے لیبیا میں جنگ جاری رکھنا بہت مشکل تھا۔ وہ سمندر کی راہ سے کوئی موثر کمک نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بلقان میں سورت حال سنگین ہو گئی تھی۔ اس لیے ترکوں نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اٹلی سے صلح کر لی اور لیبیا سے تمام فوجیں واپس بلانے کا وعدہ لیا۔ اس دوران میں سید احمد شریف کفرہ سے جغبوب آئے اور وہاں ترک رہنما انور پاشا سے ملاقات کی جو بھیس بدل کر مصر کے راستے لیبیا پہنچے تھے۔ اٹلی کو امید تھی کہ عربوں اور ترکوں کی نسلی کشمکش کی وجہ سے لیبیا کے عرب اٹلی والوں کا خیر مقدم کریں گے لیکن لیبیا کے حالات، شام، عراق اور حجاز سے مختلف تھے، یہاں سنوسی تحریک نے اسلامی اخوت کا رشتہ اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ نسلی اور علاقائی

مفادات اور تعصبات اس کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ لیبیا کے باشندوں نے سنوسی قیادت میں ترکوں کی بھرپور مدد کی اور قدم قدم پر اٹلی کا مقابلہ کیا۔

۱۹۱۴ء کے شروع تک بیشتر ترک فوجیں لیبیا سے واپس چلی گئی تھیں اس لیے اٹلی سے جنگ کا سارا بوجھ سنوسیوں کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس جنگ میں جواب لیبیا کی آزادی کی جنگ بن چکی تھی، سید احمد شریف کی قیادت میں سنوسیوں نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک اٹلی سے جنگ کی۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی اتحادیوں کی طرف سے جنگ عظیم میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے سنوسی مجاہدوں کا برطانیہ سے بھی ٹکراؤ ہو گیا اور فروری ۱۹۱۶ء میں برطانوی فوجوں نے حریت پسندوں کو شکست دے دی۔ سید احمد شریف اب لیبیا سے نکل کر نخلستان داخلہ (مصر) میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے جہاں سے ستمبر ۱۹۱۸ء میں وہ ترکی چلے گئے۔ یہ وہی سید احمد سنوسی [1] ہیں جو عرب قوم پرستوں کے مقابلے میں برابر ترکی خلافت کی تائید کرتے رہے۔

اب سنوسی تحریک کی قیادت سید محمد ادریس کے ہاتھ آ گئی۔ اٹلی اور محمد ادریس کے درمیان صلح کے مذاکرات شروع ہوئے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں اٹلی نے محمد ادریس کو صحرائی علاقوں میں سنوسی تحریک کا امیر تسلیم کر لیا لیکن اٹلی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ جس کی وجہ سے پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ اور محمد ادریس سنوسی کو دسمبر ۱۹۲۲ء میں مصر میں پناہ حاصل کرنی پڑی جہاں سے وہ سنوسیوں کی تحریک مزاحمت کی رہنمائی کرتے رہے۔

محمد ادریس کے مصر چلے جانے کے بعد مارچ ۱۹۲۳ء میں اٹلی نے لیبیا پر مکمل تسلط حاصل کرنے کی غرض سے ایک نئی مہم شروع کی۔ سنوسیوں نے حسب سابق ان جارحانہ کارروائیوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا۔ جنگ کا یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ اس جنگ میں سنوسی حریت پسندوں کی قیادت ایک اور سنوسی شیخ سدی عمر مختار نے کی۔ اس جنگ میں اٹلی کی فوجوں نے سخت ظلم وستم اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ سنوسی زاویے ڈھا دیے گئے، کنوؤں کو پاٹ دیا گیا، تاکہ مجاہد

---

(۱) ۱۹۱۰ء میں سید احمد شریف نے سید محمد سنوسی کو لیبیا میں سنوسی تحریک کی قیادت سونپی اور خود ترکی سے امداد لینے استنبول چلے گئے۔ لیکن اگلے سال ترکوں کو دوسری عالمی جنگ میں شکست ہو گئی۔ سید احمد شریف نے اب اتاترک کی حمایت کی۔ لیکن جب اتاترک کامیاب ہو گئے تو ان کی مغرب پرستانہ اصلاحات سے مایوس ہو کر سید احمد سنوسی ۱۹۲۳ء میں دمشق آ گئے۔ یہاں انہوں نے شام کو ترکی کے ساتھ متحد کرنے اور اسلامی اتحاد کے لیے جدوجہد کی۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں فرانس کی گرفتاری سے بچنے کے لیے سعودی عرب میں پناہ لینا پڑی اور وہیں بمقام مدینہ منورہ ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔

صحرا میں پیاس سے مر جائیں، جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور عمر مختار اور دوسرے رہنماؤں کو ہوائی جہاز میں اُوپر لے جا کر نیچے زمین پر پھینک دیا۔ اٹلی نے اپنے خیال میں ستر سالہ بوڑھے مجاہد کو ہلاک کر کے یہ سمجھ لیا کہ اب وہ اطمینان سے ہمیشہ کے لیے لیبیا پر حکومت کرے گا۔ لیکن آج طرابلس کی سب سے بڑی شاہراہ اس مردِ مجاہد کے نام پر شارع عمر مختار کہلاتی ہے۔ بہر حال ۱۹۳۳ء میں سنوسی تحریک کی مسلح مزاحمت ختم کر دی گئی۔

اطالوی دورِ حکومت

اطالوی دورِ حکومت میں دوسری یوروپی نوآبادیوں کی طرح اٹلی نے بھی اپنی نوآبادی لیبیا میں معاشی اور اقتصادی نوعیت کے کئی اہم کام انجام دیے۔ تقریباً ½۲ لاکھ نیم صحرائی زمین زیر کاشت لائی گئی۔ زیتون اور مختلف پھلوں کے درخت جن میں بادام، انگور اور لیموں قابل ذکر ہیں، ہزاروں ایکڑ پر لگائے گئے لیکن ہر یوروپی نوآبادی کی طرح اس معاشی اور زرعی ترقی سے اہل لیبیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اٹلی دراصل لیبیا کو ایک اطالوی ملک بنا دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے لاکھوں کی تعداد میں اطالوی لیبیا میں آباد کیے گئے۔ مقامی باشندوں سے زمینیں چھین کر ان کو دے دی گئیں۔ ساحل کی بہترین زمینوں پر اطالوی باشندوں نے قبضہ کر لیا۔ اور مقامی باشندوں کے لیے صحرائے اعظم چھوڑ دیا گیا۔ اطالوی آبادکاری کا یہ سلسلہ دوسری عالمی جنگ تک جاری رہا۔

جون ۱۹۴۰ء میں جب اٹلی نازی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہوا تو برطانیہ جو پہلی جنگ میں اٹلی کا حلیف تھا اب اٹلی کا حریف ہو گیا۔ امیر محمد ادریس نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے برطانیہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور لیبیا میں ہونے والی جنگ میں جرمنی اور اٹلی کے خلاف برطانوی فوجوں کی مدد کی۔ ۱۹۴۳ء میں جب جرمن سپہ سالار رومیل کو شکست ہو گئی تو لیبیا پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ طرابلس اور سائرے نیکا برطانیہ کے زیر انتظام آ گئے اور فزان پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ جون ۱۹۴۹ء کو برطانیہ نے محمد ادریس سنوسی کو سائرے نیکا کا امیر تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد لیبیا کی آزادی کے لیے گفت وشنید شروع ہوئی جس میں پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر نمایاں حصہ لیا۔ اس گفت وشنید کے نتیجے میں لیبیا کو طرابلس، سائرے نیکا اور فزان کے تین علاقوں پر مشتمل ایک وفاق قرار دیا گیا اور ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لیبیا کو ایک آزاد

مملکت قرار دے دیا گیا۔ طرابلس اور سائرے نیکا کے برطانوی ریزیڈنٹوں اور فزان کے فرانسیسی ریزیڈنٹ نے اپنے اپنے اختیارات لیبیا کی وفاقی حکومت کو منتقل کر دیے۔ محمد ادریس سنوسی اس نئی وفاقی مملکت کے بادشاہ تسلیم کیے گئے۔

آزادی کے بعد

لیبیا میں دستور ساز اور قانون ساز اسمبلی پہلے ہی قائم ہوگئی تھی جو ایک سنات (سینٹ) اور ایک ایوان نمائندگان پر مشتمل تھی۔ لیبیا کی نو آزاد مملکت کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ ان متعدد مسلمان ملکوں کی طرح جو حال ہی میں آزاد ہوئے تھے لیبیا کو ایک جمہوریہ میں تبدیل کر دیتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سنوسی سلسلے کی دینی روایات کے وارث ہونے کے باوجود ادریس سنوسی نے لیبیا میں دستوری بادشاہت قائم کردی۔ اور جس دن آزاد ہوا اسی دن دستور ساز اسمبلی نے بادشاہی نظام کے حق میں فیصلہ دے کر لیبیا کو موروثی بادشاہت قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ سنوسی تحریک اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک خانقاہی اور روایتی تحریک تھی جس میں اسلام کی سیاسی اور اجتماعی فکر سے واقفیت کا فقدان تھا۔

لیبیا نے ۲۹۔ جولائی ۱۹۵۳ء کو برطانیہ سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا۔ آزادی کے بعد ایک اہم مسئلہ ان فوجی اڈوں کا تھا جو برطانیہ اور امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں قائم کیے تھے۔ ان اڈوں کی موجودگی لیبیا کی آزادی کے لیے ایک خطرہ تھی۔ اس لیے لیبیا کی آزادی کے فوراً بعد ہی ان اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ آخر کار ۹۔ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ایک معاہدہ کے تحت امریکی اور برطانوی اڈوں کو مالی امداد کے عوض کچھ مدت قائم رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ فرانس نے بھی ۱۰۔ اگست ۱۹۵۵ء کو ایک معاہدہ کے بعد اپنی فوجیں فزان کے صحرائی علاقے سے واپس بلالیں۔ ۲۷۔ اپریل ۱۹۶۳ء کو شاہ ادریس نے وفاقی نظام ختم کر دیا اور پورے ملک میں وحدانی طرز کی مرکزی حکومت قائم کر کے ملک کو دس انتظامی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔

آزادی کے ابتدائی سالوں میں لیبیا کی معاشی، تعلیمی اور سماجی ترقی کے کاموں کی رفتار بہت سست رہی۔ ملک کے وسائل محدود تھے، ملک کا بڑا حصہ صحرائے اعظم کا ایک حصہ تھا جس کی وجہ سے وسعت میں پاکستان سے دوگنا ہونے کے باوجود آبادی صرف پندرہ لاکھ تھی۔ لیکن

میں وحدانی طرز کی مرکزی حکومت قائم کر کے ملک کو دس انتظامی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔

آزادی کے ابتدائی سالوں میں لیبیا کی معاشی، تعلیمی اور سماجی ترقی کے کاموں کی رفتار بہت سست رہی۔ ملک کے وسائل محدود تھے، ملک کا بڑا حصہ صحرائے اعظم کا ایک حصہ تھا جس کی وجہ سے وسعت میں پاکستان سے دوگنا ہونے کے باوجود آبادی صرف پندرہ لاکھ تھی۔ لیکن ۱۹۵۷ء کے بعد صحرائے اعظم کے علاقے میں تیل کی دریافت سے لیبیا کی معیشت میں ویسا ہی انقلاب آ گیا جیسا کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں آیا ہے۔ ۱۹۶۱ء سے تیل برآمد ہونا شروع ہو گیا اور ملک ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۸ء کے درمیان اس قابل ہو گیا کہ ملک کی ستر فیصد آمدنی ترقیاتی کاموں پر صرف ہونے لگی۔ سینکڑوں مدرسے تعمیر کیے گئے اور طلبہ کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ کر ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ مکانات، شفا خانے، بجلی گھر اور سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں فی کس آمدنی صرف چالیس ڈالر تھی لیکن ۱۹۶۵ء میں چار سو پچیس ڈالر ہو گئی۔ ۱۹۵۱ء میں میزانیہ ستر لاکھ پونڈ تھی۔ ۱۹۶۵ء میں ½ ۳۴ کروڑ پونڈ ہو گیا اور لیبیا اسلامی دنیا میں تیل پیدا کرنے والا چوتھا بڑا ملک بن گیا۔ بنغازی اور طرابلس میں دو یونیورٹیاں قائم کی گئیں اور البیضا میں محمد بن علی اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اب ملک برطانیہ اور امریکہ کی مالی امداد کا محتاج نہیں رہا، اس لیے فوجی اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا، لیکن ابھی مذاکرات جاری تھے کہ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو جب کہ شاہ ادریس یونان کے دورے پر تھے فوج نے بغاوت کر کے شاہی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور لیبیا کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ شاہ ادریس کے زمانہ میں ہوئی تھی اور لیبیا اگرچہ مصر کا حلیف تھا لیکن اس نے پہلی جنگ میں زیادہ فعال حصہ نہیں لیا، لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس نے سعودی عرب اور کویت کے ساتھ مل کر مصر کو مالی امداد فراہم کی۔

فوجی انقلاب اور صدر قذافی

لیبیا کا فوجی انقلاب بھی عراق، شام، مصر اور سوڈان کی طرح ایک فوجی گروہ نے برپا کیا تھا جس کے سربراہ معمر قذافی تھے۔ عراق اور شام کے مقابلے میں یہ انقلاب مصر اور سوڈان کے فوجی انقلاب سے زیادہ مشابہ تھا، کیونکہ لیبیا کے انقلابی فوجی افسر بعث پارٹی کی قسم کی کسی نظریاتی پارٹی

لیبیا کے فوجی انقلاب کے بانی معمر قذافی ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق چونکہ بربروں کے ایک قبیلے قذافہ سے ہے اس لیے وہ قذافی کہلاتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے لیبیا یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈپلوما لیا۔ اس کے بعد انہوں نے بنغاری کی فوجی اکادمی میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۶۵ء میں ان کو کمیشن ملا۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ اگست ۱۹۶۹ء میں وہ کپتان بنادیے گئے۔ قذافی شروع سے انقلابی خیالات رکھتے تھے اور عربوں کی قومی تحریک سے ان کو دلچسپی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب کہ وہ طالب علم تھے انہوں نے اسرائیل کی جارحیت کے خلاف اور صدر ناصر کے حق میں مظاہروں میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی اور شاہ ادریس کو جنہیں وہ برطانیہ کا ایجنٹ سمجھتے تھے اقتدار سے بیدخل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو قذافی اور ان کے ساتھیوں نے طرابلس اور بنغازی میں جو لیبیا کے دوسرے دارالحکومت تھے، بہ یک وقت کاروائی کی۔ ان کے تمام ساتھیوں کی عمر بیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ بنغازی ریڈیو پر قذافی نے خود قبضہ کیا۔ انقلاب کے بعد انہوں نے لیبیا کو جمہوریہ بنادیا اور شاہ ادریس تخت سے دست بردار ہو گئے۔

قذافی نے جنوری ۱۹۷۰ء میں وزیراعظم کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا، لیکن جولائی ۱۹۷۲ء میں یہ عہدہ عبدالسلام جلود کے سپرد کردیا اور خود صدر ہو گئے۔

صدر قذافی جو شراب، جوئے، تمباکو، نائٹ کلب اور جنسی عیاشی سے کامل پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا دامن ان اخلاقی کمزوریوں اور عیوب سے داغدار نہیں جن میں اس دور کا حکمران طبقہ عام طور پر ملوث پایا جاتا ہے۔

صدر قذافی نے برسر اقتدار آنے کے بعد لیبیا کی پُرسکون زندگی میں ہل چل پیدا کردی اور انہوں نے داخلی اور خارجی میدانوں میں مسلسل جرأت مندانہ اقدامات کیے۔ ان کے دور میں لیبیا نے پہلی مرتبہ دنیائے عرب اور اسلامی دنیا کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ تیل کی وافر آمدنی نے لیبیا کی اقتصادی حالت مضبوط کردی تھی اس لیے صدر قذافی کو اپنی پالیسیوں پر موثر طریقہ پر عمل درآمد کرنے کا موقع ملا۔

صدر قذافی نے اصلاحات کا آغاز مختلف اداروں کو قومی ملکیت میں لے کر کیا۔ ملک میں صنعتیں تو تھی نہیں اس لیے بعض تیل کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور بعض میں حکومت

شریک ہوگئی۔ اسی طرح بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی قومی ملکیت میں لے لی گئیں۔ اس کے بعد صدر قذافی نے برطانوی اور امریکی فوجی اڈوں کو خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۰ء میں برطانیہ نے اپنا اڈہ خالی کر دیا، تین ماہ بعد امریکہ نے بھی اپنا مشہور وہلیس (Wheelus) کا اڈہ بھی خالی کر دیا۔ وہیلس کے اڈہ کو تحویل میں لینے کے بعد صدر قذافی نے اس کا نام لیبیا اور شمالی افریقہ کے پہلے مسلمان فاتح کے نام پر ''عقبہ بن نافع'' مستقر رکھ دیا۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں اطالوی آباد کاروں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور جب اطالوی باشندے لیبیا چھوڑ کر چلے گئے تو طرابلس کے بڑے گرجے کو مسجد میں تبدیل کر کے اس کا نام جامع جمال عبدالناصر رکھا۔ اس کے علاوہ صدر قذافی نے تیل کمپنیوں پر دباؤ ڈال کر ان میں ستمبر ۱۹۷۳ء میں لیبیا کا حصہ اکاون فیصدی مقرر کرایا۔ ۱۹۷۲ء میں لیبیا نے روس سے معاہدہ کیا اور تیل کے معاوضہ میں اسلحہ حاصل کیا۔ اس طرح قذافی نے مختصر مدت میں لیبیا کو بیرونی اثرات سے آزاد کرا لیا۔

صدر قذافی نے غیر قانونی سیاسی سرگرمیوں، ہڑتالوں اور غلط خبروں کی اشاعت میں سخت سزائیں نافذ کیں حتیٰ کہ ان معاملات میں موت کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے چین کے ثقافتی انقلاب کے نمونے پر لیبیا ثقافتی انقلاب کا آغاز کیا، لیکن اس کا مقصد ملک بھر میں کمیونسٹ انقلاب لانا نہیں بلکہ اسلامی انقلاب لانا تھا۔ اس مقصد کے لیے چار سو کمیٹیاں بنائی گئیں، کمیونزم اور سرمایہ داری اور الحاد کے خلاف مہم چلائی گئی اور ان سے متعلق کتابیں جلائی گئیں۔

فلسطین کے معاملہ میں لیبیا ان عرب ملکوں کے ساتھ ہے جو اسرائیل کے مقابلہ میں زیادہ سخت اقدامات کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ستمبر ۱۹۷۵ء میں مصر نے اسرائیل سے تصفیہ کر کے نہر سویز کو کھولنے کا فیصلہ کیا تو صدر قذافی نے اس کو ناپسند کیا اور مصر کی مالی امداد بند کر دی۔ صدر قذافی اس بات پر بھی ناراض ہوئے کہ صدر سادات نے اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ان سے مشورہ کیے بغیر اسرائیل سے جنگ کیوں شروع کر دی۔ ۱۹۷۹ء میں مصر نے کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کے نتیجے میں جب اسرائیل سے تصفیہ کیا اور تعلقات بحال کیے تو صدر قذافی نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔

آزادی کی تحریکوں کی حمایت

صدر قذافی اتحاد عرب اور اتحاد اسلام کے علمبردار ہیں۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں جب شام، مصر

اور لیبیا کا وفاق قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو انہوں نے اس میں گہری دلچسپی لی اور جب یہ ناکام ہوگیا تو انہوں نے اگست ۱۹۷۲ء میں مصر سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت یہ قرار پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۷۳ء تک مصر اور لیبیا ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ اتحاد بھی ناکام رہا۔ اس کے بعد انہوں نے جنوری ۱۹۷۴ء میں تونس سے اتحاد کی کوشش کی۔ لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ان دونوں اتحادوں کی ناکامی کی ایک وجہ جہاں یہ تھی کہ مصر اور تونس کا برسرِاقتدار معاشرہ اتنا مغرب زدہ ہوگیا ہے کہ وہ لیبیا کے اسلامی ثقافتی انقلاب کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ وہاں اس کی ناکامی کی دوسری وجہ صدر قذافی کی ضرورت سے زیادہ تیز رفتاری اور ان کی تلون مزاجی اور ان کی جلد بازی بھی تھی۔ جمال ناصر کی طرح صدر قذافی کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بھی دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ بادشاہوں کا تختہ الٹنا اور دوسرے ملکوں میں اپنی مرضی چلانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہ کام مقصد کے لحاظ سے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن دوراندیشی سے خالی ہے اور بداعتمادی کا باعث بنتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عین اس وقت جب وہ لیبیا اور مصر کو متحد کرنے کی کوشش کر رہے تھے اسی زمانہ میں وہ صدر سادات کا تختہ پلٹنے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں نے مراکش کے شاہ حسن کے خلاف بغاوت میں باغیوں کی مدد کی اور آج کل وہ صحرا کے معاملے میں مراکش کے خلاف صف آرا ہیں۔ انہوں نے سوڈان میں صدر نمیری کے خلاف صادق المہدی کی مدد کر کے سوڈان پر حملہ کرایا اور فلسطینی چھاپہ ماروں کی مدد سے اُردن میں شاہ حسین کا تختہ پلٹنے کی کوشش کی اور ۱۹۷۷ء میں مصر کے خلاف فوجی کاروائی کرنے میں مصروف تھے کہ صدر سادات نے پیشگی کاروائی کر کے لیبیا کے سرحدی مورچوں کو تباہ کر دیا۔

صدر قذافی نے چاڈ کے مسلمانوں کی مدد کی تاکہ وہ عیسائی اقلیت کے تسلط سے آزاد ہو سکیں۔ فلپائن میں مورو مسلمانوں کی آزادی کی جنگ میں انہوں نے اسلحہ اور رقم دونوں سے مدد کی۔ ہندوستان نے ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان پر حملہ کیا تو صدر قذافی نے پاکستان کی پُرزور حمایت کی۔ انہوں نے یوگنڈہ کے صدر عیدی امین کو آمادہ کیا کہ وہ اسرائیلیوں کو ملک سے نکال دیں۔ اور شمالی آئرلینڈ میں وہاں کی ریپبلکن فوج کی اور امریکہ میں جنگ پسند سیاہ فام باشندوں کی مدد کی۔

اس میں شک نہیں کہ صدر قذافی کی اس پالیسی کا مقصد مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی بیخ کنی کرنا ہے۔ لیکن ساری دنیا کا دارغہ بننا بھی بڑا ناعاقبت اندیشانہ اور خطرناک کھیل ہے۔ اسلامی

ملکوں میں خاص طور اس پالیسی کو اپنانا ان میں اتحاد پیدا کرنے کی بجائے افترا کا بھی باعث ہوسکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ سوڈان میں انہوں نے نمیری کی مخالفت کر کے اور صادق المہدی کی مدد کر کے یقیناً اسلامی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی۔ لیکن مصر سے تصادم دونوں ملکوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اربوں روپے کا اسلحہ جو دشمن کے خلاف استعمال ہوسکتا تھا اس تصادم میں مسلمانوں ہی کے خلاف استعمال ہو کر تباہ ہوا۔ صحرا کے جھگڑے میں ایک فریق بن کر اور پالیساریوں کمیونسٹوں کی مدد کر کے وہ ایک دوسرے مسلمان ملک (مراکش) کو کمزور کر رہے ہیں اور اری ٹیریا کی جنگ آزادی میں انہوں نے حبش کی مدد کر کے کمیونسٹوں کے ہاتھ مضبوط کئے۔ ان کی پالیسیاں دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کی بجائے تضاد، ناتجربہ کاری اور جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔

لیبیا میں اسلام

لیبیا میں ۱۹۶۹ء کے انقلاب کے بعد سے کوئی قومی اسمبلی نہیں۔ عرب سوشلسٹ یونین جو ۱۹۷۱ء میں قائم کی گئی تھی ملک کی واحد سیاسی پارٹی ہے۔ صدر قذافی اپنی اصلاحات کو سوشلزم کا نام دیتے ہیں، لیکن یہ سوشلزم دوسرے عرب ملکوں کے سوشلزم سے مختلف ہے اور اس میں مارکس، لینن اور ماؤ کے افکار کا غلبہ اور مرعوبیت نہیں پائی جاتی۔ لیبیا میں سوشلزم کا لفظ بڑی حد تک نام اور اصطلاح تک محدود ہے ورنہ قوت محرکہ اسلام ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا کی خارجہ پالیسی بین الاقوامی کمیونزم یا سوشلزم سے وابستہ نہیں اور صدر قذافی کمیونزم اور الحاد کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں لیبیا کی عمومی عوامی کانگریس نے چار نکاتی اعلان کیا ہے جو مختصر یہ ہے:

۱۔ لیبیا کا سرکاری نام الجماھیریۃ العربیۃ اللیبیۃ الشعبیۃ الاشتراکیہ یعنی لیبیا کی عرب عوامی سوشلسٹ جمہوریہ ہوگا۔

۲۔ قرآن ضابطہ حیات ہوگا۔

۳۔ سیاسی نظام کی بنیاد عوام کے براہ راست اقتدار پر ہوگی۔

۴۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو لازمی فوجی تعلیم دی جائے گی۔

اگرچہ اس اعلان میں اللہ کی بجائے عوام کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی قرآن کو ضابطہ حیات قرار دے کر اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لیبیا میں شراب نوشی اور شراب کی خرید و فروخت پر مکمل پابندی ہے۔ لباس میں خواتین کے لیے ستر چھپانا لازمی ہے۔ خواتین میں چادر کا استعمال عام ہے۔ قمار پر پابندی ہے۔ ملک میں چوری بہت کم ہے۔ لوگ جرائم پیشہ نہیں، اشیاء میں ملاوٹ نہیں کی جاتی اور لوٹ کھسوٹ نہیں۔ اگرچہ اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ لیبیا میں مغربی اثرات زیادہ نہیں پہنچے تھے اور سنوسی تحریک کے زیر اثر لوگوں میں اسلام سے وابستگی پائی جاتی ہے لیکن اس میں صدر قذافی کی کوششوں کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ حکومت اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے، جہاد فنڈ قائم ہے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے اور البیضاء میں ایک اسلامی انسٹی ٹیوٹ موجود ہے۔ ان اداروں کی طرف سے دنیا بھر کے مسلمان طلبہ، ماہرین اور علماء کی کانفرنسیں بلائی جاتی ہیں۔ لیبیا میں اسلامی فکر رکھنے والے دانشوروں میں مفتی لیبیا شیخ طاہر الزاوی، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس علی منصور اور شریعت کالج کے ڈین شیخ ابراہیم رفیدہ کے نام نمایاں ہیں۔

تعمیر و ترقی

تیل نکلنے کے بعد سے لیبیا کی معیشت میں انقلاب آ گیا ہے۔ اس وقت لیبیا دنیا میں گیارہواں اور اسلامی دنیا میں آٹھواں سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک اور افریقہ میں فی کس آمدنی سب سے زیادہ لیبیا کی ہے۔ تیل سے ہونے والی اس کثیر دولت کو اندرون ملک ترقی کے کاموں میں بھی صرف کیا جاتا ہے اور کم ترقی یافتہ ممالک کی مالی امداد پر بھی صرف کیا جاتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ عمدہ سڑک بنا دی گئی ہے۔ دارالحکومت طرابلس کو ریل کے ذریعہ تونس کے شہر سفاری سے ملایا جا رہا ہے۔ جس کے بعد طرابلس سے مراکش تک ریل سے سفر کیا جا سکے گا۔ طرابلس میں بین الاقوامی ہوائی اڈے ہیں اور دونوں شہروں کے بندرگاہوں کو جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ طبی سہولتیں مفت ہیں۔ بنغازی اور طرابلس میں دو بڑے ہسپتال ہیں۔ قومی بیمہ اسکیم بھی زیر غور ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ زراعت، فن تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے اعلیٰ درس گاہیں موجود ہیں۔ طرابلس اور بنغازی میں یونیورسٹیاں ہیں اور بنغازی کے قریب البیضا میں اعلیٰ تعلیم کا دینی مدرسہ ہے۔

لیبیا ابھی صنعتی لحاظ سے پسماندہ ملک ہے۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے اور کیمیاوی کھاد کا ایک کارخانہ موجود ہے۔ ترکی، کویت اور پاکستان کے تعاون سے ملک میں صنعتی ترقی کے منصوبوں کو شروع کیا گیا ہے۔ لیبیا، کویت اور ترکی نے مل کر ایک عرب ترکی بنک ۱۹۷۷ء میں قائم کیا ہے۔ پاکستان سے بھی اس قسم کا ایک معاہدہ ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا جس کی تفصیلات ۱۹۷۸ء میں طے کی گئیں۔ اس منصوبے کے تحت دونوں ملک ایک ارب ڈالر کی رقم سے پاکستان میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کو شروع کر رہے ہیں۔ مشترکہ جہاز رانی کمپنی، کھاد کے کارخانے اور شکر کے کارخانے کا قیام اس منصوبے میں شامل ہے۔ تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں نے اسلامی دنیا اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی مدد کے لیے اسلامی بنک، عرب بنک برائے ترقی افریقہ، افریقی عرب فنی امداد کا فنڈ اور خصوصی فنڈ برائے افریقہ کے نام سے جو امدادی ادارے قائم کیے ہیں لیبیا ان سب میں شریک ہے۔ لیبیا اپنی دولت کا ایک حصہ افریقہ کے قحط زدہ ملکوں کی امداد اور ساری دنیا میں انقلابی تحریکوں کی مدد پر بھی صرف کر رہا ہے۔

لیبیا کی آبادی تمام مسلمان ہے اور عرب اور بربر نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ زبان عربی ہے۔ یوروپی آبادکار عیسائی تھے جو آزادی کے بعد اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔
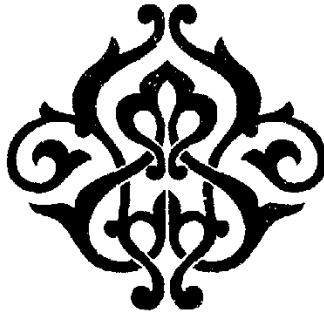
باب ۳۶

جمہوریہ تونس

شمالی افریقہ کی تاریخ میں جن ملکوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں ایک تونس بھی ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس حیثیت سے سوائے مراکش کے کوئی دوسرا ملک تونس کا حریف نہیں۔
تونس خلافت راشدہ کے زمانے ہی میں اسلامی اقتدار کے تحت آ گیا تھا۔ دوسری صدی ہجری کے وسط تک یہ علاقہ جو اس وقت افریقیہ کہلاتا تھا، براہ راست مرکز خلافت کے تحت رہا۔ اس کے بعد یہاں اغالبہ یعنی خاندان بنو اغلب (۸۰۰ء/ ۱۸۴ھ تا ۹۰۰ء/ ۲۹۶ھ کی حکومت قائم ہوگئی جو خلافت عباسیہ کی بالادستی تسلیم کرتی تھی۔ صقلیہ اور جنوبی اٹلی تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پھیلانے کا فخر اسی خاندان کو حاصل ہے جس کے دور میں مسلمان بحیرہ روم کی سب سے بڑی طاقت بن گئے تھے۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں بنو فاطمہ (۹۰۹ء/ ۲۹۶ھ تا ۱۱۷۱ء/ ۵۶۷ھ) نے اغلبی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور تونس کو بغداد کے مرکز خلافت سے کاٹ دیا، کیونکہ فاطمی شیعی عقائد رکھتے تھے اور عباسی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ فاطمی خلافت کے کمزور پڑنے پر یہاں صنہاجی (۹۷۳ء/ ۳۶۳ھ تا ۱۱۴۸ء/ ۵۴۳ھ) خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ خاندان نسلاً بربر تھا اور عقائد کے لحاظ سے سنی۔ صنہاجی خاندان کے دور میں اگرچہ علمی اور تمدنی لحاظ سے ترقی ہوئی، لیکن تونس کی خوشحالی اور وہاں کی تہذیب پر پہلی تباہ کن ضرب بھی اسی دور میں لگی۔ عرب خانہ بدوشوں کے کچھ قبائل جو بنو ہلال سے تعلق رکھتے تھے اور جن کو مصر کے فاطمی حکمرانوں نے مغرب کی طرف دھکیل دیا تھا۔ انہوں نے افریقہ میں داخل ہو کر بڑی تباہی پھیلائی، اور وہاں کے سب سے بڑے علمی اور تمدنی مرکز شہر قیروان کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد جب صنہاجی خاندان کا زوال ہوا تو جزیرہ صقلیہ سے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نارمن باشندوں نے نکل کر افریقہ کے علاقے میں تباہی اور بربادی پھیلائی اور یہاں کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو اپنا باجگذار بنالیا۔ چھٹی صدی ہجری میں موحدین (۱۱۴۸ء/ ۵۴۳ھ تا ۱۲۲۸ء/ ۶۲۵ھ) نے یہاں کے

مسلمانوں کو نارمنوں سے نجات دلائی اور افریقہ کو خلافت موحدین کا ایک حصہ بنالیا۔

موحدین کے بعد یہاں بنوحفص (۱۲۲۸ء/ ۶۲۵ھ تا ۱۵۳۸ء/ ۹۴۱ھ) کی حکومت قائم ہوئی جو موحدین ہی کی ایک شاخ تھی۔ اب تک افریقہ کا سب سے بڑا سیاسی، تمدنی، اور علمی مرکز قیروان کا شہر تھا۔ لیکن بنوحفص کے زمانے میں دارالحکومت تونس کو عروج حاصل ہوا جو جلد ہی اسلامی دنیا کا ایک بڑا تمدنی اور علمی مرکز بن گیا۔ تونس کا موجودہ ملک اسی شہر کے نام پر تونس کہلاتا ہے۔ بنوحفص کا دَور تونس کی قدیم تاریخ کا آخری شاندار دَور تھا۔ اس کے بعد تونس کا سیاسی، تمدنی اور علمی زوال شروع ہوگیا۔ تونس کی اسلامی تاریخ کے ابتدائی نصف دَور میں یہاں جو عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں امام سحنون (۷۷۶ء تا ۸۸۵ء) جنہوں نے فقہ مالکی کی سب سے جامع کتاب مدونہ مرتب کی اور ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) جو فلسفہ تاریخ کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ سب سے نمایاں اور مشہور ہیں۔

تونس عثمانی صوبہ کی حیثیت سے

۱۵۳۴ء میں تونس کو مشہور عثمانی امیر البحر خیر الدین پاشا نے فتح کرلیا۔ لیکن حفصی سلطان مولائے حسن نے اگلے سال اسپین کے شہنشاہ چارلس پنجم کی مدد سے پھر تونس پر قبضہ کرلیا۔ عثمانیوں اور حفصی حکومت کے درمیان یہ کشمکش جاری رہی یہاں تک کہ ۱۵۷۴ء میں تونس پر ترکوں نے مستقل طور پر قبضہ کرلیا افریقہ کے اس ملک پر ترکوں کی یہ بالادستی ۱۸۸۱ء میں فرانس کے غلبہ تک قائم رہی۔ شروع میں استنبول سے گورنر مقرر ہوکر آتے رہے۔ لیکن ۱۵۹۰ء سے ینی چری فوجی خود اپنے گورنر مقرر کرنے لگے جو دائے یا وے کہلاتے تھے۔ باب عالی کی بالادستی اب بھی قائم رہی لیکن تونس اندرونی معاملات میں بڑی حد تک آزاد ہوگیا۔ ۱۶۴۰ء سے باب عالی کی یہ بالادستی برائے نام رہ گئی اور ۱۶۷۰ء تا ۱۸۰۴ء مراد بے اور اس کی اولاد آزاد حکومت کرتی رہی۔ یہ نئے حکمران دائے کی بجائے بائے یا بے کہلاتے تھے۔ ۱۷۱۰ء میں حسین بے نے ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی جو ۱۹۵۷ء میں تونس کے جمہوریہ بننے تک برسراقتدار رہا۔

فرانسیسی دور

انیسویں صدی میں مصر اور تونس کے سیاسی حالات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ تونس

بھی اس صدی میں تقریباً ان ہی حالات سے گزرا جس سے مصر گزر رہا تھا۔ خیرالدین پاشا کے چلے جانے کے بعد تونس کے حالات اور ابتر ہوگئے۔ مصر کی طرح تونس بھی بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان قرضوں کے بہانے تونس میں بیرونی مداخلت شروع ہوگئی تھی۔ قرضوں کی ادائیگی کے لیے جب بہت زیادہ ٹیکس لگائے گئے تو ملک میں حکومت کے خلاف بے چینی پیدا ہوگئی اور اس عوامی بے چینی سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے فرانس نے فوجی مداخلت کی اور ۱۲۔ مئی ۱۸۸۱ء کو تونس کی حکومت کو قصر السعید کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا، جس کے تحت تونس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دے دیا گیا۔

فرانس کے فوجی تسلط کے بعد تونس کے سیاسی، انتظامی اور معاشی ڈھانچے میں اسی قسم کی تبدیلیاں کی گئیں جو مصر میں انگریزوں نے کی تھیں۔ بے کی حکومت قائم رکھی گئی۔ لیکن یہ حکومت بے دست و پا تھی اور صرف نمائشی حیثیت رکھتی تھی۔ حقیقی حکمران فرانسیسی ریزیڈنٹ جنرل تھا۔ فرانس نے انتظامی اور مالی ڈھانچے میں مفید تبدیلیاں کیں۔ ریلیں، سڑکیں اور بندرگاہیں تعمیر کیں، جدید مدارس قائم کیے گئے اور ہسپتال تعمیر کیے گئے، باغبانی اور کاشت کاری کو جدید طرز پر فروغ دیا گیا، جس سے تونس کی زرعی پیداوار بڑھ گئی۔ کان کنی کی طرف بھی توجہ دی گئی، اور فاسفیٹ بڑی مقدار میں نکالا جانے لگا۔ لیکن تونس میں فرانس کی پالیسی ایک لحاظ سے مصر میں انگریزوں کی پالیسی سے مختلف تھی۔ مصر میں انگریز باشندوں کو آباد نہیں کیا گیا لیکن تونس کو فرانس نے حقیقی معنوں میں ایک فرانسیسی نو آبادی بنا لیا تھا۔ فرانسیسی کثیر تعداد میں آکر آباد ہوگئے۔ انہوں نے تمام اچھی اچھی زمینیں خرید لیں اور ملک کی تجارت اور صنعت پر قابض ہوگئے۔ تونس میں زراعت اور باغبانی کو جس قدر فروغ ہوا، اس سے بھی فائدہ فرانسیسی باشندوں کو پہنچا۔ مقامی باشندے ان تمام نعمتوں سے محروم رہے۔ فرانسیسی اقتدار کے آخری دنوں میں یعنی بیسویں صدی کے وسط میں تونس میں فرانسیسی آبادکاروں کی تعداد کل آبادی کا دس فیصد ہوگئی تھیں۔ شہروں میں ان کی تعداد تقریباً نصف یا اس سے زیادہ تھی جس کی وجہ سے تونس کے شہر ایک مشرقی ملک سے زیادہ فرانس کے شہر نظر آنے لگے۔

قومی تحریک کا آغاز

فرانس کے سیاسی غلبے اور معاشی اور سماجی لوٹ کھسوٹ نے تونس میں قومی تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۰۷ء میں نیک تونسی پارٹی کے قیام سے ہوا۔ اس جماعت کے رہنماؤں نے اپنے معاملات خود سنبھالنے کے حق کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں حزب دستور قائم ہوئی اور اس نے پہلی مرتبہ مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ حزب دستور کے رہنماؤں میں سب سے نمایاں نام شیخ عبدالعزیز ثعالبی (پیدائش ۱۸۷۹ء) کا ہے۔ وہ تونس کے مشہور دینی مدرسے زیتونیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ بعد میں انہوں نے مدرسہ خلدونیہ میں جو صادقیہ کے طرز پر قائم کیا گیا تھا جدید تعلیم حاصل کی وہ سبیل الرشاد نامی ایک رسالے کے مدیر بھی تھے جس کو تحریک آزادی کے فروغ اور احیائے اسلام میں اہم مقام حاصل تھا۔ حزب دستور کی تشکیل اس نئے طبقہ نے کی تھی جس نے فرانس کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی اور اس کا طریق کار مصر کی حزب الامۃ کی طرح تھا۔ ثعالبی جو دینی بنیاد پر کام کرنا چاہتے تھے، حزب دستور کے پروگرام سے متعلق نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے آزادی کی خاطر نہ صرف حزب دستور سے تعاون کیا بلکہ اس کی قیادت سنبھالی۔ اسلام پسند اور مغرب زدہ عناصر کا یہ اتحاد زیادہ مدت قائم نہ رہ سکا تھا۔ اور نوجوان طبقہ مغربی نظریات سے متاثر تھا اس لیے ان کے اور قدیم قیادت کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ ۱۹۳۴ء میں جدید تعلیم یافتہ طبقے نے نو دستور یا حزب دستور جدیدہ کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم [1] قائم کر لی۔ اس نئی جماعت کے قائد حبیب بورقیبہ تھے جو اس وقت نہ صرف نو دستور کے سربراہ ہیں بلکہ جمہوریہ تونس کے صدر بھی ہیں۔

---

(۱) ثعالبی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک پیرس میں جلاوطن رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں وہ مشرق وسطیٰ چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ وطن واپس آئے۔ ان کی اس غیر حاضری کے زمانے میں پرانے رہنما عضو معطل بنے رہے جس کی وجہ سے قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ثعالبی دو کتابوں کے مصنف تھے ایک کتاب ''قرآن کی روح'' سے متعلق ہے اور فرانسیسی زبان میں ہے اور دوسری تونس الشمیدۃ ہے جو تونس کی ۱۹۱۹ء تک سیاسی تاریخ ہے۔ جنگ کے بعد ثعالبی نے پیرس امن کانفرنس میں ولسن سے ملاقات کی کوشش کی تھی لیکن ولسن سے توقعات پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے اس کتاب میں اپنے تاثرات لکھے۔

حبیب بورقیبہ

حبیب بورقیبہ ۳۔ اگست ۱۹۰۳ء کو شہر مناستر میں پیدا ہوئے۔ صادقیہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیرس چلے گئے جہاں قانون اور علم السیاست کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں حزب دستور جدید قائم و نے پر وہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، لیکن اسی سال یہ جماعت خلافِ قانون قرار دے دی گئی اور حبیب بورقیبہ کو جزیرہ جربہ اور صحرائے اعظم کے ایک گوشہ میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ دن بعد وہ رہا ہو گئے لیکن ۱۹۳۸ء میں پھر گرفتار کر لیے گئے۔ جنگ کے زمانے میں بورقیبہ فرانس میں نظر بند تھے۔ جب جرمنوں کا فرانس پر قبضہ ہوا تو ۱۹۴۲ء میں ان کو رہا کر کے روم بھیج دیا گیا۔ محوری طاقتوں نے حبیب بورقیبہ سے اپنے حق میں کام لینا چاہا لیکن انہوں نے ان کی حمایت میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۴۳ء میں بورقیبہ کو تونس آنے کی اجازت مل گئی۔ اس زمانے میں تونس میں جنگ کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے تھے۔ اور ۱۹۴۳ء میں فرانس کی آزاد حکومت نے جرمنوں سے تعاون کے الزام میں تونس کے حکمران مصنف بے کو علیحدہ کر دیا۔ حبیب بورقیبہ بھی بھیس بدل کر مصر چلے گئے اور چھ سال تک مشرقِ وسطیٰ، ایشیا اور امریکہ کے دورے کرتے رہے اور تونس کی آزادی کے لیے عالمی رائے عامہ ہموار کی۔

حبیب بورقیبہ ۱۹۵۱ء میں تونس واپس آ گئے لیکن اگلے سال پھر گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۵۴ء تک نظر بند رہے۔ اس دوران میں تونس کے اندر آزادی کی تحریک پوری قوت سے جاری رہی اور ڈھائی سال تک ملک میں ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ آخر کار جولائی ۱۹۵۴ء میں فرانس نے تونس کی آزادی کا حق تسلیم کر لیا۔ یکم جون ۱۹۵۵ء کو بورقیبہ اپنے وطن واپس آ گئے اور ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسی ماہ نو دستور پارٹی نے اپنی حکومت بنائی لیکن بورقیبہ نے جب تک مارچ ۱۹۵۶ء میں تونس کو آزادی نہیں مل گئی، وزیر اعظم کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۲۰۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو تونس آزاد ہو گیا اور بورقیبہ پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

آزادی کے بعد

۵۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو تونس کی مجلس دستور ساز نے بادشاہت ختم کر دی۔ تونس کو جمہوریہ قرار

دے دیا گیا۔ اور ملک کے لیے امریکی طرز کا صدارتی آئین اختیار کیا گیا۔ اور حبیب بورقیبہ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ۸۔ نومبر ۱۹۵۹ء اور ۸۔ نومبر ۱۹۶۴ء کو پھر صدر منتخب کیے گئے۔ اس کے بعد سے وہ ہر پانچ سال کے بعد صدر منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں اور اس وقت بھی وہی صدر ہیں۔ ان کو تاحیات صدر رکھنے کے لیے آئین میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ ۸۔ نومبر ۱۹۵۹ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور اسمبلی کی تمام نشستوں پر نو دستور پارٹی کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت سے اب تک تونس میں نو دستور پارٹی ہی برسراقتدار ہے۔

تونس کی آزادی مل جانے کے بعد بھی بندرگاہ بزرقا میں فرانس کا بحری اور بری فوج کا اڈا قائم تھا۔ اس اڈے کی موجودگی ملک کی آزادی میں مداخلت تھی اس لیے ملک میں یہ مطالبات زور پکڑتے گئے کہ بزرقا کے اڈے کو فرانس تونس کے سپرد کر دے۔ ۶۲۔ ۱۹۶۱ء میں یہاں سے فرانس کو بے دخل کرنے کے لیے ویسی ہی مہم چلائی گئی جیسی ۱۹۵۱ء میں مصریوں نے سویز سے انگریزی فوج کو بے دخل کرنے کے لیے چلائی تھی۔ تونس کے رضا کاروں نے اڈے پر مسلسل حملے کیے۔ یہاں تک کہ فرانس نے اس زبردست قومی مطالبہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور دسمبر ۱۹۶۳ء کو یہ اڈہ تونس کے سپرد کر دیا گیا۔

تونس عرب لیگ کا رکن ہے اور شمالی افریقہ کے عرب ملکوں کے درمیان قریب ترین اتحاد کا علمبردار ہے۔ حبیب بورقیبہ نے شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں کی طرح اسلامی اتحاد سے بھی گہری دلچسپی لی ہے۔ حبیب بورقیبا گرچہ سوشلزم کے علمبردار ہیں لیکن ان کی پالیسی رُوس یا چین نواز نہیں ہے، بلکہ مغرب نواز ہے۔ تمام سوشلسٹ ملکوں کی طرح یہاں بھی صرف ایک پارٹی کی حکومت ہے۔ ملک میں نو دستور کے علاوہ کوئی دوسری سیاسی جماعت قائم نہیں ہوسکتی۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ ۱۹۳۴ء میں نو دستور پارٹی کی تشکیل کے بعد تونس کی سیاست میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو جنھوں نے مغربی انداز پر تعلیم پائی تھی، غلبہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے تونس کی تحریک آزادی میں علمائے دین کا نمایاں ہاتھ تھا جن کے سرکردہ شیخ عبدالعزیز ثعالبی تھے اس جگہ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فرانس نے نہ صرف تونس میں بلکہ شمالی اور مغربی افریقہ کے تمام مقبوضات میں اسلامی علوم اور عربی زبان کی ترقی میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں اور صرف ان لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا جو فرانسیسی کلچر کو اپنا لیتے

تھے۔ فرانس کی ان پابندیوں کی وجہ سے مقامی طور پر ہر ملک میں سیاست میں وہی لوگ نمایاں ہو سکے جنہوں نے فرانسیسی کلچر کو اپنا لیا تھا پھر فرانس کے تعلیم یافتہ طبقے پر چونکہ سوشلزم کے اثرات گہرے تھے اس لیے افریقہ کے ملکوں کے نئے رہنماؤں کا سوشلزم سے متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سوائے مراکش کے جہاں اسلامی روایات اور اسلامی علوم کی جڑیں سب سے زیادہ گہری تھیں، افریقہ کے ہر فرانسیسی مقبوضہ علاقے میں نئی قیادت سوشلسٹ نظر آتی ہے لیکن اس سوشلسٹ قیادت کے لیے رُوس یا چین سے کسی قسم کا تعلق ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ تونس، سنیگال اور آئیوری کوسٹ کے قائد سوشلسٹ ہونے کے ساتھ مغرب نواز بھی ہیں۔ تونس کی بھی یہی صورت ہے۔

حبیب بورقیبہ نہ صرف اقتصادی معاملات میں سوشلزم سے متاثر ہیں بلکہ وہ دیگر امور میں بھی خالص مغربی اور مادی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چوبیس سالہ دَورِ حکومت میں ملک کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں جو تبدیلیاں کی ہیں وہ بڑی حد تک اتاترک اور صدر ناصر کی نام نہاد اصلاحات سے بہت مشابہ ہیں۔

جنوری ۱۹۵۷ء میں تونس میں شخصی قانون کا جو نیا ضابطہ نافذ کیا گیا، وہ پاکستان کے ان عائلی قوانین کی طرح ہے جو عہد ایوبی میں نافذ کیے گئے تھے اور ان میں اسلامی احکام کی رُوح کے مقابلے میں ان مغربی مصنفوں کی تنقیدوں کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے جو وہ اسلامی تعلیمات پر انیسویں صدی میں کرتے رہے تھے، اور اب بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کے تحت تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ان نئے عائلی قوانین پر پاکستان کی طرح تونس کے علماء نے بھی سخت اعتراضات کیے۔

اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں حبیب بورقیبہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور رمضان کے روزوں پر اعتراضات کیے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت تونس پستی کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے جو رمضان کے روزوں سے زیادہ اہم کام ہے اور چونکہ روزہ رکھنے سے آدمی کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے، اس لیے ہنگامی حالات میں روزہ سے رخصت کی اجازت ہونی چاہیے۔ حبیب بورقیبہ کا یہ نظریہ اسلامی احکام کی اتنی کھلی خلاف ورزی تھا کہ ملک میں ان کی شدید مخالفت کی گئی اور حبیب بورقیبہ کو اعلان کرنا پڑا کہ ان کا مقصد مذہبی عقیدے کو کمزور کرنا نہیں تھا۔ تونس

کے آئین میں اگرچہ اس کی صراحت ہے کہ تونس کا سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن مذکورہ بالا مغربی اور اشترا کی تصورات کے اثر کے تحت تونس نے عملاً ایک لادینی یعنی سیکولر مملکت کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ایک مغربی مصنف نے ملک کے اس تضاد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''آج کے تونس میں ایک غیر فیصلہ کُن تضاد پایا جاتا ہے۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ ریاست کا مذہب اسلام ہے لیکن حکومت اور بڑے بڑے رہنماؤں کا ماحول اور زندگی سخت قسم کا سیکولر ہے۔ اعلیٰ عہدے دار مذہبی جذبات سے عاری ہیں لیکن عوام میں اسلامی جذبہ قوی ہے۔''

سوڈان کے صدر نمیری اور لیبیا کے صدر قذافی کے برخلاف صدر بورقیبہ صدر جمال الناصر کے خلاف تھے اور فلسطین سے متعلق تونس کی پالیسی مصر و شام کی پالیسی کے خلاف رہی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی صدر بورقیبہ کا عرب ملکوں سے اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ الجزائر سے بھی تونس کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے الجزائر کے سابق چیف آف اسٹاف طاہر زیری کو جنہوں نے الجزائر کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی تونس میں پناہ دی۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں تونس اور لیبیا نے متحدہ اسلامی عرب جمہوریہ بنانے کا فیصلہ کیا، لیکن بعد میں حبیب بورقیبہ اس منصوبہ کے خلاف ہوگئے اور وزیر خارجہ محمد معمودی کو جنہوں نے دونوں ملکوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی وزارت سے الگ کردیا۔

تعمیر و ترقی

تونس کا نصف سے زیادہ حصہ ریگستانی ہے اور صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہے۔ لیکن ساحل کے ساتھ ساتھ وسیع و عریض میدان ہیں جو اندرونی ملک تک چلے گئے ہیں۔ ان میدانوں کی زمین بھی زرخیز ہے اور بارش بھی کافی ہوتی ہے۔ گیہوں، بارلی، زیتون، رس دار پھل اور کھجور خاص پیداوار ہیں۔ کاگ کے درخت کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ برساتی ندی نالوں پر بند باندھ کر آبپاشی کے نظام کو گزشتہ سالوں میں کافی ترقی دی گئی ہے۔ لیکن ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بارش اور سیلاب نے تونس کی معیشت کو بہت نقصان پہنچایا۔ کھجور اور زیتوں کے درختوں کو شدید نقصان پہنچا۔ اسی فیصد مویشی ہلاک ہوگئے۔ پانچ بڑے بڑے بندوں کو نقصان پہنچا۔ سینکڑوں میل لمبی سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں تباہ ہوگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ سیلاب کی اس تباہ کاری سے آٹھ دس سال

کی ترقی ملیا میٹ ہوگئی۔ بہرحال اس کے بعد لیبیا، امریکہ، فرانس اور مغربی جرمنی نے وسیع پیمانے پر مالی امداد دی جس سے نقصان کی تلافی میں بڑی مدد ملی۔ آزادی کے بعد بڑی بڑی زمینداریاں ختم کردی گئی ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک اجتماعی طریق کاشت پر عمل کیا گیا، لیکن یہ طریقہ زراعت کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا۔ دیہی آبادی سے اس سوشلسٹ زرعی پالیسی کی اتنی سخت مخالفت کی کہ اجتماعی طریق کاشت کا پروگرام ترک کردیا گیا اور احمد بن صلاح کو جو اجتماعی کاشت کے ذمہ دار تھے علیحدہ کر کے قید کردیا گیا۔

تونس میں قابل کاشت زمین کا رقبہ ۷۵ لاکھ ایکڑ ہے۔ اس میں تین لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ نہروں سے سیراب ہوتی ہے اور اگر نظام آبپاشی کو مزید ترقی دی جائے تو پھر پورے چار لاکھ ایکڑ مزید زمین آبپاش ہوسکتی ہے۔

معدنی پیداوار کے لحاظ سے تونس ایک خوش قسمت ملک ہے۔ لوہا، سیسہ اور فاسفیٹ اہم معدنی پیداوار ہیں۔ تونس خاص طور پر فاسفیٹ پیدا کرنے والے بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ۳۸ لاکھ ٹن فاسفیٹ نکالا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں جنوبی حصہ میں پٹرول اور قدرتی گیس کی دریافت نے تونس کی معیشت کو بہت بڑا سہارا دیا۔ ۱۹۷۵ء میں ۴۵ لاکھ ٹن پٹرول نکالا گیا جو ملک کی ضرورت سے فاضل ہے۔

سیمنٹ ایک اہم صنعت ہے۔ فولادسازی کا ایک کارخانہ آزادی کے بعد قائم ہوگیا ہے۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ اور فاسفیٹ صاف کرنے کے کئی پلانٹ بھی کام کر رہے ہیں۔ معاشی اصلاحات کے تحت بیشتر صنعتیں قومی ملکیت میں لے لی گئی ہیں۔ سیاحت کو بھی ملکی معیشت میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ رومی اور اسلامی دَور کے تاریخی آثار اور عمارتیں اور خوبصورت ساحل سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ خصوصاً موسم سرما میں جب یورپ برف کے غلاف کے نیچے چھپ جاتا ہے تو یورپ کے سیلانی تونس اور شمالی افریقہ کے ساحلوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ سیاحوں کا سالانہ اوسط سات لاکھ ہے۔

تعلیم کے میدان میں آزادی کے بعد تونس نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ستر فیصد نوجوان زیر تعلیم ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے تونس شہر میں یونیورسٹی قائم ہے۔ ابتدائی درجہ سے یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے۔ ۱۹۵۶ء سے تعلیم کی ذمہ داری وزارت تعلیم کے سپرد ہے۔ اس وقت ملک میں دو سو آٹھ

قرآنی مدرسے تھے وہ بھی وزارت تعلیم کے تحت چلے گئے۔ مذہبی اور غیر مذہبی مدرسوں کا فرق ختم کر دیا گیا ہے اور نیا نظام تعلیم اسلام کی بجائے سیکولر اور مغربی نظریات پر استوار کیا گیا ہے۔ جامعہ زیتونیہ جو ملک کا قدیم ترین مدرسہ تھا۔ اب تونس یونیورسٹی کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ذریعہ تعلیم عربی اور فرانسیسی ہے۔

تونس کا رقبہ ۶۳ ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۶۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۴ء) ۵۶ لاکھ ہے۔ باشندے تمام مسلمان ہیں اور یکساں تعداد میں عرب اور بربر نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زبان عربی ہے۔ دارالحکومت تونس تعلیم، صنعت، صحافت اور علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ۱۹۷۹ء میں مصر سے اختلاف کے بعد عرب لیگ کا صدر دفتر اب تونس میں قائم کیا گیا ہے۔

باب ۳۷

الجزائر کی ڈیموکریٹک جمہوریہ

لیبیا، تونس کے بعد الجزائر المغرب العربی کا تیسرا ملک ہے۔ شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں کی طرح الجزائر کے عہد زرین کا آغاز بھی ساتویں صدی میں اسلامی دور سے ہوتا ہے۔ شمالی افریقہ کے پہلے فاتح اور شہر قیروان کے بانی عقبہ بن نافع کا مزار الجزائر ہی کے ایک شہر بسکرہ میں ہے اور شمالی افریقہ کی سب سے بڑی زیارت گاہوں میں سے ہے۔ الجزائر تیرھویں صدی کے آخر تک زیادہ تر اغالبہ، بنی فاطمہ اور موحدین کی سلطنتوں کا ایک حصہ رہا جن کے مراکز تونس اور مراکش میں تھے۔ ہاں کبھی کبھی یہاں مقامی حکومتیں بھی قائم ہو جاتی تھیں۔ ان مقامی حکومتوں میں تاہرت میں بنی رستم (۷۶۱ء تا ۹۰۹ء) اور تلمسان میں بنی زیان (۱۳۵۹ء تا ۱۵۵۳ء) کی حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ الجزائر کی تاریخ کے اس ابتدائی آٹھ سو سالہ دور میں جو بجا طور پر عربی دور تھا الجزائر کو "مغرب وسطیٰ" کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ مغرب عربی دو ملکوں تونس اور مراکش کے درمیان واقع تھا۔

۱۵۵۳ء میں مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسا نے الجزائر کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ بنا دیا۔ اب الجزائر کے ترکی دور کا آغاز ہوا، جو ۱۹۳۰ء تک قائم رہا۔ الجزائر نے اپنی موجودہ شکل اسی زمانے میں اختیار کی۔ اور چونکہ سمندر کے کنارے واقع شہر الجزائر اس نئے ترکی صوبے کا صدر مقام تھا۔ اس لیے پورے علاقے کا نام الجزائر پڑ گیا۔ جولائی ۱۸۳۰ء میں فرانس شہر الجزائر پر قابض ہو گیا اور چند سال کے اندر اندر پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ فرانس کی اس جارحانہ کارروائی کی تفصیل اور امیر عبدالقادر کی طرف سے فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنے کا حال اس کتاب کے دوسرے حصے میں بیان کیا جا چکا ہے۔

فرانسیسی دَور

۲۱۔ دسمبر ۱۸۴۷ء کو امیر عبدالقادر الجزائری کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ایک سال کے

اندر اندر پورے الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہوگیا اور الجزائر کو ایک نو آبادی یا مقبوضہ قرار دینے کی بجائے اس کو فرانس کا ایک صوبہ قرار دیا گیا تاکہ یہاں فرانسیسیوں کو آباد کیا جاسکے اور اس کی مسلمان اور عرب حیثیت کو بدل کر اس کو فرانسیسی وطن میں تبدیل کیا جاسکے۔ فرانسیسیوں نے ۱۹۶۲ء تک یعنی اپنے ایک سو سالہ دورِ حکومت میں الجزائر کی کایا پلٹ دی۔ لاکھوں ایکڑ بنجر اور نیم بنجر زمینوں کو زیر کاشت لایا گیا۔ ہزاروں میل لمبی سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں تعمیر کی گئیں۔ شہروں کی تعمیر جدید ترین طرز پر کی گئی۔ یہاں کی کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں، عالی شان عمارتوں، خوبصورت باغوں اور پارکوں کو دیکھ کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ شہر افریقہ نہیں بلکہ فرانس کے ہیں۔ انابہ اور بجابہ کے ساحلی شہر جو سرسبز پہاڑوں کے دامن میں آباد ہیں فرانس اور اٹلی کے مشہور عالم ساحلوں کا جو ریویرا (riviera) کہلاتے ہیں مقابلہ کرنے لگے۔ لیکن الجزائر کی اس ترقی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ سارے تعمیری کام فرانسیسی باشندوں کی خاطر کیے گئے اور ان جدید سماجی، اقتصادی اور تعلیمی سہولتوں اور ترقیوں سے الجزائر کے مقامی باشندے قطعی محروم رہے۔

الجزائر کے معتدل موسم اور زرخیز زمینوں کی کشش نے فرانسیسی آبادکاروں کو شروع ہی سے الجزائر میں آباد ہونے پر مائل کر دیا تھا اور حکومت نے ان کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سو سال کے عرصے میں الجزائر میں آباد فرانسیسیوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہوگئی اور ملک کی سب سے زرخیز زمینوں کا ایک تہائی حصہ ان ہی فرانسیسی آبادکاروں کے قبضہ میں چلا گیا۔ شہروں میں فرانسیسی باشندوں کی تعداد مقامی باشندوں سے بھی زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ آزادی کے وقت الجزائر شہر کی ۵۵ فیصد اور ان کی ۶۰ فیصد آبادی فرانسیسی تھی۔ مسکرہ کا قصبہ جو عبدالقادر کی تحریک مزاحمت کا مرکز تھا، ڈھا دیا گیا اور اس کے کھنڈروں پر فرانسیسی طرز کا ایک جدید شہر تعمیر کیا گیا۔

فرانس کی حکومت الجزائر کو فرانس کا ایک حصہ تصور کرتی تھی۔ یہ ملک فرانس کی وزارت داخلہ کے حدود اختیار میں تھا اور اس کے قوانین فرانسیسی پارلیمنٹ بناتی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں ایک قانون کے ذریعہ الجزائر کے لوگوں کو فرانسیسی شہری بننے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ الجزائر کے باشندے اپنے شخصی قوانین سے دستبردار ہو جائیں۔ چونکہ یہ شرط الحاد اور بے دینی کے قریب تھی اس لیے گنتی کے چند مسلمانوں کے علاوہ کسی نے قبول نہیں کیا۔ وہاں اس قانون سے الجزائر میں آباد ایک لاکھ چالیس ہزار یہودیوں کو فائدہ پہنچا کیونکہ انہوں نے بغیر کسی

پس و پیش کے فرانسیسی شہریت قبول کر لی۔ ۱۹۴۴ء میں اس قانون میں ترمیم کر دی گئی اور شخصی قانون سے دستبرداری کی شرط نکال دی گئی لیکن فرانسیسی شہریت حاصل کرنے کے لیے فرانسیسی کلچر کو اختیار کرنا پھر بھی ضروری تھا۔

آزادی کی تحریکیں

عبدالقادر الجزائری کے بعد بھی الجزائر کے باشندوں نے کئی بار فرانسیسی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن اب فرانسیسی حکومت اتنی مضبوطی سے پنجے گاڑ چکی تھی کہ مسلح بغاوت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنا ممکن نہ تھا، اور یہ تمام بغاوتیں سختی سے کچل دی گئیں۔ موجودہ صدی کی دوسری چوتھائی میں الجزائر کی قومی جدوجہد کا دُوسرا دَور شروع ہوا جسے ہم سماجی اصلاح اور پُرامن سیاسی جدوجہد کا دَور کہہ سکتے ہیں۔ الجزائر کے ایک مزدور رہنما مسالی حج نے ۱۹۲۴ء میں انجم الافریقہ الشمالی کے نام سے ایک مزدور تنظیم قائم کی، جس نے جلد ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۶ء میں حکومت نے یہ تنظیم توڑ دی۔ مسالی حج نے اس کے بعد فوراً ''الجزائری عوام کی پارٹی''[1] (P.P.A) کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی جس نے ۱۹۴۷ء میں جمہوری آزادیوں کی فتح کی تحریک کے نام سے ایک نئی تنظیم کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا مختصر نام ایم۔ ایل۔ ٹی۔ ڈی (M.L.T.D) تھا۔

مسالی حج کی مذکورہ بالا جماعت اگرچہ ملک کی سب سے بڑی اور سرگرم جماعت تھی۔ لیکن الجزائر میں اس وقت تک مسلمانوں کی کئی اور تنظیمیں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں ایک تنظیم ''حزب منشور الجزائر'' تھی جس کو ۱۹۴۳ء میں فرحت عباس نے قائم کیا تھا۔ یہ جماعت فرانسیسی یونین کے اندر رہ کر الجزائر کو خود مختار جمہوریہ بنانا چاہتی تھی بعد میں اس جماعت کا نام ''جمہوری اتحاد مسلمانان الجزائر'' ہو گیا۔

الجزائر کی ایک اور اہم تنظیم ''جمعیۃ العلماء الجزائر'' تھی جسے ۱۹۲۹ء میں شیخ عبدالحمید بن

---

(۱) یہ پارٹی ایک ایسی الجزائری ریاست کی حامی تھی جو اپنی روح میں خالص اسلامی ہو، لیکن رہنمائی مزدور طبقہ کرے اس کا کمیونزم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مسالی حج ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ ان کو ۱۹۴۱ء میں بغاوت کے جرم میں سولہ سال کی سزا ہوئی اور ان کی پارٹی توڑ دی گئی۔ اس پارٹی کا علماء، طلبہ اور عورتوں پر خاص اثر تھا۔ مسالی حج کو ۱۹۴۳ء میں معاف کر دیا گیا لیکن ۱۹۴۶ء تک وہ جلاوطن رہے یا فوج کی نگرانی میں اس کے بعد وہ رہا کر دیے گئے۔

بادیس نے قائم کیا تھا۔ شیخ عبدالحمید بن بادیس الجزائر کے ایک ممتاز عالم تھے۔ انہوں نے تونس کی جامعہ زیتونیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بیس سال تک اپنے شہر میں قرآن کی تفسیر پر درس دیتے رہے۔ یہ درس اتنا جامع ہوتا تھا کہ تاریخ، فلسفہ اور علوم حکمت سب اس کے دائرے میں آجاتے تھے۔ اس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ جمعیۃ العلماء دینی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیتی تھی۔ فرانس کی اسلام دشمن پالیسی کو بے نقاب کرتی تھی اور اپنا پیام مدرسوں، کلبوں اور اخبار اور رسالوں کے ذریعہ پہنچاتی تھی، ہفت روزہ ''البصائر'' جو طنجہ سے شائع ہوتا تھا اس جمعیۃ کا ترجمان تھا۔ الجزائر کی تحریک آزادی میں اس پرچے کو وہی حیثیت حاصل ہے جو برصغیر میں الہلال اور کامریڈ کو حاصل تھی۔ سیاسی اعتبار سے جمعیۃ العلماء الجزائر کی آزادی اور شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں سے اتحاد کے لیے کوشش کرتی تھی۔ جمعیۃ العلماء نے الجزائر میں مسلم ثقافت کو زندہ رکھا اور شمالی افریقہ میں اسلامی ثقافت کے دو مرکزوں جامع زیتونیہ اور جامع قرویین سے قریبی ربط قائم رکھا۔ جمعیۃ العلماء آزادی سے قبل ۱۲۵ دینی مدرسے اور ایک ثانوی مدرسہ ادارہ ابن بادیس چلاتی تھی۔

۱۹۵۱ء میں مسالی حج کی ایم۔ ٹی۔ ایل۔ ڈی، فرحت عباس کی جمہوری اتحاد جمعیت العلماء اور دوسری جماعتوں نے مل کر ''الجزائری محاذ برائے دفاع حریت'' کی تشکیل کی اور اس طرح الجزائر کی تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اس دوران میں انتہا پسند نوجوانوں کے ایک گروہ نے آئینی طریقوں سے ناامید ہوکر احمد بن بیلا کی قیادت میں ۱۹۴۷ء میں خفیہ تنظیم (Q.S) قائم کی جس کا مقصد ایم۔ ٹی۔ ایل۔ ڈی سے ربطہ قائم رکھتے ہوئے مسلح بغاوت کرنا تھا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں اس تنظیم نے قاہرہ میں انقلابی کمیٹی برائے اتحاد وعمل (C.R.O.A) قائم کی۔ اس کمیٹی نے یکم نومبر ۱۹۵۴ء سے آزادی کے لیے مسلح بغاوت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ بغاوت شروع ہونے کے بعد اس کمیٹی نے قومی محاذ آزادی (F.L.N) کا نام اختیار کرلیا اور اس کے تحت جو فوج منظم کی گئی اس کا نام قومی آزادی کی فوج (A.L.N) رکھا گیا۔ آہستہ آہستہ ایم۔ ٹی۔ ایل۔ ڈی اور دوسری جماعتوں کے ممبر جیسے یوسف بن خدہ اور فرحت عباس وغیرہ بھی قومی محاذ آزادی میں شامل ہوگئے۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں قومی محاذ نے الجزائر کی عارضی حکومت بھی قائم کردی۔

فرانسیسی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت آسان کام نہیں تھا، لیکن الجزائر کے حریت پسندوں

نے ہر قسم کی مشکلات کے باوجود جنگ جاری رکھی اور سات سال کی مسلسل لڑائی اور کئی لاکھ مسلمانوں کی شہادت کے بعد آخر کار فرانس کو الجزائر کی آزادی کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔
یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو فرانس نے اہل الجزائر کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصواب کرایا جس میں وہاں کے باشندوں نے پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ آزادی کے حق میں رائے دی۔ اس استصواب کے نتیجے میں ۳۔ جولائی ۱۹۶۲ء کو الجزائر نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔
الجزائر کی عارضی حکومت نے یوسف بن خدہ کے زیر قیادت نئی حکومت کا انتظام سنبھال لیا۔ لیکن الجزائر کی آزادی کے حقیقی معمار احمد بن باللہ تھے۔ چنانچہ قومی محاذ آزادی نے ۲۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء کو احمد بن باللہ کو وزیر اعظم منتخب کر لیا۔

احمد بن بیلا (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء)

احمد بن بیلا دسمبر ۱۹۱۹ء میں مغربی الجزائر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تاجر تھے اور انہوں نے احمد بن بیلا کو ایک فرانسیسی مدرسے سے تعلیم دلوائی۔ دوسری عالمی جنگ میں احمد بن بیلا نے فرانسیسی فوج میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے قومی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا اور مسالی حج کی عوامی پارٹی (P.P.A) اور اس کی جانشین ایم۔ ٹی۔ ایل۔ ڈی میں کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے مسلح جدوجہد شروع کرنے کے لیے خفیہ تنظیم قائم کی۔ احمد بن بیلا اس تنظیم کے تحت اوران کے کمانڈر تھے۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں انہوں نے اوران کے ڈاک خانے پر چھاپہ مار کر کئی لاکھ روپے حاصل کر لیے مئی ۱۹۵۰ء میں وہ گرفتار ہو گئے اور سات سال کی سزا ہوئی لیکن بن بیلا پانچ دن بعد جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے اگلے کئی سال الجزائر فرانس اور مصر میں خفیہ سرگرمیوں میں بسر ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کی جمال عبدالناصر سے دوستی ہوئی اور وہ ریڈیو صوت العرب سے فرانس کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ مصر میں قیام کے دوران بن بیلا الجزائر میں حریت پسندوں کو مصری اسلحہ بھی فراہم کرتے تھے۔
جولائی ۱۹۵۴ء میں الجزائر کی انقلابی کمیٹی برائے اتحاد و عمل (C.R.O.A) کے جن نومبروں نے انقلابی تحریک اور مسلح جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں بن (بیلہ) بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے بعد میں قومی آزادی کے محاذ کی شکل اختیار کر لی اور یکم نومبر ۱۹۵۴ء سے

باضابطہ طور پر مسلح بغاوت کا آغاز کر دیا اب بن بیلا قومی آزادی کی فوج کے کمانڈر مقرر کیے گئے۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو جب وہ دوسرے الجزائر مجاہدین کے ساتھ مراکش سے تونس جا رہے تھے۔ فرانس نے ان کے طیارے کو الجزائر میں اتار لیا اور ان کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بن بیلا پانچ سال سے زیادہ فرانس کی قید میں رہے لیکن اس دوران بھی وہ اپنے مراکشی وکیل کے توسط سے ان الجزائری رہنماؤں سے رابطہ قائم کیے رہے جو الجزائر میں مصروف جہاد تھے۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں فرانس کے صدر ڈیگال نے الجزائر کی آزادی کا حق تسلیم کر لیا۔ ۱۸۔ مارچ ۱۹۶۲ء کو مجاہدین اور فرانس کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا اور بن باللہ رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے عارضی حکومت کے وزیر اعظم یوسف بن خدہ سے اختیارات حاصل کر لیے۔ ۸۔ ستمبر کو نیا آئین نافذ کیا گیا اور احمد بن بیلا ۲۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء کو جمہوریہ الجزائر کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے، ۱۵۔ ستمبر ۱۹۶۳ء کو وہ صدر منتخب ہو گئے اور اس عہدے پر ۱۹۶۵ء تک فائز رہے۔ اس سال ۱۹۔ جون کو ان ہی کے ایک رفیق کرنل محمد بوخروبہ نے جو حواری بومدین کے نام سے مشہور ہیں احمد بن بیلا کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور احمد بن بیلا کو نظر بند کر دیا۔

صدر بومدین (۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۹ء)

صدر بومدین ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۹ء کے اوائل تک الجزائر کے صدر رہے۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد ۱۹۶۴ء کا آئین معطل کر دیا۔ اس آئین کے تحت ۱۹۶۵ء میں ایک قومی اسمبلی بھی قائم کی گئی تھی، لیکن صدر بومدین نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس وقت سے اب تک الجزائر پر قومی انقلابی کونسل فرمانوں کے ذریعہ حکومت کرتی ہے۔ یہ کونسل چوبیس افراد پر مشتمل ہے اور زیادہ تر فوجی افسروں پر مشتمل ہے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں الجزائر نے اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا، لیکن الجزائری فوجوں نے جنگ میں عملی حصہ نہیں لیا۔ اس موقع پر الجزائر نے امریکہ سے سفارتی تعلقات توڑ لیے تھے جو ۱۹۷۴ء میں بحال ہوئے۔

صدر بومدین کے دور میں قومیانے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں کانوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا۔ ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۸ء کے درمیان بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لیا

گیا۔ان کے علاوہ مختلف کارخانوں اور فرانس کی تیل کمپنیوں کو بھی قومی ملکیت میں لیا گیا۔اس زمانہ میں زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں اور زمینوں کی تحدید کی گئی۔

۱۹۶۷ء میں بائیں بازو کے کرنل طاہر زبیری (Zbiri) نے بغاوت کی لیکن ناکام رہی اور ان کو تونس میں پناہ حاصل کرنی پڑی۔ ۱۹۷۵ء سے ہسپانوی صحرا کے مسئلہ پر الجزائر کے مراکش کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے اور اس وقت سے الجزائر صحرا کے پولیساریو چھاپہ ماروں کی مدد کر رہا ہے جن کا تعلق بائیں بازو سے ہے اور جو سابق ہسپانوی صحرا کو ایک آزاد ملک بنانا چاہتے ہیں اور اس علاقے کے مراکش کے ساتھ الحاق کے خلاف ہیں۔صدر بومدین نے اپنے دور حکومت میں روس اور فرانس دونوں سے قریبی تعلقات قائم رکھے اور ان سے وسیع پیمانے پر اقتصادی اور فوجی امداد حاصل کی۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو بومدین کا ایک طویل بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔انقلابی کونسل نے کئی دن کے بحث ومباحثہ کے بعد فروری ۱۹۷۹ء کو شاذلی بن جدید کو صدر منتخب کر لیا۔

شاذلی بن جدید صدارت سنبھالنے کے بعد سے زراعت کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔انہوں نے ان سیاسی قیدیوں کو بھی رہا کر دیا ہے جو احمد بن بیلا کی علیحدگی کے زمانہ سے قید تھے۔ ۴جولائی ۱۹۷۹ء کو احمد بن بیلا کو بھی رہا کر دیا گیا۔وہ الجزائر کے مضافات میں مقیم تھے جہاں صرف ان کے گھر والے ان سے مل سکتے تھے۔وہ اب بھی نگرانی میں ہیں لیکن ان کو گھومنے پھرنے اور ملاقات کرنے کی آزادی ہے۔

سوشلزم اور اسلام

الجزائر اگرچہ ایک جمہوری ملک ہونے کا دعویدار ہے،لیکن وہاں صرف ایک سیاسی جماعت ''قومی محاذ آزادی'' موجود ہے۔یہ وہی جماعت ہے جس نے الجزائر کو آزادی دلوائی۔آزادی کی جدوجہد کے زمانہ میں اس جماعت میں ہر فکر ونظر کے لوگ شامل تھے،علماء اور اسلامی فکر رکھنے والے رہنما بھی تھے۔اشتراکی بھی تھے اور ایسے لوگ بھی شامل تھے جو کوئی واضح فکری نصب العین نہیں رکھتے تھے۔لیکن آزادی کے بعد اشتراکی نقطۂ نظر رکھنے والے رہنماؤں نے غلبہ حاصل کر لیا اور اپنے سے اختلاف کرنے والوں کی سختی سے زباں بندی کر دی۔خود اشتراکی گروہ میں بھی شدید اختلاف ہو گیا۔احمد بن بیلا اور کرنل بومدین اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے،لیکن بومدین نے احمد

بن بیلا کا تختہ پلٹ دیا۔ الجزائر کی طویل جدوجہد آزادی میں علماء اور اسلامی نظام کے حامیوں کا بڑا حصہ ہے، لیکن الجزائر کی موجودہ قیادت سوشلزم کے پھندے میں گرفتار ہے۔ اگرچہ الجزائر کی سوشلسٹ حکومت عراق اور شام کی سوشلسٹ حکومتوں کی طرح اسلامی فکر اور اسلامی اقدار کی دشمنی نہیں ہے، لیکن ایک جماعتی راج ہونے اور ذرائع ابلاغ عامہ پر ایک ہی گروہ کی اجارہ داری ہونے کی وجہ سے اسلامی افکار کی توسیع و اشاعت اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں مشکلات حائل ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی الجزائر میں اسلام اور سوشلزم کی کشمکش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الجزائر جس نے اپنی آزادی کی قیمت دس لاکھ شہیدوں کی صورت میں ادا کی۔ آزادی کے بعد ٹھیک ان مشکلات میں مبتلا ہے جو نئے آزاد ہونے والے مسلمان ملکوں کو پیش آئیں جن کی قیادت مغرب زدہ تجدید پسند رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کے سربراہ عوام کے جذبے اور دینی عناصر کی توقعات کے برخلاف ملک کو اشتراکی اور لادینی ریاست اور مغربی تہذیب کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگست ۱۹۶۲ء میں علمائے الجزائر نے اعلان کیا کہ اسلام اور عربی زبان کو الجزائر میں بالادستی ہوگی۔ انہوں نے اپنے بیان میں ان قوم پرست رہنماؤں پر شدید اعتراض کیا جو زمانہ حال کے مطابق ایک جدید اشتراکی الجزائری حکومت کے حامی ہیں جس میں مذہب کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی۔ علماء نے کہا کہ الجزائر کی جنگ اپنے ان شہیدوں کے ساتھ بے وفائی اور خیانت کا ارتکاب کرے گی جو اس جنگ میں کام آنے اور اپنے اس تاریخی مقصد میں مکمل طور پر ناکام سمجھی جائے گی، اگر اسلام کو حکومت کا سرکاری مذہب اور عربی زبان کو ملک کی سرکاری زبان نہ قرار دیا گیا۔''[1]

علمائے الجزائر نے یہ مطالبہ اس وقت کیا تھا جب الجزائر کے لیے آئین تیار کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ آئین بنا لیکن ۱۹۶۵ء میں ختم کر دیا گیا اور الجزائر اس وقت سرزمین بے آئین ہے جس میں حکمراں پارٹی کا ہر حکم آئین ہے۔ الجزائر میں اسلام سرکاری مذہب ہے اور عربی

(۱) سید ابوالحسن علی ندوی: مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۹۸۔۱۹۹ شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء

سرکاری زبان ہے۔ الجزائر کی وزارت مذہبی امور ہر سال اسلامی افکار پر سمپوزیم کرتی ہے۔ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں اسلامی مطالعہ کے لیے الجزائر کی حکومت وظیفے دیتی ہے۔ لیکن سوشلزم پر زور دینے کی وجہ سے اس کی مخالفت ہوئی اور مئی ۱۹۷۵ء میں الجزائر یونیورسٹی میں تصادم بھی ہوئے۔ ملک میں کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون ہے، لیکن کمیونسٹوں نے حکمران پارٹی کے اندر اس طرح پناہ حاصل کر رکھی ہے جس طرح وہ ہر اس ملک میں کرتے ہیں جہاں حکمران پارٹی سوشلسٹ نظریات کی حامل ہو اور کمیونزم پر پابندی ہو۔

الجزائر کی خارجہ پالیسی غیر جانبداری پر مبنی ہے اور ملک قومی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتا ہے۔ صحرا کے علاقہ میں پولیساریو چھاپہ ماروں کی حمایت کچھ تو اس پالیسی کے تحت کی جارہی ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ چھاپہ مار اشترا کی عناصر کے زیر اثر کام کر رہے ہیں۔

تعمیر و ترقی

الجزائر رقبہ کے لحاظ سے سوڈان اور سعودی عرب کے بعد اسلامی دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ لیکن ملک کا نوے فیصد حصہ ریگستانی ہے اور صحرائے اعظم پر مشتمل ہے۔ ملک کا سب سے زرخیز حصہ وہ ساحلی میدان ہیں جو بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں اور جہاں وافر مقدار میں بارش ہوتی ہے۔ ان میدانوں سے ملحق پہاڑی سطح مرتفع بھی خاصی زرخیز ہے۔ ملک کی بیشتر آبادی، تمام بڑے شہر ان ہی میدانوں میں اور سطح مرتفع پر آباد ہیں۔ پہاڑوں کے جنوب میں صحرائے اعظم کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ الجزائر کی موجودہ خوشحالی میں زرخیز میدانوں سے زیادہ صحرا کا حصہ ہے جہاں پٹرول اور قدرتی گیس کے وسیع ذخیرے ہیں۔

الجزائر قدرتی وسائل کے لحاظ سے ایک خوش قسمت ملک ہے۔ لوہے اور فاسفیٹ کی کانیں ہیں اور پٹرول اور قدرتی گیس کے وسیع ذخیرے ہیں اور الجزائر پٹرول برآمد کرنے والے بڑے ملکوں کی صف میں شامل ہے۔ پٹرول کے یہ ذخیرے ۱۹۵۷ء میں دریافت ہوئے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں ۳۸ لاکھ ٹن لوہا اور آٹھ لاکھ ستر ہزار ٹن فاسفیٹ نکالا گیا تھا۔ پیٹرو کیمیکل صنعت، کیمیاوی صنعت اور کھاد کی صنعتیں اہم ہیں۔ آزادی کے بعد سے انابہ میں فولاد سازی کا ایک کارخانہ بھی کام کر رہا ہے۔ الجزائر کی اقتصادیات میں ان الجزائری باشندوں کا بھی بڑا حصہ ہے

جو فرانس میں کام کرتے ہیں اور کثیر مقدار میں زرمبادلہ الجزائر بھیجتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد سات لاکھ تھی اور وہ ڈیڑھ ارب فرانک سالانہ الجزائر بھیجتے تھے۔

آزادی کے بعد الجزائر سے تقریباً دس لاکھ فرانسیسی آبادکار ملک چھوڑ کر فرانس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ملکی معیشت کو شروع میں نقصان پہنچا لیکن بتدریج حالات سنبھل گئے۔ فرانسیسیوں کے جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ الجزائر کی آبادی میں زیادہ یک رنگی پیدا ہوگئی۔ غیر اسلامی رجحانات کو تقویت دینے والے عناصر ملک سے نکل گئے اور الجزائر کی معیشت پر سے فرانسیسیوں کا کنٹرول ختم ہوگیا۔

ملک کا نظام تعلیم فرانسیسی ہے۔ میزانیہ کا ۲۵ فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ستر فیصد بچے ابتدائی مدرسوں میں داخل ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے الجزائر، دہران اور قسطنطین میں تین یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ شہر الجزائر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایک یونیورسٹی ہے۔ الجزائر کی قومی لائبریری میں چھ لاکھ ستر ہزار کتابیں ہیں جن میں پانچ لاکھ عربی میں ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی زبان کے قلمی نسخوں کی تعداد تین ہزار ہے۔ الجزائر یونیورسٹی کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ ہے۔

الجزائر میں صحافت کا معیار بھی بلند ہے۔ روزنامہ الجمہوریہ کی اشاعت اسی ہزار اور المجاہد کی اشاعت ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ یہ دونوں اخبار فرانسیسی زبان کے ہیں۔ عربی روزناموں میں الشعب سب سے زیادہ نکلتا ہے۔ اس کی اشاعت ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ المجاہد اور الشعب قومی محاذ آزادی کے ترجمان ہیں۔

۱۹۷۴ء سے الجزائر میں طبی تعلیم مفت ہے، لیکن ڈاکٹروں اور شفاخانوں کی کمی ہے۔

الجزائر کی بیس فیصد آبادی کی مادری زبان بربری ہے۔ باقی آبادی عربی بولتی ہے۔ فرانسیسی جو کبھی دس لاکھ تھے اب ستر ہزار کے قریب رہ گئے ہیں۔ دارالحکومت الجزائر کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔

باب ۳۸

المغرب: مراکش کی بادشاہت

سرزمین مراکش جسے عہد قدیم میں مغرب اقصیٰ کہا جاتا تھا اور آج کل المغرب کہا جاتا ہے اسلامی تہذیب وتمدن کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز ہے۔

اسلامی دنیا میں صرف چند ملک ہیں جن کا ماضی مراکش کی طرح شاندار ہے۔ اندلس کے بعد مراکش پہلا ملک ہے جو دوسری صدی ہجری کے آخر میں خلافت سے علیحدہ ہوا۔ یہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کا دَور تھا۔ اس علیحدگی نے اس کو امتیازی حیثیت دی اور بعد میں مراکش کا نشوونما اور ارتقا مشرقی دنیائے عرب کے ایک حریف کی حیثیت سے ہوا۔ ادریسی حکومت یہاں کی پہلی حکومت تھی اس کے زوال پر مراکش کچھ مدت کے لیے فاطمی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا جس کا مرکز قیروان اور مہدیہ میں تھا۔ اسی زمانے میں مراکش کا شمالی حصہ اندلس کی اموی سلطنت کے اثر میں آیا۔ پانچویں صدی ہجری میں یہاں مرابطین کو عروج حاصل ہوا جنہوں نے شہر مراکش آباد کیا۔ اس کے بعد موحدین کے دَور میں مراکش اپنی تاریخ کے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ طرابلس سے لے کر بحراوقیانوس تک صحرائے اعظم سے اندلس تک سارا علاقہ ایک حکومت کے تحت آ گیا۔ موحدین کے بعد بنی مرین (۱۲۶۹ء/ ۶۶۷ھ تا ۱۴۷۰ء/ ۸۷۵ھ) جو تمدنی لحاظ سے مراکش کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔

مراکش اور اندلس نے اسلامی تہذیب کو ایک نئی شکل اور نیا مزاج دیا۔ اندلس سے جب مسلمانوں کا اخراج ہو گیا تو اندلسی تہذیب کی وراثت مراکش ہی کے حصے میں آئی۔ جامع ازہر کے مقابلے میں یہاں جامع قروئین وجود میں آئی جو نہ صرف تمام شمالی افریقہ بلکہ صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع ملکوں کے مسلمانوں کے لیے آج بھی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے۔ فاس، مکناس، مراکش، رباط اور دار بیضا (کیسابلنکا) کے شہر اسلامی دور میں قائم ہوئے۔ مراکش کی سرزمین سے بین الاقوامی شہرت کی حامل جن ہستیوں کا تعلق رہا ہے ان میں فقیہہ، قاضی عیاض،

جغرافیہ دان، ادریسی، فلسفی ابن طفیل اور ابن رشد طبیب ابن زہر، اور سیاح ابن بطوطہ کے نام قابل ذکر ہیں، موحدین کے بعد مراکش میں علمی زوال شروع ہو گیا۔ اگرچہ سیاسی اور تمدنی عروج فلالی حکمران مولائے اسماعیل (۱۶۷۲ء تا ۱۷۲۷ء) کے عہد تک قائم رہا۔ اس کے بعد مراکش زوال کے اسی راستہ پر چل پڑا جس پر باقی اسلامی دنیا گامزن ہو چکی تھی۔ مراکش کا موجودہ حکمران خاندان اسی فلالی خانوادہ سے تعلق رکھتا ہے جس سے مولائے اسماعیل کا تعلق تھا۔

فرانسیسی دور

شمالی افریقہ کے ملکوں میں مراکش پر فرانس نے سب سے آخر میں قبضہ کیا۔ یہ مولائے عبدالحفیظ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء) کا دور تھا جب ۱۹۱۲ء میں اسپین نے شمالی مراکش پر جو ردیف کہلاتا ہے اور فرانس نے باقی ملک پر اپنا قبضہ جمایا۔ فرانس نے مارچ ۱۹۱۲ء میں مولائے عبدالحفیظ کو بمقام فاس ایک معاہدہ پر مجبور کیا جس کے تحت مراکش کو تونس کی طرح فرانس کا ایک زیر حفاظت علاقہ (protectorate) قرار دیا گیا تھا۔ اس سال نومبر میں ریف کو اسپین کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔ معاہدہ کے تحت ریف پر سلطان مراکش کی بالادستی تسلیم کی گئی تھی۔ فرانس کے سامنے سلطان کے اس طرح ہتھیار ڈال دینے پر عوام نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور سارا ملک بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیکن فرانسیسی فوجوں نے اس بغاوت کو جلد ہی کچل دیا اور مراکش پر فرانس کی حکومت کو استحکام حاصل ہو گیا۔[1]

مراکش میں اپنے ۴۴ سالہ دورِ حکومت میں فرانس جس پالیسی پر عمل پیرا رہا وہ تونس اور الجزائر میں اس کی پالیسی سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں بھی ملک کو ان ہی خطوط پر ترقی دی گئی جن پر فرانس شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں میں عمل کر رہا تھا۔ جدید طریقہ کاشت کو رواج دیا گیا۔ پھلوں اور دوسری اہم فصلوں کو ترقی دی گئی، کان کنی کا آغاز کیا گیا، سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھایا گیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ملک پر اپنا تسلط مضبوط کرنے اور فرانسیسیوں کو فائدہ پہنچانے کے مقصد سے کیا گیا۔ فرانسیسیوں کو ہر قسم کی مراعات دی گئیں اور ان کو اس کثرت سے آباد کیا گیا کہ مراکش

(۱) مراکش کے دورِ زوال اور اس پر فرانس کے تسلط کی تاریخ کے لیے دیکھئے "ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ" حصہ دوم باب ۳۴ (۴)

کے تمام بڑے شہروں میں ان کی تعداد مجموعی آبادی کا نصف ہوگئی۔ اسی طرح دیہی علاقوں میں جتنی اچھی زمینیں تھیں۔ وہ سب فرانسیسیوں کی ملکیت تھیں۔

معاشی پالیسی کی طرح سماجی اور ثقافتی پالیسی بھی عرب کش اور مسلم کش تھی۔ عربی زبان اور اسلامی علوم کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ فرانسیسی کلچر کی سرپرستی کی گئی اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو فرانسیسی کلچر کے مداح تھے۔ فرانسیسی حکومت نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عربوں اور بربر باشندوں میں تفریق کرنے کی کوشش کی۔ مراکش میں شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں کی نسبت بربرنسل کے باشندوں کی اکثریت ہے لیکن یہ تمام باشندے مسلمان ہیں اور ان میں بیشتر کی مادری زبان عربی ہے۔ لیکن فرانسیسیوں نے نہ صرف یہ کہ بربر بولی کو عربی کے مقابلے میں فروغ دینے کی کوشش کی، بلکہ بربر باشندوں کے لیے اسلامی قوانین کی جگہ بربروں کے رواجی قانون کو نافذ کرنے کی کوشش بھی کی اور اس مقصد کے لیے ۱۹۳۰ء میں ایک حکم جاری کردیا۔ فرانسیسی حکومت کی ان سامراجی اور مسلم کش پالیسی کے خلاف ملک میں ردعمل شروع ہوا اور اس طرح مراکش میں قومی بیداری کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔

غازی عبدالکریم

مراکش میں غیر ملکی تسلط کے خلاف پہلی تحریک مزاحمت شمالی مراکش میں ریف کے پہاڑی علاقے میں شروع ہوئی۔ اس جنگ آزادی کے ہیرو غازی محمد بن عبدالکریم خطابی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۶۳ء تھے۔ ریف کا علاقہ ۱۹۱۲ء سے اسپین کے قبضے میں تھا۔ عبدالکریم ریف کے ایک پہاڑی قصبہ اجدید میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے ہوکر انہوں نے فاس کی جامعہ قرؤین میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے ذاتی طور پر ہسپانوی زبان کی تحصیل کی۔ محمد بن عبدالکریم ۱۹۱۴ء میں ملیلہ کے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے۔ اس زمانے میں عبدالکریم اسپین کے اتنے خلاف نہیں تھے جتنے فرانس کے خلاف تھے۔ ان کی مخالف فرانس سرگرمیوں کے خلاف جب فرانس نے احتجاج کیا تو اسپینی حکام نے ان کو قید کردیا۔ پہلی جنگ عظیم کے آخر میں عبدالکریم قید خانہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ پہاڑوں میں اپنے قبیلے کے درمیان پہنچنے کے بعد انہوں نے اسپین کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور اپنے بھائی احمد بن الکریم کے ساتھ مل کر وطن کو

آزاد کرانے کا عہد کیا۔ اسپین کی حکومت نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک بڑی فوج روانہ کی جسے ۲۱ جولائی اور ۲۲۔ جولائی ۱۹۲۱ء کی درمیانی شب میں امیر عبدالکریم نے ایسی شکست دی کہ انیس ہزار ہسپانوی سپاہیوں میں سے سولہ ہزار سپاہی جنگ میں کام آ گئے۔

اس جنگ کے بعد ریف کا ایک بڑا حصہ مجاہدین آزادی کے قبضہ میں آ گیا اور امیر عبدالکریم نے ''جمہوریہ ریف''[1] کے نام سے ایک آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اسپین سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اگلے تین سالوں میں چند ساحلی شہروں کو چھوڑ کر پورا ریف محمد بن عبدالکریم کے قبضہ میں آ گیا۔ ایک طاقتور یورپی ملک کے مقابلے میں ان شاندار کامیابیوں نے محمد بن عبدالکریم کا نام ساری دنیا میں روشن کر دیا لیکن ان کی یہ روز افزوں کامیابی فرانس کے لیے تشویش کا باعث بن گئی اور فرانس کو اپنے مقبوضہ علاقے میں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اپریل ۱۹۲۵ء میں ریفی مجاہدین کا فرانسیسی فوجوں سے سرحدی تصادم بھی ہو گیا اور مجاہدین کے بعض دستے شہر فاس کے پاس بارہ میل تک پہنچ گئے۔ اس واقعہ نے فرانس کو مداخلت کا موقع فراہم کر دیا۔ فرانس اور الجزائر سے کمک مراکش پہنچنا شروع ہو گئی اور اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار فرانسیسی فوج ریف کی سرحد پر پہنچ گئی۔ اسی دوران میں اسپین نے بھی ساحل ریف پر اپنی فوجیں اتار دیں اور فرانس اور اسپین کی مشترکہ فوج نے جس کی تعداد دو لاکھ اسی ہزار تھی۔ ریف کی ننھی جمہوریہ پر حملہ کر دیا۔ جدید ترین اسلحہ سے آراستہ اپنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنا مٹھی بھر مجاہدین کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ چند ماہ اور مزاحمت کے بعد غازی محمد بن عبدالکریم نے ۲۷۔ مئی ۱۹۲۶ء کو فرانس کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ محمد بن عبدالکریم کی تحریک آزادی اگرچہ ناکام ہو گئی لیکن انہوں نے محدود وسائل کے ساتھ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا جس دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے شمالی افریقہ کی جدید تاریخ میں امیر عبدالقادر الجزائری کے علاوہ کوئی دوسرا رہنما ان کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] امیر عبدالکریم کی حکومت کے دو مقصد تھے۔ فرانس کی بالادستی کا خاتمہ اور ریف سے اسپین کا اخراج۔ انہوں نے یورپ کی حکومتوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور ان سے جمہوریہ کے استحکام میں مدد لینا چاہا۔ کان کنی کی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ وزراء ایک مجلس کے سامنے جواب دہ تھے جو روسا قبائل پر مشتمل تھی۔ امیر عبدالکریم نے یہ کوشش بھی کی کہ برطانیہ و فرانس جمہوریہ ریف کو تسلیم کر لیں۔

فرانس نے امیر محمد بن عبدالکریم کو گرفتار کرنے کے بعد مدغاسکر کے بد جزیرہ ری یونین میں نظر بند کر دیا جہاں انہوں نے پورے اکیس سال گذار دیے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۴۷ء میں جب ان کو فرانس منتقل کیا جا رہا تھا اور ان کا جہاز نہر سویز سے گذر رہا تھا تو وہ اچانک جہاز سے اتر کر مصر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ شاہ فاروق نے شمالی افریقہ کے راہنماؤں کی درخواست پر ان کو پناہ دے دی۔ قاہرہ میں امیر عبدالکریم کئی سال تک المغرب کے صدر دفتر کے جو شمالی افریقہ کی مختلف قومی تحریکوں کا مرکز تھا، سربراہ رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پورے شمالی افریقہ کو فرانس کے تسلط سے آزاد ہوتے دیکھ لیا لیکن ان کا قیام قاہرہ ہی میں رہا۔ اور یہیں ۶ فروری ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔

مراکش میں قومی سرگرمیوں کا آغاز نومبر ۱۹۲۵ء میں اس وقت سے ہوا جب مراکش کے عظیم رہنما علال الفاسی نے شہر فاس میں ایک انجمن قائم کی۔ اس کے بعد اگست ۱۹۲۶ء میں احمد بالافرج اور محمد حسن الوزانی نے شہر رباط میں دوسری انجمن قائم کی۔ فرانس کے استبدادی قوانین کی وجہ سے چونکہ قومی سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لینا ممکن نہیں تھا اس لیے یہ انجمنیں خفیہ طریقہ پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی تھیں۔ ان انجمنوں نے اپنے کام کا آغاز مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ کی انجمنوں کی حیثیت سے کیا۔ مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح ان کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ سیاسیات ابھی ان کے دائرہ عمل سے خارج تھی۔

مئی ۱۹۳۰ء میں بربروں کے درمیان رواجی قانون نافذ کرنے کا جب فیصلہ کیا گیا تو اس حکم نے سارے ملک میں آگ لگا دی اور اس طرح قومی تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ امیر شکیب ارسلان نے جو جنیوا میں مقیم تھے۔ اس فرمان کے خلاف ایسی وسیع مہم چلائی کہ اس کے اثرات انڈونیشیا تک پہنچ گئے۔ فرانس پر الزام لگایا گیا کہ وہ بربر باشندوں کو مرتد کرنا چاہتا ہے۔

چار سال بعد مئی ۱۹۳۴ء میں کتلۃ العمل الوطنی کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم ہوئی جو مراکش میں پہلی قوم پرست تنظیم تھی۔ ایک سال میں اس کے ارکان کی تعداد دو لاکھ ہو گئی۔ اس تنظیم کی طرف سے فاس اور پیرس سے اخبارات شائع کیے جاتے تھے۔ یہ جماعت زیادہ تر عوام کی شکایات کو حکومت تک پہنچاتی تھی۔ آزادی کا مطالبہ اس نے بھی نہیں کیا بہر حال تنظیم کے رہنما علال فاسی نے اسی سال مراکش کے سلطان محمد خامس (۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۱ء) سے ملاقات کی اور

قومی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا اس کے بعد ہنگاموں اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں یہ جماعت توڑ دی گئی۔

علال الفاسی وسطی افریقہ کے علاقے گابون جلاوطن کر دیے گئے احمد بالافرج کسی طرح طنجہ پہنچ گئے جو بین الاقوامی انتظام میں تھا۔

حزبِ استقلال اور تحریک آزادی

مراکش میں آزادی کی تحریک حقیقی معنوں میں ۱۹۴۳ء میں اس وقت سے شروع ہوئی جب احمد بالافرج نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں بمقام طنجہ حزب استقلال قائم کی۔ علال الفاسی چونکہ جلا وطن تھے اس لیے وہ اس کی ابتدائی تشکیل میں عملی حصہ نہیں لے سکے لیکن بعد میں حزب استقلال کے سربراہ وہی ہوئے۔ اس کے بعد حزب استقلال نے اگلے سال سے مکمل آزادی کے لیے پورے زور شور سے مہم شروع کر دی۔ اس مہم سے سلطان محمد خامس نے ہمدردی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے فرانسیسی حکام بادشاہ کے خلاف ہو گئے اور ان کو برطرف کرنے کے لیے سازش کرنے لگے۔ ۱۹۵۱ء میں اس مقصد کے لیے بربر قبائل کو سلطان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب سلطان پھر بھی قابو میں نہیں آئے تو دو سال بعد اُن کو پہلے کورسیکا اور اس کے بعد مدغاسکر جلاوطن کر دیا۔ فرانس کے اس اقدام کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے اور ہنگامے شروع ہو گئے اور ریف کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔ آخر کار فرانس کو عوام کے مطالبوں کے آگے جھکنا پڑا، اور سلطان کو مراکش آنے کی اجازت مل گئی جہاں عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ سلطان کی واپسی حریت پسندوں کی زبردست کامیابی تھی۔ چنانچہ ۲۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ اور مراکش پر فرانس کی اس بالادستی کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۹۱۲ء سے قائم چلی آ رہی تھی۔ اگلے ماہ ۷۔ اپریل کو اسپین بھی ریف سے دستبردار ہو گیا اور وہ حسب سابق شریفی مملکت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی سال اکتوبر میں طنجہ کی بین الاقوامی حیثیت بھی ختم ہو گئی اور یہ ساحلی شہر مراکش کا گرمائی صدر مقام قرار پایا۔ آزادی کے بعد سلطان محمد خامس نے نماز جمعہ رباط میں موحدین کے دَور میں تعمیر کی جانے والی نامکمل جامع حسن میں ادا کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا ہے کہ عہدِ موحدین کی یہ عظیم الشان عمارت مغربی سلطنت کی گذشتہ عظمت و

قوت کی نشانی ہے۔

علال الفاسی

مراکش کی آزادی کی جدوجہد میں سب سے نمایاں نام علال الفاسی (پیدائش ۱۹۰۶ء) کا ہے جو سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ مراکش کے ایک عظیم مدبر، عالم اور ادیب بھی ہیں۔ تحریک آزادی کے لیے قربانیاں دینے کے علاوہ مراکش میں احیائے اسلام کی کوششوں میں بھی ان کا نمایاں ہاتھ ہے۔ فاس میں جب انہوں نے ۱۹۲۵ء میں خفیہ انجمن قائم کی تھی تو اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس کے علاوہ وہ تین جوانی ہی میں فاس کی جامعہ قرویین میں استاد ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جب مراکش میں ہنگامے ہوئے تو علال الفاسی کو فرانسیسی حکومت نے گرفتار کر کے گابون جلاوطن کر دیا اور نو سال بعد ۱۹۴۶ء میں ان کو وطن آنے کی اجازت ملی۔ لیکن ان کو جلد ہی پھر وطن چھوڑنا پڑا۔ اب علال الفاسی نے بیرونی ملکوں میں مراکش کی آزادی کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۷ء میں طنجہ میں حزب استقلال کی شاخ قائم کی۔ قاہرہ میں حزب استقلال نے جو دفتر قائم کیا اس کے سربراہ علال الفاسی ہی تھے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے یورپ، امریکہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کا دورہ کیا اور وطن کی آزادی کے لیے عالمی رائے عامہ ہموار کی۔

علال الفاسی رہنماؤں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو عرب ملکوں میں سلفی کہلاتے ہیں اور جن کا مقصد کتاب و سنت کی روشنی میں مسائل کو حل کرنا ہے۔ علال الفاسی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں شمالی افریقہ کی سیاسی تاریخ پر ہیں، ان کتابوں میں ''نقد الذاتی'' جو ان کی خودنوشت سوانح ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علال الفاسی جو اہل مغرب یعنی شمالی افریقہ کے تمام باشندوں کو ایک قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس کتاب میں لکھتے ہیں:[1]

''اہل مغرب (مراکش) کی قومی زندگی کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا مذہب اور

---

(۱) علال الفاسی کی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) الحرکات الاستقلالیہ فی المغرب العربی۔ یہ کتاب شمالی افریقہ کی آزادی کی تحریکوں کی تاریخ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں اس کا انگریزی ترجمہ (The independence Movement in arab noth africa) کے نام سے واشنگٹن سے شائع ہو چکی ہے۔ (۲) المغرب العربی (۳) محاضرات فی المغرب العربی۔ (۴) النقد الذاتی مطبوعہ ۱۹۵۲ء۔

معاشرے کی علیحدگی اور لادینی (سیکولر) ریاست کا تصور مسیحیت اور یورپی فکر کی پیداوار ہے۔ ایک اسلامی معاشرے میں نہ تو اس تصور کے لیے کوئی گنجائش ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ ایک اسلامی ریاست صرف مذہب پر ہی مبنی ہوسکتی ہے۔

''اسلام عقل اور آزادی پر زور دیتا ہے اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام خدا اور بندے کے درمیان تمام واسطوں کی نفی کرتا ہے لہٰذا اسلام کو (مغرب میں) ایک صحیح قومی تعلیم اور ایک جدید قانونی نظام کی بنیاد ہونا چاہیے۔ اسلام معاشی زندگی کی بنیاد بھی فراہم کرسکتا ہے اور اگر اس مقصد کے تحت اسلامی تعلیمات کو عملی شکل دی جائے تو سماجی انصاف کا ایک ایسا نظام قائم کیا جاسکتا ہے جو انسان کو معاشی غلامی سے نجات دلا سکے''

اسلام اور مغرب کی کشمکش

آزادی سے پہلے ''حزبِ استقلال'' مراکش کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اور اس کی یہ حیثیت آزادی کے بعد بھی کئی سال تک قائم رہی اور حکومت میں اس کو برابر نمائندگی ملتی رہی لیکن جنوری ۱۹۵۹ء میں جماعت اندرونی اختلافات کا شکار ہوگئی۔ استقلال میں شروع ہی سے دو گروہ موجود تھے۔ ایک وہ گروہ جس کے رہنما علال الفاسی تھے۔ یہ گروہ عرب اور اسلامی تہذیب کا علمبردار تھا اور مراکش میں مغربی ثقافتی اثرات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کا تعلق سلفی تحریک سے تھا اور وہ مراکش میں احیاء وتجدید کا کام اسلامی اصولوں کے تحت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ جس کے قائد احمد بالافرج اور حسن الوزانی تھے۔ مغربی تہذیب کے اثر میں تھا۔ پہلے گروہ میں جامع قرویین کے طلبہ شامل تھے اور دوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جنہوں نے مغربی مدارس میں تعلیم پائی تھی اور فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ علال الفاسی کی زبردست شخصیت ان دونوں گروہوں کو ایک مدت تک ایک ساتھ رکھنے میں کامیاب رہی۔ لیکن ان کے یہ اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مغرب پرستوں کا ایک گروہ جو سوشلزم کی طرف مائل تھا جنوری ۱۹۵۹ء میں استقلال سے الگ ہوگیا اور ہردلعزیز قوتوں کی قومی یونین (U.N.F.P) کے نام سے اس نے ایک علیحدہ جماعت بنالی۔ مہدی بن برقہ اس نئی جماعت کے رہنما تھے۔ اس افتراق نے حزب استقلال کو کمزور کردیا۔ اور جب ۱۹۶۳ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو

نو تشکیل یافتہ سرکاری پارٹی (F.D.I.C) نے ۶۹، حزب استقلال نے ۴۱ اور (U.N.F.P) نے ۲۸ نشستیں حاصل کیں۔ اس کے بعد سے حزب استقلال حزب مخالف کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حزب استقلال نے ۴۵، یو۔ این۔ ایف۔ پی نے ۲۹ سوشلسٹ یونین نے ۱۶ اور آزاد امیدواروں نے ۸۱ نشستیں حاصل کیں۔

دوسرے نو آزاد ملکوں کی طرح آزادی کے بعد مراکش کا ایک اہم مسئلہ آئین کی تیاری تھی۔ اسلامی نظام کے علمبردار جن میں جامعہ قرویین کے اساتذہ سب سے نمایاں تھے، نئے آئین کی تشکیل اسلامی اصولوں کے تحت کرنا چاہتے تھے۔ ہر اسلامی ملک کی طرح مراکش میں بھی اسی مطالبے کو عوام کی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ جب مراکش کے ایک راہنما اور ادیب محمد مکی ناصری نے ۱۹۵۷ء میں سلطان محمد خامس کو مولانا مودودی[1] کی کتاب ''اسلامک لاء اینڈ کانسٹی ٹیوشن'' کا ایک نسخہ پیش کیا تو سلطان نے اسے پڑھ کر کہا کہ ''میں انشاء اللہ ملک کی گاڑی کو اسی کے مطابق چلاؤں گا۔''

سلطان محمد خامس کا فروری ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ نیا دستور اس کے بعد جلد ہی مکمل ہو گیا اور شاہ حسن دوم نے جو اپنے باپ کے بعد تخت حکومت پر بیٹھے، دسمبر ۱۹۶۲ء کو نیا دستور نافذ کر دیا۔ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے یہ دستور بادشاہ نے خود تیار کیا اور اس پر استصواب عام کرایا۔ دستور کے حق میں ۷۳ لاکھ سے زیادہ ووٹ آئے اور مخالفت میں صرف ایک لاکھ تیرہ ہزار ووٹ آئے۔ ملک کی تمام دینی جماعتوں، خواتین کی انجمنوں، طلبہ کی یونینوں اور صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والی جماعتوں نے دستور کے حق میں رائے دی۔ البتہ کمیونسٹوں اور بائیں بازو والے اشتراکی عناصر نے مخالفت میں رائے دی۔ دستور کی کامیابی کا سہرا بڑی حد تک استقلال پارٹی کے راہنما علال الفاسی کے سر ہے جنہوں نے دستور کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔

---

(۱) مولانا مودودی کی کتابیں شمالی افریقہ خصوصاً مراکش میں بڑی مقبول ہیں۔ ان کے رسالہ دینیات کا عربی ایڈیشن محمد مکی طنجہ سے شائع کر چکے ہیں۔ رباط کے نیم سرکاری پرچے دعوت الحق میں مولانا مودودی کے مضامین پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ المغرب العربی میں مولانا مودودی کی تصانیف اور تصورات کو پھیلانے میں مشہور الجزائری عالم محمد بشیر ابراہیمی اور مراکش کے جید عالم عبداللہ کنون سابق وزیر قانون مراکش کے نام قابل ذکر ہیں۔

جدید دستور کی رُو سے ملک کا سرکاری مذہب اسلام اور زبان عربی قرار دی گئی تھی۔ دستور میں کہا گیا تھا کہ دین کی حمایت حکمراں کا فرض ہوگا۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا اور نظام حکومت پارلیمانی قرار دیا گیا تھا۔ اس دستور میں اگرچہ یہ واضح نہیں کیا گیا تھا کہ دستور سازی کا ماخذ کتاب وسنت ہوں گے یا نہیں، لیکن اسلام پسند جماعتوں نے دستور کی حمایت اس بنیاد پر کی کہ دستور میں ترمیم کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے دستور میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کو دُور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مراکش کا یہ دستور زیادہ مدت نہیں چلا۔ شاہی اختیارات اور دوسرے مسائل پر سیاسی جماعتوں سے بادشاہ کا اختلاف بڑھتا گیا۔ مراکش کے سب سے بڑے شہر (دارالبیضاء کا سابلانکا) میں وسیع پیمانے پر ہنگاموں کے بعد ۱۹۶۵ء میں بادشاہ نے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا اور مراکش کا دستور معطل کر دیا۔ پانچ سال بعد مارچ ۱۹۷۲ء میں استصواب رائے حاصل کرنے کے بعد شاہ حسن نے دوسرا آئین نافذ کیا، جس کے بعد بادشاہ نے حزب استقلال اور یو۔ این۔ ایف۔ پی کو حکومت میں شرکت کی دعوی دی۔ لیکن جب ان پارٹیوں نے حکومت میں شرکت کے لیے چند بنیادی شرائط پیش کیں جن کو شاہ حسن نے منظور نہیں کیا۔ اب اس وقت مراکش کی سیاسی صورت یہ ہے کہ ملک میں آئینی بادشاہت کا نظام قائم ہے اور بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود ہے۔ سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں جن میں اشتراکی جماعتیں بھی ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حزب استقلال نے ۴۵، پاپولر تحریک نے ۲۹۔ سوشلسٹ یونین نے ۱۶، اور آزاد امیدواروں نے ۸۱ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اخبارات بھی آزاد ہیں۔

جولائی ۱۹۷۱ء میں فوج کے ایک حصہ نے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا بادشاہت ختم کرنا چاہی لیکن وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف جنرل محمد افکیر نے بغاوت کچل دی۔ ۱۹۷۲ء میں شاہ حسن پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی گئی جس کے بعد جنرل محمد افکیر نے خودکشی کر لی اور فوج کی کمان بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ۱۹۷۳ء میں بھی ملک میں دہشت پسندانہ سرگرمیاں جاری رہیں جن میں لیبیا کے صدر قذافی کا ہاتھ تھا اور وہ بائیں بازو کے عناصر سے ساز باز کر کے حکومت کا تختہ پلٹنا چاہتے تھے۔ شاہ حسن اب تک ان تمام کوششوں کو ناکام بنا چکے ہیں۔ اس کی اک وجہ یہ ہے کہ شاہ حسن کو ملک میں عوامی مقبولیت حاصل ہے اور [illegible] کامیابی بھی حاصل

کی ہے۔ بادشاہ کی کامیابی کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ملک میں کوئی مضبوط حزب اختلاف موجود نہیں اور مخالف قوتیں کئی جماعتوں میں تقسیم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شاہ حسن کی دور اندیشی اور عوام کے جذبات اور نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت اب تک ان کو کامیاب کرتی آئی ہے۔ شاہ حسن نے کئی ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے ان کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہوا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں رباط میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد کی۔ اس موقع پر فاس میں ایک تعلیمی کانفرنس بھی طلب کی جس میں اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے ماہرین تعلیم نے شرکت کی۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے فرانسیسی اور ہسپانوی باشندوں کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین قومی ملکیت میں لے کر کسانوں میں تقسیم کر دی۔ سمندر میں ماہی گیری کی حدود بارہ میل سے بڑھا کر ستر میل کر دی، اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں اسرائیل کے خلاف فوجی دستہ بھیج کر جنگ میں عملی حصہ لیا۔ جولائی ۱۹۷۴ء کے بعد مطابق ہسپانوی صحرا کو حاصل کرنے کے لیے شاہ حسن نے جو کوششیں کیں ان سے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ملک کی حزب اختلاف کی جماعتوں نے ان کوششوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

ہسپانوی صحرا کا الحاق

ہسپانوی صحرا مراکش کے جنوب میں ایک لاکھ مربع میل پر مشتمل ایک وسیع صحرائی علاقہ ہے۔ جس کی آبادی ایک لاکھ سے بھی کم ہے۔ مراکش جس طرح موریتانیا پر اپنا حق سمجھتا تھا اسی طرح وہ ہسپانوی صحرا کو بھی مراکش ہی کا ایک حصہ تصور کرتا تھا جس پر ہسپانیہ نے ۔ء میں ایک لاکھ رضا کاروں کو لے کر ہسپانوی صحرا کی سرحد تک مارچ کیا جس کے نتیجے میں ۱۴ نومبر کو مراکش، موریتانیا اور اسپین کے درمیان ایک سہ فریقی سمجھوتہ ہو گیا۔ جب اسپین نے اس علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں تو مراکش نے اس سمجھوتہ کے تحت ہسپانوی صحرا کے دو تہائی حصہ پر قبضہ کر لیا اور ایک تہائی حصہ ماری تانیا نے اپنے ملک میں ملا لیا۔ لیکن صحرا کے چھاپہ ماروں نے جو اشترا کی تنظیم پولیساریو کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس تصفیہ کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ صحرا کو ایک آزاد مملکت دیکھنا چاہتے ہیں۔ الجزائر نے بھی اس تصفیہ کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اس وقت سے پولیساریو چھاپہ ماروں کی مدد کر رہا ہے۔ کئی کمیونسٹ ملکوں سے بھی ان کو امداد مل رہی ہے۔ موریتانیا کی حکومت ان چھاپہ ماروں کا زیادہ عرصہ مقابلہ نہ کر سکی اور وہ اگست ۱۹۷۹ء میں صحرا کے علاقے سے پولیساریو کے حق

میں دست بردار ہوگئی۔ مراکش نے اس کے بعد موریتانیا کے حصہ پر بھی قبضہ کرلیا اور اس طرح پورے ہسپانوی صحرا کو مراکش میں ضم کرلیا۔ اور اس کو المغرب الجنوبی کا نام دیا۔ پولسیاریو کے چھاپہ ماروں کی وجہ سے ابھی تک یہ علاقہ مراکش کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے، لیکن اس بارے میں شاہ حسن کو مراکش کے ہر طبقہ اور جماعت کی حمایت حاصل ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ خطہ مراکش ہی کا ایک حصہ ہے اور اس صحرائی علاقہ کا مستقبل جس کا رقبہ ایک لاکھ دو ہزار مربع میل (۲ لاکھ ۶۶ ہزار مربع کلومیٹر اور جس کی آبادی صرف ۷۵ ہزار ہے ایک آزاد مملکت کی بجائے مراکش کے ساتھ انضمام سے بہتر ہوسکتا ہے۔ ایک آزاد اور بے وسائل صحرا صرف کمیونسٹوں کی سازشوں کا مرکز بن سکتا ہے۔ اس معاملہ میں الجزائر اور لیبیا کی پالیسی ایک مستحکم ملک مراکش کو نقصان تو پہنچا سکتی ہے لیکن اس سے کسی مفید نتیجہ کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

تعمیر و ترقی

زراعت اور کان کنی مراکش کی معیشت کی بنیادیں ہیں۔ مراکش افریقہ کے ان ملکوں میں سے ہے جو غذائی پیداوار میں خود کفیل ہیں۔ زمین زرخیز ہے اور پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔ بارش بھی کافی ہوتی ہے اور یہ شمالی افریقہ کا واحد ملک ہے جس میں کئی دریا موجود ہیں جن کا پانی متعدد بند باندھ کر آبپاشی کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان نہری علاقے میں ½۷ ۲ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں دس لاکھ ٹن غلہ فاضل پیدا ہوا تھا۔ گیہوں، بارلی اور مکئی اہم غذائی پیداوار ہیں۔ زیتون کثرت سے ہوتا ہے اور پھلوں میں انگور اور دوسرے رس دار پھل وافر مقدار میں ہوتے ہیں۔ مویشی بانی اور ماہی گیری کو بھی معیشت میں اہم حیثیت حاصل ہے۔

معدنی پیداوار کے لحاظ سے بھی مراکش خوش قسمت ملک ہے۔ لوہا، کوئلہ، سیسہ، جست، مینگنیز، اور فاسفیٹ نکالا جاتا ہے۔ فاسفیٹ کے ذخیرے دنیا کے عظیم ترین ذخیروں میں شمار ہوتے ہیں اور مراکش کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ فاسفیٹ برآمد کرنے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ فاسفیٹ کے ذخیروں کا اندازہ اکیس ارب ٹن کیا گیا ہے جس سے ۴۲ لاکھ ٹن یورے نیم نکالا جاسکتا ہے۔ اس طرح کوبالٹ پیدا کرنے والے ملکوں میں مراکش تیسرا بڑا ملک ہے۔

پٹرول کے ذخیروں کا بھی پتہ چلا ہے اور اب نکلنا بھی شروع ہو گیا ہے لیکن لوہے اور کوئلے کی طرح تیل کی پیداوار زیادہ نہیں ہے۔ المغرب الجنوبی میں امن قائم ہونے کے بعد مراکش وہاں کے معدنی ذخیروں سے بھی فائدہ اٹھا سکے گا۔

صنعت ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ سیمنٹ اور پارچہ بافی کے کارخانے ہیں۔ کپڑے کی ضرورت میں ملک خود کفیل ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ جلد کپڑا برآمد بھی ہونے لگے گا۔ بیرونی اور نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ جنوری ۱۹۷۸ء میں روس اور مراکش کے درمیان دو ارب ڈالر کا ایک تیس سالہ معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت بندرگاہ الصویرہ کے ساٹھ میل مشرق میں واقع فاسفیٹ کے ذخیروں کو ترقی دی جائے گی اور بندرگاہ تک ریل کی پٹری بھی بچھائی جائے گی۔ سیاحت زرِ مبادلہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے سیاحت کی دنیا میں مراکش کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ افریقہ میں مصر کے بعد اتنی اہم اور کثیر تاریخی یادگاریں کسی دوسرے ملک میں نہیں بلکہ اسلامی یادگاروں کے لحاظ سے مراکش کو مصر پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مراکش کے خوبصورت مناظر اور گرم ساحل اور معتدل موسم عرب دنیا میں مثال نہیں رکھتے اور موسم سرما اور گرما دونوں میں اہل یورپ کے لیے باعث کشش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا میں ملیشیا کے بعد سب سے زیادہ سیاح مراکش آتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں پندرہ لاکھ اور ۱۹۷۶ء میں بارہ لاکھ سیاح مراکش آئے تھے۔ اس کے علاوہ تونس اور الجزائر کی طرح مراکش کے باشندے بھی کثیر تعداد میں فرانس اور یورپی ملکوں میں ملازم ہیں اور حکومت لوگوں کو باہر بھیجنے کے کام میں حوصلہ افزائی کرتی ہے تاکہ ملک زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ حاصل کر سکے۔

ملک میں سماجی تحفظ کا نظام قائم ہے۔

تعلیم اور ادب

۱۹۶۳ء سے ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ ملک میں دو یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے کئی ادارے ہیں۔ فاس میں جامعہ القرویین کے نام سے دینی تعلیم کا مدرسہ موجود ہے جو شمالی افریقہ کا سب سے قدیم مدرسہ ہے۔ مراکش کتابوں کی نشر و اشاعت کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے کتب خانے بھی اپنے مخطوطات کی کثرت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ العلم (رباط) جو حزبِ استقلال کا ترجمان ہے، تیس ہزار چھپتا ہے اور فرانسیسی کا اخبار لا اوپی نین (L,opinion) ساٹھ ہزار چھپتا ہے۔

مراکش کے علماء میں محمد الفاسی (پیدائش ۱۹۰۸ء) ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ جمعیت علمائے مراکش کے نائب صدر ہیں۔ جامعہ القرویین کے شیخ اور محمد خامس یونیورسٹی (رباط) کے ریکٹر ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں فاس میں اسلامی ملکوں کی جو تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی اس کے بلانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ عربی اور فرانسیسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

مراکش کی دوسری اہم علمی شخصیت عبداللہ کنون کی ہے۔ وہ عربی زبان و ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور اسلامی فقہ، قانون اور اسلامی تاریخ کے ماہر ہیں۔ شمالی افریقہ کی علمی، دینی اور ادبی تاریخ پر بنیادی تحقیق کی ہے۔ یہ کام انہوں نے اس زمانہ میں کیا جب وہ تطوان کے "معہد مولائے حسن" (ادارۂ تحقیقات) کے ڈائریکٹر تھے۔ مراکش میں اسلامی تحریک کے سرخیلوں میں سے ہیں۔[1] مراکش کے ممتاز دینی ماہنامہ "لسان الدین" کے عرصہ تک مدیر رہے۔

مراکش کی ایک اور ممتاز علمی شخصیت عبدالرحیم غنیمہ کی ہے۔ اسلامی علوم اور جدید علوم دونوں پر گہری نظر ہے۔ اسلامی فقہ اور تاریخ پر ان کی کئی تحقیقی کتابیں مصر اور مراکش میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب الجامعات الاسلامیہ الکبریٰ (بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیاں) ہے۔ اس میں انہوں نے اسلام کے دورِ اوّل سے لے کر عہدِ حاضر تک ملت اسلامی کی تعلیمی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ تطوان کے تحقیقی ادارے نے اس کتاب پر ۱۹۵۲ء میں مصنف کو انعام دیا تھا۔

ہسپانوی صحرا کے الحاق سے پہلے مراکش کا رقبہ ایک لاکھ ۷۲ مربع میل تھا۔ اب ایک لاکھ ۷۴ ہزار مربع میل ہو گیا ہے۔ آبادی میں عرب اور بربر نسل کے باشندے برابر تعداد میں ہیں لیکن بربروں کی اکثریت عربی زبان بولتی ہے۔ تمام آبادی مسلمان ہے۔ آزادی سے قبل چار لاکھ فرانسیسی عیسائی تھے جن کی بڑی تعداد ملک چھوڑ کر فرانس چلی گئی۔ یہودی بھی ساٹھ ستر ہزار تھے، لیکن ان کی بڑی تعداد اسرائیل چلی گئی ہے۔ بندرگاہ البیضا (کاسابلانکا) سب سے بڑا شہر ہے جس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ رباط دارالحکومت ہے۔ مراکش، فاس اور مکناس قدیم تاریخی شہر ہیں۔ طنجہ ملک کا سرمائی صدر مقام ہے۔

(۱) خلیل احمد حامدی: نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں ص ۹، ۱۰ اسلامک پبلی کیشنز لاہور

باب ۳۹

اسلامی جمہوریہ موریتانیا

دوسری عالمی جنگ کے بعد افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں آزادی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ برطانیہ اور فرانس کو جو براعظم افریقہ کے بیشتر حصے پر قابض تھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اب یہ طوفان رو کے نہ رکے گا۔ برطانیہ نے اس نازک صورت حال کا سب سے پہلے احساس کیا اور اس نے یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو سوڈان کو اور اسی سال ستمبر میں نمانا کو آزادی دے دی۔ اسی سال فرانس نے تونس اور مراکش کی آزادی بھی تسلیم کر لی۔ الجزائر کا مسئلہ تو کئی سال الجھا رہا۔ لیکن فرانس کے صدر جنرل ڈیگال نے ۱۹۵۸ء میں باقی سلطنت فرانس کے لیے نئے آئین کا اعلان کیا۔ جس کے تحت فرانسیسی برادری (french community) کے نام سے ایک دولت مشترکہ قائم کی گئی۔ آئین کی رُو سے سمندر پار کی فرانسیسی نوآبادیوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو نئے آئین سے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں۔ اگر انہوں نے آئین کو مسترد کر دیا تو وہ آزاد ہو جائیں گے اور فرانس سے ان کے تعلقات ختم ہو جائیں گے لیکن اگر انہوں نے آئین کو منظور کر لیا تو وہ فرانسیسی دولت مشترکہ یا برادری کے رکن کی حیثیت سے اندرونی خود مختاری حاصل کر سکیں گی۔ اس زمانے میں فرانسیسی مغربی افریقہ آٹھ اور فرانسیسی استوائی افریقہ چار علاقوں میں تقسیم تھا جن کی حیثیت صوبوں کی تھی۔ آزادی کا حق ان میں سے ہر صوبے یا نوآبادی کو دیا گیا تھا۔ جنرل ڈیگال کے اعلان سے سب سے پہلے گنی نے فائدہ اٹھایا اور ۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کے استصواب میں فرانس سے تعلقات ختم کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے علاقوں نے بھی گنی کی تقلید کی اور چار سال کے اندر اندر افریقہ کے بیشتر ملک یورپ کی غلامی سے آزاد ہو گئے۔

موریطانیہ فرانسیسی مغربی افریقہ اور استوائی افریقہ میں آخری مملکت ہے جس نے فرانس سے آزادی حاصل کی۔ یہ المغرب العربی کا چوتھا ملک ہے جس پر دنیائے عرب کی مغربی حدود ختم

ہو جاتی ہیں۔ موریتانیا، مراکش کے جنوب میں واقع ہے اور پورا کا پورا صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہے۔ عہد قدیم میں اس علاقے کو شنقیط کہا جاتا تھا۔ موریتانیا دراصل بربر نسل کے باشندوں کی سرزمین ہے جنہوں نے عرب آباد کاروں کے ساتھ صدیوں کے میل جول اور شادی بیاہ کے نتیجے میں عرب حیثیت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اس وقت ملک کے اسی فیصد باشندوں کی زبان عربی ہے اور صرف بیس فیصد باشندے جو سینے گال سے متصل علاقہ میں رہتے ہیں ایسے ہیں جو نیگرو نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف مقامی زبانیں بولتے ہیں۔ موریتانیا کی تہذیب و ثقافت پر مراکش کے اثرات گہرے ہیں اور سولہویں صدی کے بعد سے یعنی اس وقت سے جب مراکش کے منصور الذہبی نے مالی پر قبضہ کیا تھا،[1] موریتانیا پر مراکش کی سیاسی بالادستی عرصۂ دراز تک قائم رہی۔ اس سے قبل رابطین اور موحدین کے دَور میں بھی یہ خطہ مراکش کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب فرانس نے مغربی افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کی تو موریتانیا بھی فرانس کی جارحانہ کارروائیوں سے نہ بچ سکا اور فرانس نے آہستہ آہستہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۰۳ء میں موریتانیا کو فرانسیسی محروسہ مملکت (protectorate) قرار دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں فرانس نے موریتانیا کو نو آبادی کا درجہ دیا۔ فرانسیسی دَور میں موریتانیا انتظامی لحاظ سے فرانسیسی مغربی افریقہ کا ایک حصہ تھا اور ایک گورنر جنرل کے تحت تھا جس کا صدر مقام سینے گال کا شہر ڈاکر تھا۔ فرانسیسی مغربی افریقہ انتظامی لحاظ سے آٹھ علاقوں میں تقسیم تھا جن میں ایک موریتانیا تھا اور باقی سات علاقے سینے گال، مالی، نائیجر، بالائی وولٹا، آئیوری کوسٹ (ساحل عاج) اور دیہومی تھے۔ ان میں آخر الذکر تین علاقوں کو چھوڑ کر باقی پانچ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

تحریک آزادی

جب موریتانیا میں آزادی کی تحریک چلی تو شمالی موریتانیا کی حمایت "نہضۃ الوطنیہ" مراکش کے ساتھ الحاق کی حامی تھی، لیکن حکومت فرانس نے اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ دوسری جماعت یونین نیشنل موریتانیا جو جنوب کے نیگرو باشندوں کی ترجمانی کرتی تھی۔ مالی کے

(۱) مالی پر منصور الذہبی کے حملے کی تفصیل کے لیے دیکھئے "ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ" حصہ دوم۔

ساتھ وفاق بنانے کی حامی تھی۔ اس جماعت نے ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ایک دوسری جماعت پی۔ آر۔ ایم سے، جس کی قیادت مختار الداداہ کر رہے تھے، معاہدہ کر کے متحدہ محاذ بنالیا۔ فرانس کے نئے آئین کے بعد موریتانیا نے ۲۷۔ نومبر ۱۹۵۸ء کو اسلامی جمہوریہ بننے کا اعلان کر دیا تھا۔ ۲۵۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو علاقائی اسمبلی نے جمہوریہ اسلامیہ موریتانیا کے نئے آئین کو منظور کر لیا۔ ۲۴۔ مئی ۱۹۵۹ء کو علاقائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں حکمران پارٹی نے تمام نشستوں پر قبضہ کر لیا اور محمد مختار الداداہ وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد نئی حکومت نے فرانس سے آزادی کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا اور ۲۵۔ نومبر ۱۹۶۰ء کو موریتانیا آزاد ملکوں کی صف میں آ گیا۔ لیکن عرب ملکوں میں سوائے تونس کے کسی نے موریتانیا کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ ممالک مراکش کے اس دعوے کے حامی تھے کہ موریتانیا علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جغرافیائی، تاریخ اور نسلی لحاظ سے مراکش کا ایک حصہ ہے۔ یہ اختلاف ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۹۔ جون ۱۹۷۰ء کو مراکش اور موریتانیا نے دوستی کے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے اور مراکش کی حکومت نے موریتانیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور موریتانیا پر اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی۔ دونوں ملکوں نے یہ بھی طے کیا کہ مراکش اور موریتانیا کے درمیان رایو دی اورو کے علاقے کو جس پر اسپین کا قبضہ تھا اور جسے ہسپانوی صحرا بھی کہا جاتا تھا، اسپین کے تسلط سے آزاد کرانے میں دونوں ملک تعاون کریں گے۔ مراکش سے اس تصفیہ کے بعد ۱۹۷۳ء میں موریتانیا کو عرب لیگ کا رکن بنالیا گیا۔

مختار الداداہ

موریتانیا کے وزیر اعظم مختار الداداہ (پیدائش ۱۹۲۴ء) جو نئے صدارتی آئین کی منظوری[1] کے بعد ۲۔ اگست ۱۹۶۱ء کو صدر منتخب ہوئے فرانس کے تعلیم یافتہ تھے۔ سینے گال کے دارالحکومت ڈاکر میں جو اس وقت فرانسیسی مغربی افریقہ کا دارالحکومت بھی تھا وکالت کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں سیاست میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں موریتانیا کی اندرونی خود مختاری کے بعد وہاں کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ وہ پارٹی گروپ منٹ (P.R.M) کے رہنما تھے اور ان کی بیوی فرانسیسی

---

(۱) یہ آئین ۲۰۔ مئی ۱۹۶۱ء کو نافذ کیا گیا تھا۔

ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے بعد وہ ہر پانچ سال بعد صدر منتخب ہوتے رہے۔ آخری اور چوتھی بار وہ ۱۹۷۶ء میں صدر منتخب ہوئے۔ ملک کا نیا آئین ۲۰ مئی ۱۹۶۱ء کو نافذ کیا گیا تھا اور اس کے تحت صدارتی نظام قائم کیا گیا تھا اور ایک ایوانی اسمبلی قائم کی گئی تھی۔

آزادی سے پہلے موریتانیا کا صدر مقام سینٹ لوئی تھا جو اب سینے گال میں ہے۔ ۱۹۵۷ء میں صدر مقام نواک شوط منتقل کر دیا گیا۔ یہاں فرانس کی مدد سے ایک جدید طرز کا شہر آباد کیا گیا ہے۔ آزادی سے پہلے نواک شوط کی آبادی صرف پانچ ہزار تھی، اب آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں موریتانیا نے فرانسیسی برادری (frence community) یا فرانسیسی دولت مشترکہ کو چھوڑ دیا اور ۱۹۷۳ء میں فرانسیسی سکہ فرنک کے حلقہ سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد فرانس نے موریتانیا کی فوجی امداد بند کر دی۔

ہسپانوی صحرا

پچھلے سالوں میں ہسپانوی صحرا کے مسئلے کی وجہ سے موریتانیا کی سیاست اور معیشت پر گہرا اثر پڑا۔ اس علاقے پر مراکش کے علاوہ موریتانیا کا بھی دعویٰ تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جب اسپین نے صحرا سے نکلنے کا اعلان کیا تو موریتانیا نے بھی اس علاقہ پر دعویٰ کیا۔ طویل مذاکرات کے بعد نومبر ۱۹۷۵ء میں اسپین، مراکش اور موریتانیا کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت فروری ۱۹۷۶ء تک کے لیے ہسپانوی صحرا میں ایک سہ ملکی انتظام قائم کیا گیا۔ ہسپانوی فوج کے انخلا کے بعد صحرا کا ایک تہائی حصہ موریتانیا کو ملا اور دو تہائی مراکش میں ضم کر دیا گیا۔ لیکن صحرا کے پولیسار یو چھاپہ ماروں سے مسلسل جنگ موریتانیا کے محدود وسائل کی وجہ سے بہت مہنگی پڑی۔ چھاپہ ماروں کے حملوں کی وجہ سے لوہے کے ذخیروں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا، کیونکہ یورپی فنی ماہر فرار ہو گئے۔ آخر کار ۱۰۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو بری فوج کے سربراہ مصطفیٰ سالک نے صدر مختار کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور ان کو نظر بند کر دیا۔ ملک کا نظم و نسق فوج نے سنبھال لیا۔ آئین منسوخ کر دیا اور ملک کی پارلیمنٹ اور واحد سیاسی جماعت پی۔ آر۔ ایم کو توڑ دیا گیا...... اور نئی حکومت نے پولیساریو سے معاہدہ کر لیا اور صحرا میں اپنے علاقے سے پولیساریو کے حق میں دست بردار ہو گئی، جس کے بعد مراکش نے صحرا کا یہ علاقہ بھی مراکش میں ضم کر لیا۔

مختار دادہ اٹھارہ سال تک موریتانیا کے صدر رہے۔ ان کے بعد سے ملک مستقل بحران میں مبتلا ہے۔ تازہ ترین تبدیلی جنوری ۱۹۸۰ء کے پہلے ہفتہ میں آئی جب موریتانیا کے فوجی وزیر اعظم نے صدر کو معزول کر دیا۔

تعمیر و ترقی

موریتانیا کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا ان کا پیشہ ہے۔ زراعت صرف دریائے سینے گال کی وادی میں ہوتی ہے۔ قدرتی وسائل بہت کم ہیں۔ ہاں لوہے اور تانبے کے وسیع ذخیرے ہیں جن سے صدر مختار دادہ کے زمانہ سے یورپی کمپنیوں کی مدد سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے کانوں کے علاقے سے بندرگاہ اتینے (etienne) تک ریل کی پٹڑی بچھائی گئی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ایک کروڑ ٹن لوہا نکالا گیا اور اکیس ہزار ٹن تانبا نکالا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں ۸۲ لاکھ ٹن تانبا نکالا گیا۔ کانوں کا انتظام جن مغربی کمپنیوں کے سپرد تھا وہ اپنا سارا منافع باہر بھیج دیتی تھیں اور ملکی معیشت کے فروغ میں کوئی حصہ نہیں لیتی تھیں، اس لیے نومبر ۱۹۷۴ء میں لوہے کی کانوں کو اور فروری ۱۹۷۵ء میں تانبے کی کانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ لوہا فورٹ ویرک کے مقام پر اور تانبا اکشوف کے مقام پر پایا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ ذخیرے بیس سال تک کام آئیں گے۔ سعودی عرب کی مدد سے تیل صاف کرنے کے کارخانے اور فولاد کے کارخانے کے قیام پر کام ہو رہا ہے۔ جنوری ۱۹۷۸ء کو ایک اعلان میں بتایا گیا کہ ریاستی کان کنی کی کمپنی کو مغربی ملکوں، عرب ملکوں اور عالمی بنک نے لوہا نکالنے کے لیے موریتانیا کو ۳۶ کروڑ ڈالر کے قرضے دیے ہیں۔ دارالحکومت سے مختلف مقامات تک سڑکیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ لوگوں کو معاشی تحفظ بھی فراہم کیا گیا ہے اور بڑھاپے کا الاونس دیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، لیکن صرف بارہ فیصد آبادی زیر تعلیم ہے۔ ۱۹۶۷ء سے عربی اور فرانسیسی لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہیں۔ خواندگی ۱۹۷۳ء میں پانچ فیصد تھی۔ فرانسیسی دور میں نیگرو باشندوں نے تعلیم سے زیادہ فائدہ اٹھایا اس لیے کہ وہ دریائے سینے گال کی مستقل آباد بستیوں میں رہتے تھے اور دارالحکومت سینٹ لوئی بھی اسی علاقہ میں تھا۔ بربر زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔ بربروں کی طرح نیگرو باشندے بھی تقریباً سب

مسلمان ہیں۔

اسلامی تحریک

مغربی افریقہ میں فرانس سے آزاد ہونے والے ملکوں میں موریطانیہ واحد ملک ہے جس نے اسلامیہ جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے ورنہ باقی تمام مسلمان ملکوں میں دین وسیاست کو الگ کر دیا گیا ہے اور تمام حکومتیں سیکولر ہیں۔ موریتانیا کا اسلامی جمہوریہ قرار دیا جانا وہاں کے عوام کے دباؤ کا اثر ہے۔ عوام کے اس دباؤ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ حلقوں کی طرف سے وسیع پیمانے پر حکومت سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں حکومت اسلامی قانون نافذ کرے۔ جہاں تک عائلی معاملات کا تعلق ہے ان میں پہلے ہی اسلامی قانون نافذ ہے، لیکن اب دیوانی اور فوجداری معاملات اور محنت اور سرمایہ کاری سے متعلق تمام معاملات میں اسلامی قانون نافذ کرنے کا مطابہ کیا جا رہا ہے۔

موریتانیا کی تقریباً پوری آبادی مسلمان ہے۔ مساجد کی کثرت ہے۔ لوگ عام طور پر نماز کے پابند ہیں۔ دینی مدارس کی خاصی تعداد موجود ہے اور سرکاری زبان عربی ہے۔ اہل موریتانیا کی دینی حمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران کئی عرب ملکوں کی طرح موریتانیا نے بھی امریکہ سے سفارتی تعلقات ختم کر لیے تھے۔

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے جولائی ۱۹۷۷ء میں دارالحکومت نواکشوت میں افریقہ میں مسلمان مبلغوں اور اماموں کی تربیت کے مرکز کا افتتاح ہوا۔

سیاہ فام باشندوں

کی

دنیا

۱۔ سینیگال	۷۶ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۹۶ ہزار مربع کلومیٹر	۵۳ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔ مالی	۴ لاکھ ۶۴ ہزار مربع میل بارہ لاکھ مربع کلومیٹر	۶۱ لاکھ
۳۔ گنی	۹۵ ہزار مربع میل دو لاکھ ۴۵ ہزار کلومیٹر	۴۸½ لاکھ
۴۔ گیمبیا	۴ ہزار مربع میل دس ہزار مربع کلومیٹر	۵½ لاکھ
۵۔ نائیجر	۴ لاکھ ۸۹ ہزار مربع میل ۱۲ لاکھ ۸۷ مربع کلومیٹر	۵۰ لاکھ
۶۔ چاڈ	۴ لاکھ ۹۵ ہزار مربع میل ۱۳ لاکھ مربع کلومیٹر	۴۴ لاکھ
۷۔ نائیجریا	۳ لاکھ ۵۶ ہزار مربع میل ۹ لاکھ ۲۳ ہزار مربع کلومیٹر	۸ کروڑ ۴۵ لاکھ

باب ۴۰

جمہوریہ سینیگال

مغربی افریقہ کے نیگرو علاقوں میں سب سے پہلے سینیگال کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں مرابطین کے مشہور مبلغ اور راہ نما عبداللہ بن یٰسین نے ۱۰۵۰ء کے قریب دریائے سینیگال کے ایک جزیرے میں اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا تھا۔ سب سے پہلے سینیگال قبیلے تکرور کے حکمران نے اسلام قبول کیا اور ۱۰۷۶ء میں نمانا کی مظاہر پرست حکومت کو تسخیر کرنے میں مرابطین کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہاں کے باشندوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور اس وقت سینیگال کی ۹۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

سینیگال عہد قدیم میں زیادہ تر ان بڑی سلطنتوں کے زیر اثر رہا ہے۔ جو دریائے نائیجر کی وادی میں قائم ہوتی رہی تھیں۔ چنانچہ نمانا، مالی اور سونگھائی تمام سلطنتوں کی سینیگال پر کسی نہ کسی شکل میں بالا دستی قائم رہ چکی ہے۔ ۱۵۵۹ء میں ایک مقامی قبیلہ ''فولا'' جو مظاہر پرست تھا سینیگال پر قابض ہو گیا اور ۱۷۷۶ء تک سینیگال پر اس غیر مسلم قبیلے کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد فولا قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔

یورپ کی قوموں میں سب سے پہلے پرتگالی ۱۴۴۴ء میں سینیگال پہنچے۔ انہوں نے مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اور غلاموں کی خرید و فروخت کو وسیع پیمانے پر رواج دیا۔ دو سو سال بعد ۱۶۴۵ء میں فرانسیسی آئے اور انہوں نے دریائے سینیگال کے دہانے پر اس جگہ جہاں بعد میں سینٹ لوئی کا شہر آباد ہوا ایک فیکٹری قائم کی۔

حاجی عمر تجانی

یورپ کی دوسری قوموں کی طرح فرانسیسیوں نے بھی تجارت کی آڑ میں سینیگال کے داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اندرون ملک قدم بڑھانا شروع کر دیا۔ سینیگال میں جن لوگوں نے فرانسیسیوں کا جم کر مقابلہ کیا ان میں حاجی عمر تجانی (۱۷۹۷ء تا

۱۸۶۵ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ حاجی عمر تجانی سینے گال کے علاقے فوتو تورو کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق قبیلہ تکرور سے تھا۔ ۱۸۲۰ء میں انہوں نے حج کیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چند سال رہ کر دینی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ حجاز سے واپس آئے تو فرانسیسی سینے گال کے ساحلی علاقے پر قابض ہو چکے تھے اور اب ملک کے اندرونی حصوں میں بڑھنا چاہتے تھے۔ حاجی عمر تجانی نے فرانسیسیوں کے خلاف افریقی باشندوں کو منظم کیا۔ ہزاروں مظاہر پرست ان کی تبلیغی کوششوں سے اسلام لائے اور ۱۹۳۸ء میں انہوں نے بالائی نایجر کے علاقے میں ماڈنگ پر اور ۱۸۵۴ء میں کارتا پر قبضہ کرلیا۔ اس سال فرانس کا نیا گورنر جنرل فید ہربے (Faid Harbe) جو فرانسیسی نوآبادیوں کا نپولین کہلاتا ہے سینے گال آیا۔ اس نے حاجی عمر تجانی کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ[1] کے مقام پر ایک قلعہ بنوایا۔ حاجی عمر نے اس قلعہ کا ۱۸۵۷ء میں محاصرہ کرلیا جو ایک سو دن تک جاری رہا۔ اس دوران میں فید ہربے امدادی فوج لے کر پہنچ گیا۔ اور حاجی عمر تجانی کو پسپا ہونا پڑا۔ حاجی عمر تجانی فرانسیسیوں کے ساتھ کئی لڑائیوں کے بعد ۱۸۶۴ء میں جبکہ وہ فولانیوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے شہید ہو گئے۔ اس وقت تک فرانسیسی پورے سینے گال پر قابض ہو چکے تھے۔ آزادی سے قبل سینے گال، فرانسیسی مغربی افریقہ کے گورنر جنرل کی حکومت کا ایک علاقہ یا صوبہ تھا۔

آزادی

فرانسیسی دور میں مغربی افریقہ کے دوسرے علاقوں کی طرح سینے گال بھی آئینی اصلاحات کے مختلف دوروں سے گزرا۔ ۲۸۔ ستمبر ۱۹۵۸ء کے استصواب میں سینے گال نے نئے فرانسیسی آئین کے حق میں رائے دی اور اس طرح کامل آزادی کے مقابلے میں فرانسیسی اتحاد میں رہ کر اندرونی خودمختاری کو ترجیح دی۔ اسی سال ۲۵۔ نومبر کو سینے گال خودمختار جمہوریہ بن گیا۔ ۲۲۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو سینے گال اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں یونین پروگریسو سینے گالی (U.P.S) نے اسمبلی کی تمام نشستوں پر قبضہ کرلیا۔ محمد ضیاء نئی جمہوریہ کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ۴۔ اپریل

(۱) مغربی افریقہ میں شہر کا وہ حصہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی ہے عام طور پر مدینہ کہلاتا ہے لیکن اوپر جس شہر کا [illegible]

۱۹۵۹ء کو جمہوریہ سینے گال اور جمہوریہ مالی نے جو اس وقت جمہوریہ سوڈان کہلاتا تھا مل کر مالی فیڈریشن بنائی جو زیادہ دن نہ چل سکی۔ مغربی سوڈان کے رہنما اشتراکیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کے یہاں ایک سیاسی پارٹی سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ سوڈانی راہنما ایک مضبوط مرکزی حکومت کے حامی تھے، سینے گالی رہنماؤں کا موقف اس سے قطعی مختلف تھا۔ ان کو نہ تو ایک جماعتی نظام سے دلچسپی تھی اور نہ مضبوط مرکز سے۔ وہ ایک ایسا وفاقی نظام چاہتے تھے جس میں بعد میں مغربی افریقہ کے دوسرے ملک بھی شامل ہو سکیں۔

مذکورہ بالا اختلافات نہ صرف سینے گال اور سوڈان کے اتحاد میں حائل ہوئے بلکہ ان کی وجہ سے مغربی افریقہ کے دوسرے علاقوں میں بھی کوئی موثر اتحاد قائم نہ ہو سکا۔ حالانکہ مغربی افریقہ میں ایک وسیع تر ریاست ہائے متحدہ افریقہ کی تشکیل کا جذبہ عام ہے اور آزادی کے فوراً بعد سوڈان اور سینے گال کے علاوہ نائیجر، بالائی وولٹا اور دیہومے تک نے مالی فیڈریشن میں شامل ہونے کی خواہش کی تھی۔ سینے گال اور سوڈان کے رہنماؤں کے ان اختلافات نے جلد ہی نازک صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۔ اگست ۱۹۶۰ء کو سوڈان کے صدر مودیبوکیتا (Modibokeita) نے جو اب مالی فیڈریشن کے صدر ہو گئے تھے، پورے فیڈریشن میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا اور مالی کے نائب وزیر اعظم محمد ضیاء کو جو وزیر دفاع بھی تھے، دفاعی اختیارات سے محروم کر دیا۔ مالی کے اس آمرانہ طرز کے خلاف دوسرے ہی دن یعنی ۲۰۔ اگست کو سینے گال نے مالی فیڈریشن سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ سینے گال کے فوجی دستوں نے فیڈریشن کے دارالحکومت ڈاکر میں تمام سرکاری عمارتوں کو گھیرے میں لے لیا اور مودیبوکیتا اور دوسرے سوڈانی حکام کو ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا۔ دو دن بعد اگرچہ ان سب کو رہا کر دیا گیا لیکن ۲۶۔ اگست کو سینے گال اسمبلی نے اپنے لیے علیحدہ آئین منظور کر لیا۔ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۶۰ء کو فرانسیسی حکومت نے بھی سینے گال کو ایک جداگانہ مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور اس طرح فیڈریشن پانچ ماہ قائم رہ کر ختم ہو گئی۔

سیاسی رجحانات

سینے گال کے راہ نماؤں میں محمد ضیا اور لیوپولڈ سدار سینگھر سب سے نمایاں ہیں۔ محمد ضیا کا [illegible]

میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد معلم اور صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ آزادی سے قبل سینے گال کی علاقائی اسمبلی کے رکن تھے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ فرانس کی قومی اسمبلی میں سینے گال کی طرف سے رکن منتخب ہوئے۔ آزادی کے بعد وہ پہلے سینے گال کے وزیر اعظم ہوئے۔ پھر مالی فیڈریشن میں نائب صدر اور وزیر دفاع بنے۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں جب سینے گال کی نئی حکومت بنی تو وہ وزیر اعظم ہو گئے۔ محمد ضیاء مغربی افریقہ کے وفاق کی تہذیب کے زبردست حامی ہیں۔ وہ بہت اچھے مقرر اور ماہر معاشیات ہیں اور معاشیات پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

لیوپورڈ سدار سینگھر (Leopold Sedar Senghar) جو ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے جمہوریہ سینے گال کے صدر ہیں۔ وہ عیسائی ہیں اور کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شمار افریقہ کے اعتدال پسند سوشلسٹ رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ فرانسیسی کلچر کے مداح ہیں اور فرانسیسی زبان کے اچھے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جس کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی مسلمان ہو، ایک عیسائی کا صدر ہونا بڑے تعجب کی بات ہے لیکن افریقہ کے نو آزاد ملکوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک سکولر طرز حکومت کے حامی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمان عام طور پر تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں جس کی وجہ سے قیادت عیسائیوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔

مالی فیڈریشن کے خاتمہ کے بعد صدر سینگھر کو صدارت کے عہدے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کی مسلم نواز پالیسی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فرانسیسی دور میں بھی مغربی افریقہ کے مدارس میں عربی زبان اور دینی تعلیم کو داخل نصاب کرنے کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ ان کو ہم سینے گال کے جسٹس کارنیلس کہہ سکتے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا ثبوت ان کی وہ کامیابی ہے جو ان کو وزیر اعظم محمد ضیاء کے مقابلے میں ہوئی۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں انہوں نے نہ صرف محمد ضیاء کو وزارت کے عہدے سے ہٹا دیا۔ ۱۹۶۳ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کو توڑ کر سینے گال میں صدارتی طرزِ حکومت نافذ کر دیا۔

مارچ ۱۹۶۶ء میں صدر سینگھر پر قاتلانہ حملہ ہوا جس کے بعد انہوں نے ۱۹۶۶ء میں تمام مخالف سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ صرف سرکاری جماعت پروگریسو یونین قائم رہی۔ اس

لیے ۱۹۶۸ء کے انتخابات اس نے بغیر کسی مقابلے کے جیت لیے۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں طلبہ اور مزدوروں نے ہڑتالیں کیں جن کو سختی سے دبا دیا گیا، لیکن اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں آئین میں تبدیلی کر کے وزیر اعظم کا عہدہ پھر قائم کیا گیا اور ایک محنی نوجوان مسلمان عبدو ضیوف (Abdou Diouf) کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا اور وہ ابھی تک سینے گال کے وزیر اعظم ہیں۔ جنوری ۱۹۷۳ء میں صدر سینگھر پھر بلا مقابلہ منتخب ہو گئے اور ان کی پارٹی نے قومی اسمبلی کی تمام نشستیں جیت لیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ محمد ضیا بھی رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد محمد ضیاء نے "ڈیموکریٹ" پارٹی بنائی جو حزب اختلاف کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ ۲۶۔ فروری ۱۹۷۸ء کے انتخابات میں پہلی مرتبہ ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنما عبداللہ وعدہ (Abdou Laye wade) نے صدر سینگھر کا مقابلہ کیا لیکن صدر سینگھر اسی فیصدی ووٹ حاصل کر کے پھر صدر منتخب ہو گئے۔ اس مرتبہ ان کی پارٹی کے ۸۳ نمائندے کامیاب ہوئے اور سترہ نمائندے ڈیموکریٹک پارٹی کے کامیاب ہوئے۔ سینے گال میں صدر کا انتخاب براہ راست پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔

سینے گالی رہنما بھی مغربی افریقہ کے بیشتر رہنماؤں کی طرح سوشلزم کے حامی ہیں۔ لیکن ان کا سوشلزم اعتدال اور جمہوریت کی حدود میں ہے اور سینے گال سابق فرانسیسی افریقہ کے ان ملکوں میں سے ہے جہاں جمہوری عمل قائم ہے اور ملک میں مسلسل استحکام پایا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد کئی سال تک فرانس اور سینے گال کے درمیان بہت قریبی سیاسی اور معاشی تعلقات قائم رہے اور مسلم اکثریت کے باوجود سینے گال نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۷۳ء میں فرانس سے بھی ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت فرانس نے اپنے فوجی اڈے خالی کر دیے۔

تعمیر و ترقی

سینے گال کی معیشت کی بنیاد زراعت اور مویشی بانی پر ہے۔ مونگ پھلی سب سے بڑی زرعی پیداوار ہے اور بڑی تعداد میں برآمد کی جاتی ہے۔ ماہی گیری بھی معیشت میں اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں سینے گال، مالی اور موریتانیا نے دریائے سینے گال کے آبی وسائل کو ترقی دینے کے

لیے او۔ایم۔وی۔ایس (O.M.V.S) کے نام سے ایک مشترکہ ادارہ قائم کیا ہے۔

معدنی پیداوار میں فاسفیٹ اہم ہے۔لوہے، تانبے اور سونے کی کانوں کا بھی پتہ چلا ہے۔لیکن ابھی تک ان کو نکالا نہیں گیا۔ ۱۹۷۴ء میں اٹھارہ لاکھ ٹن فاسفیٹ نکالا گیا۔

صنعت پڑوسی ملکوں کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔ پارچہ بافی، شکر سازی، سیمنٹ اور کیمیاوی صنعت اہم صنعتیں ہیں۔ سینے گال کے ساحلوں کا گرم پانی موسم سرما میں یوروپی باشندوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے، اس لیے چند سال سے سیاحت پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ایک لاکھ ۳۲ ہزار سیاح سینے گال آئے تھے اور ۱۹۷۷ء میں یہ تعداد ایک لاکھ نوے ہزار تک ہونے کی توقع تھی۔ یہاں کا نیشنل پارک بھی جہاں جنگلی جانوروں کا تحفظ کیا گیا ہے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔

سینے گال میں چودہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں خواندگی کا تناسب دس فیصد تھا۔ڈاکر میں یونیورسٹی قائم ہے جہاں ۱۹۷۲ء میں طلبہ کی تعداد تین ہزار آٹھ سو تھی۔

سینے گال کی نوے فیصد آبادی مسلمان ہے اور سب سیاہ فام نسل کے مختلف قبیلوں پر مشتمل ہے۔دارالحکومت ڈاکر کی آبادی آٹھ لاکھ ہے۔یہ جدید طرز کا شہر ہے جسے فرانسیسیوں نے آباد کیا تھا اور افریقہ کے بڑے اور خوبصورت شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

باب ۱۴

جمہوریہ مالی

مالی کا علاقہ دریائے نائیجر کی وسطی وادی اور اس کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ مغرب، شمال مشرق میں اس کی حدود سینے گال، موریتانیا، الجزائر اور نائیجر کے مسلم ممالک سے ملی ہوئی ہیں۔ اور اس کے جنوب میں گنی، آئیوری کوسٹ اور بالائی وولٹا واقع ہیں۔ مالی کی قدیم تاریخ صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع تمام ملکوں کی تاریخ سے زیادہ شاندار ہے۔ قدیم زمانے میں سونا پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے مالی کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور عہد قدیم میں یہاں سونا اس کثرت سے پایا جاتا تھا کہ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ مالی میں سونا پیدا نہیں ہوتا بلکہ درختوں پر اُگتا ہے۔ مالی کی سلطنت مغربی افریقہ کے بہت بڑے حصے میں پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کا قلب وہی علاقہ تھا، جو اب جمہوریہ مالی کہلاتا ہے۔

مالی میں سینے گال کے فوراً بعد ہی اسلام پھیلنا شروع ہوگیا تھا اور یہاں کے کئی مقامی حکمرانوں نے ۱۱۰۰ء کے قریب اسلام قبول کرلیا تھا۔ چودھویں صدی میں منسیٰ موسیٰ کے ۱۳۰۷ء تا ۱۳۳۲ء) کے دَور میں مالی کی سلطنت اپنے عروج پر تھی اور موجودہ جمہوریہ مالی کے علاقے کے علاوہ سینے گال بھی مالی کی حدود وسلطنت میں تھا۔ منسیٰ موسیٰ نے مصر اور مراکش سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے اور سونا پیدا کرنے والے ملک کے بادشاہ کی حیثیت سے اس کی شہرت یورپ تک پہنچ گئی تھی۔ پندرھویں صدی میں مالی سلطنت کے زوال اور خاتمہ کے بعد شہرگاہ کے اسکیا خاندان کو عروج حاصل ہوا، جس کا تعلق سونگھائی قبیلے سے تھا۔[1] ۱۵۹۱ء میں مالی پر مراکش کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن مراکش کا یہ اقتدار زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہا۔ صحرائے اعظم کے درمیان میں حائل ہونے کی وجہ سے مالی میں مراکش کے فوجی اپنے وطن سے کٹ گئے اور جب ان کو مراکش سے امداد نہیں ملی تو انہوں نے ٹمبکٹو اور نواحی علاقوں میں اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی جو

---

(۱) مالی کی سلطنت اور اسکیا خاندان کے حالات کے لیے دیکھئے "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" حصہ دوم باب ہشتم۔

کسی نہ کسی شکل میں ۱۸۲۰ء تک قائم رہی۔ اس دوران مالی کے دوسرے حصوں میں مقامی قبائل نے اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔

انیسویں صدی کے آغاز میں صوفیوں کے مختلف سلسلوں اور طریقوں سے زیر اثر مالی اور اس کے گردونواح میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ مالی میں فولانی رہنما احمد ولو بو متوفی ۱۸۴۴ء نے، سینے گال میں حاجی عمر تجانی متوفی ۱۸۶۵ء نے اور گنی اور مالی میں امام صمد متوفی ۱۹۰۰ء نے جو سموری کے نام سے معروف ہیں۔ ہزاروں مظاہر پرستوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا اور اس طرح مہذب دنیا کی حدود جنوب کی سمت دُور تک بڑھا دیں۔ ان مصلحین میں احمد ولو بو کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نائیجریا کے عظیم مصلح اور مجدد وقت عثمان دان فودیو کے ساتھیوں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح فولانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے دریائے نائیجر کی وسطی وادی میں ۱۸۱۰ء میں ایک ایسی حکومت قائم کی جس نے مسلمانوں کے معاشرے سے جماعتوں کا خاتمہ کیا اور جس کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک نیا دارالحکومت بھی تعمیر کیا جس کا نام حمد اللہ تھا۔ مالی کے تمام فولا قبائل احمد ولو بو ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کا بیٹا ان کا جانشین ہوا، لیکن وہ باپ کی مملکت کو قائم نہیں رکھ سکا اور اس کی مملکت کے ایک حصہ پر حاجی عمر تجانی کا قبضہ ہو گیا۔ اسی زمانے میں فرانسیسی فوجوں نے جو سینے گال کے ساحل پر پہلے ہی قابض ہو چکی تھیں، افریقہ کے اندرونی حصوں میں پیش قدمی شروع کر دی۔ حاجی عمر تجانی اور امام محمد نے جو سمدری توری کے نام سے مشہور ہیں اپنے وطن کو دوسروں کی غلامی میں جانے سے روکنے کے لیے جان توڑ کوششیں کیں لیکن جدید اسلحہ اور جدید فوجی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو روکنے میں ناکامی ہوئی۔ شہر سیگو پر فرانسیسی فوج نے ۱۸۹۰ء میں جینی اور ٹمبکٹو پر ۱۸۹۳ء میں قبضہ کر لیا اور اس طرح نہ صرف مالی بلکہ تمام مغربی افریقہ فرانس کے تسلط میں آ گیا۔ فرانس نے اپنے مقبوضات کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں ایک مالی تھا جسے مغربی سوڈان اور فرانسیسی سوڈان کا نام دیا گیا۔

نو آبادیاتی دور

فرانس نے اپنے ۶۵ سالہ دورِ حکومت میں کہنے کو تو مغربی افریقہ میں ترقی کے بہت سے کام

انجام دیے۔ سڑکیں اور ریلیں بچھائیں، تار اور ٹیلیفون کے سلسلے قائم کیے اور مالی میں آبپاشی کے نظام کو بھی ترقی دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب مالی اور افریقہ کی دوسری فرانسیسی نوآبادیاں آزاد ہوئیں تو یہ علاقے معاشی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے دُنیا کے پست ترین علاقوں میں سے تھے۔ فرانسیسی دورِ حکومت کا سب سے تباہ کن پہلو یہ تھا کہ اس نے مقامی روایات کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی اور شہری حقوق صرف ان لوگوں کو دیے جو فرانسیسی زبان بولتے تھے اور جنہوں نے فرانسیسی کلچر اختیار کرلیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے انگریزی دان لوگ ان دیسی فرانسیسیوں سے کہیں بہتر تھے اس لیے کہ انگریزوں نے نہ تو مقامی روایات کو فرانسیسیوں کی طرح کچلا تھا اور نہ انگریزی دان افراد کو مغربی تہذیب اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے برخلاف فرانس نے منتخب شہریوں کا ایک طبقہ پیدا کیا جو (elite) کہلاتا تھا۔ افراد اس طبقے میں داخل ہونے کے لیے مقامی کلچر کو ترک کر کے فرانسیسی کلچر اختیار کرنا لازمی تھا۔ اس طرح ان دیسی لوگوں کو فرانسیسی باشندوں کے برابر حقوق مل جاتے تھے اور بقول ایک مغربی مصنف کے یہ وہ طبقہ تھا جس نے خود کو قدیم روایات سے بالکل آزاد کرلیا تھا اور جو مشرق وسطیٰ کے بجائے فرانس اور مغربی ملکوں کی طرف دیکھتا تھا۔[1] یہی وجہ ہے کہ اس (elite) یا منتخب طبقے کے لوگ فرانسیسیوں سے زیادہ فرانسیسی کلچر کے مداح تھے اور ہیں۔ گنی کے شیخ توری، سینیگال کے سینگھر اور مالی کے موویبو کیتا، سب اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹۴۶ء میں نئے فرانسیسی آئین کے تحت مغربی افریقہ کی آٹھ نوآبادیوں میں علاقائی اسمبلیاں قائم کی گئیں اور ان کو محدود اختیارات دیے گئے۔ لیکن حقیقی تبدیلی ۱۹۵۸ء میں آئی۔ اس سال نئے فرانسیسی آئین کے تحت دوسری نوآبادیوں کی طرح فرانسیسی سوڈان میں ایک خود مختار حکومت قائم کی گئی۔ لیکن مالی نے فرانس سے تعلق ختم نہیں کیا بلکہ فرانسیسی اتحاد (french community) میں رہ کر خود مختاری حاصل کرنا پسند کیا، ۲۸۔ نومبر ۱۹۵۸ء کو شہر باماکو میں جمہوریہ سوڈان کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو پہلی قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور سوڈانی یونین نامی جماعت نے جس کے راہ نما موویبو کیتا تھے، تمام نشستوں پر قبضہ

---

(1) Fitzgerald, walter: Africa.

کرلیا۔ مودیبو کیتا پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ڈیڑھ سال بعد فرانسیسی سوڈان نے جس کا نام اب مغربی سوڈان ہو گیا تھا سینیگال سے مل کر ایک وفاق بنانے اور فرانس سے قطعی آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ نئے وفاق کا نام مالی رکھا گیا۔ ۲۱۔ جون ۱۹۶۰ء مالی نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ مودیبو کیتا مالی کے وزیر اعظم، اور سینیگال کے وزیر اعظم محمد ضیاء نائب وزیر اعظم منتخب ہوئے لیکن بدقسمتی سے یہ وفاق آزادی کے بعد صرف دو ماہ قائم رہ سکا، اور ۲۰۔ اگست ۱۹۶۰ء کو سینیگال فیڈریشن سے علیحدگی اختیار کرلی جس کی تفصیل سینیگال کے حالات میں بتائی جا چکی ہے۔ فیڈریشن ٹوٹنے کے بعد جمہوریہ سوڈان نے جمہوریہ مالی کا نام اختیار کرلیا، کیونکہ مالی کی قدیم سلطنت کا قلب یہی علاقہ تھا اور مالی کے دارالسلطنت ٹمبکٹو اور گاؤ (قدیم کوکو) موجودہ جمہوریہ مالی کی حدود میں واقع ہیں۔

صدر مودیبو کیتا

جمہوریہ مالی کے پہلے وزیر اعظم اور صدر مودیبو کیتا (Keita) ۴۔ جون ۱۹۱۵ء کو باماکو میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب مالی کے شاہی خاندان سے جس کا حکمران منسیٰ موسیٰ تھا، ملتا ہے۔ وہ مغربی افریقہ کے مشہور قبیلے مندنگو کی ایک شاخ بمبارا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ فرانسیسی مغربی افریقہ کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آر۔ ڈی۔ اے (R.D.A) کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ جماعت چونکہ کمیونسٹوں کی ہمنوا تھی، اس لیے فرانسیسی حکومت نے مودیبو[1] کیتا پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا کر ان کو ۱۹۴۶ء میں جیل بھیج دیا۔ لیکن اگلے سال وہ رہا کر دیے گئے۔ اب وہ سوڈانی یونین کے جو مغربی سوڈان میں آر۔ ڈی۔ اے کی شاخ تھی، جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ بعد میں کمیونسٹوں اور آر۔ ڈی۔ اے کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے، اور ۱۹۵۹ء میں مودیبو کیتا میں سوڈانی یونین کو آر۔ ڈی۔ اے سے الگ کر دیا اور سینیگال کی سیاسی جماعت سینیگالی پروگریسو یونین کے ساتھ مل کر فیڈرل افریقن پارٹی کی بنیاد ڈالی۔

---

(۱) مودیبو کیتا ۱۹۴۸ء میں فرانسیسی سوڈان کی پہلی علاقائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس کے بعد وہ ۱۹۵۳ء میں فرانسیسی یونین کی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۷ء وہ فرانسیسی قومی اسمبلی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ وہ پہلے افریقی تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔

مودیبوکیتا مغربی افریقہ کے بیشتر ملکوں کے سربراہ کی طرح سوشلزم کے علمبردار تھے۔ اگرچہ وہ ذاتی طور پر مذہبی آدمی ہیں۔ ۱۹۵۹ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سابق مغربی سوڈان میں سوڈانی یونین کے علاوہ باقی تمام پارٹیوں کو ختم کر دیا۔ آزادی کے بعد مالی کو ایک جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریہ قرار دیا۔

مودیبوکیتا نے چینی طرز کا سوشلزم اختیار کیا اور کثیر تعداد میں چینی کمیونسٹوں کو بلایا تاکہ وہ سرکاری اداروں کو چلائیں۔ ملک میں اجتماعی کاشت کا پروگرام وسیع پیمانے پر شروع کیا گیا۔ مودیبوکیتا نے رواجی لباس بھی ترک کر دیا اور چینی طرز کا کوٹ پہننے لگے۔ انہوں نے ایک نجی رضا کار فوج بھی تیار کی جو باضابطہ فوج کے لیے خطرہ بن گئی۔ ان کو کمیونسٹ نواز پالیسی کی وجہ سے ۱۹۶۳ء میں روس نے لینن کا امن انعام بھی دیا۔[1] مودیبوکیتا نے فرانسیسی اقتصادی بلاک سے مالی کو الگ کر دیا۔ اور کمیونسٹ ملکوں سے خصوصی چین اور روس سے وسیع پیمانے پر اقتصادی امداد حاصل کی۔ لیکن اس کے باوجود افراطِ زر میں اس تیزی سے اضافہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء میں مالی کو پھر فرانسیسی فرانک کے حلقہ میں آنا پڑا۔

مودیبوکیتا کی آمرانہ طرزِ حکومت نے ملک میں بے چینی پیدا کر دی اور خفیہ سازشوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ چنانچہ ۱۹۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں فوجیوں کی ایک جماعت نے لیفٹیننٹ موسیٰ ترادورے (Traore) کی قیادت میں ان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ صدر مودیبوکیتا نظر بند کر دیے گئے اور اسی حالت میں ان کا نو سال بعد ۱۶۔ مئی ۱۹۷۷ء کو بماکو میں انتقال ہو گیا۔ موسیٰ ترادورے اس وقت سے صدر اور وزیراعظم کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور اب کرنل ہیں۔ ان کا گروپ ملٹری کمیٹی آف نیشنل لبریشن (قومی آزادی کی فوجی کمیٹی) کہلاتا ہے۔

نئی حکومت نے اجتماعی کاشت کا نظام ختم کر دیا ہے اور فرانس کی مدد سے ملک میں مخلوط معیشت کو رواج دے رہی ہے۔ روس اور چین سے اب بھی تعلقات برقرار ہیں، لیکن نجی کاروبار اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اجتماعی کاشت کے خاتمہ کے بعد مالی کی زرعی

(۱) کرنٹ بایوگرافی (انگریزی) اپریل ۱۹۶۶ء

پیداوار میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جون ۱۹۷۴ء سے نیا آئین نافذ ہے جس کے تحت شہری حکومت کو اقتدار منتقل کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن ابھی تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ اس وقت ملک میں کوئی سیاسی پارٹی نہیں۔ آئین میں پانچ سال کے اندر ایک سیاسی پارٹی قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وقت کرنل موسیٰ صدر اور وزیراعظم دونوں کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے دوسرے سیاہ فام افریقی ملکوں کی طرح مالی کے بھی اسرائیل سے سفارتی تعلقات تھے اور اسرائیل وہاں شمسی توانائی کو ترقی دینے میں مدد دے رہا تھا۔ لیکن ۱۹۷۳ء کی مصر اسرائیل جنگ کے بعد یہ تعلقات ختم ہو گئے۔

تعمیر و ترقی

مغربی افریقہ کے کئی دوسرے ملکوں یعنی موریتانیا، نائیجر اور سینیگال کے مقابلہ میں مالی کے اقتصادی وسائل زیادہ ہیں۔ اگرچہ مالی کا نصف شمالی حصہ صحرائے اعظم کا حصہ ہے، لیکن باقی نصف حصہ کی زمین زرخیز ہے اور پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔ گنی اور آئیوری کوسٹ سے ملحق حصوں میں پچاس سے آٹھ انچ تک سالانہ بارش ہوتی ہے اور جنگل بھی پائے جاتے ہیں۔ وسطی حصہ میں دریائے نائیجر اس کے معاونوں اور شاخوں کا جال بچھا ہوا ہے اور نہری آبپاشی کے امکانات وسیع ہیں۔ دریائے نائیجر میں سیلاب کے زمانہ میں یہاں تیس ہزار سے چالیس ہزار مربع میل کا علاقہ زیر آب آ جاتا ہے۔ اگر سیلاب کے اس پانی سے کام لیا جائے تو ماہرین کا خیال ہے کہ یہ خطہ زرخیزی میں دوسرا مصر بن سکتا ہے۔ اس علاقے میں بند باندھ کر نئی زمین زیر کاشت لائی جا رہی ہے۔ مالی میں مویشی پالنے کے امکانات بھی وسیع ہیں اور ماہرین کا کہنا ہے کہ ارجنٹائنا اور آسٹریلیا کی طرح مالی میں بھی مویشی بانی کے لامحدود امکانات ہیں اور اگر اس کاروبار کو ترقی دی جائے تو مالی ساری دنیا کو مویشی اور اون فراہم کر سکتا ہے۔ وادی نائیجر کی آب و ہوا روئی کی کاشت کے لیے بھی بہت موزوں ہے۔ پن بجلی کو بھی ترقی دینے کے وسیع امکانات ہیں اور دریائے سینیگال کے پانی سے فائدہ اٹھانے کے لیے حال ہی میں سینیگال کے اشتراک سے ایک کثیر المقاصد منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ معدنیات میں اب تک صرف مینگنیز کے ذخائر کا پتہ چلا ہے جس کی

مقدار ایک کروڑ ٹن ہے۔ ایک امریکی کمپنی تیل تلاش کر رہی ہے اور مغربی جرمنی کی ایک کمپنی یورے نیم کی تلاش کر رہی ہے۔

۱۹۷۶ء میں ملک میں پہلی مرتبہ مردم شماری ہوئی۔ یہاں کے قبائل میں مندنگو، تکرور اور مالنگی سب سے بڑے قبیلے ہیں اور یہ تقریباً پورے کے پورے مسلمان ہیں۔ مالی اور سونگھائی کی قدیم حکومتیں دراصل مندنگو قبیلے کی حکومتیں تھیں۔ بمبارا بھی مالی کا بہت بڑا قبیلہ ہے اور جنوبی حصے میں آباد ہیں۔ اس کی اکثریت ابھی تک غیر مسلم ہے، لیکن اس میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مغربی ذرائع پہلے مالی میں مسلمانوں کا تناسب ۶۵ فیصد بتاتے تھے لیکن اب یہ تناسب عام طور پر نوے فیصد بتایا جاتا ہے۔ دارالحکومت بماکو جس کی آبادی ۱۹۷۶ء میں چار لاکھ تھی جدید طرز کا شہر ہے اور فرانسیسی دَور میں آباد کیا گیا تھا۔ ٹمبکٹو میں اسلامی دَور کی تاریخی یادگاریں ہیں، لیکن بماکو جدید اسلامی تحریک اصلاح کا مرکز ہے۔ بماکو ریل کے ذریعہ بندرگاہ ڈاکر سے ملا ہوا ہے۔

مالی میں تعلیم مفت ہے لیکن صرف بیس فیصد بچے زیر تعلیم ہیں۔ خواندگی کا تناسب دس فیصد ہے۔
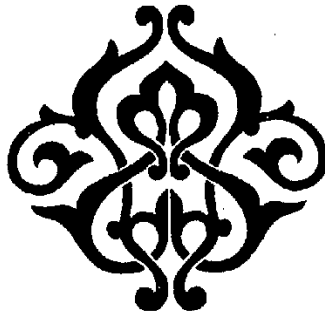
باب ۴۲

جمہوریہ گنی

گنی کی مملکت کی شمالی حدود مالی اور سینی گال سے ملتی ہیں اور جنوب میں لائبیریا سیرالیون اور بحر اوقیانوس واقع ہے۔ مغربی افریقہ کی فرانسیسی نو آبادیوں میں گنی پہلا علاقہ ہے جس نے سب سے پہلے مکمل خود مختاری حاصل کی۔ گنی کے شمالی حصوں میں بارہویں صدی سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ۱۷۲۰ء میں فوتا جلوں میں جو گنی کا ایک خوبصورت پہاڑی علاقہ ہے۔ شرعی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس حکومت کے قیام سے گنی کے علاقے میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں بڑی مدد ملی اس کے بعد جنوبی علاقوں میں بتدریج اسلام پھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی میں سوسو قبیلے کے مبلغوں نے ساحل بحر اوقیانوس تک اسلام پھیلا دیا۔ انیسویں صدی میں سینے گال کے حاجی عمر تجانی اور گنی کے امام صمد (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۰ء) کی کوششوں سے گنی کے مظاہر پرست باشندے ہزاروں کی تعداد میں اسلام لے آئے۔ اسلام کی توسیع و اشاعت کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ فرانسیسی فوجیں گنی میں داخل ہو گئیں اور مسلمانوں کو تبلیغ و اشاعت کے میدان سے ہٹ کر اپنی آزادی کے دفاع کے لیے میدان جنگ میں آنا پڑا۔

فرانسیسی دور

فرانسیسی حملہ آوروں کا جن لوگوں نے گنی میں مقابلہ کیا ان میں امام صمد سموری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ امام صمد جو سموری کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ مغربی افریقہ کے سب سے بڑے قبیلے مندنگو سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے فرانسیسی استعمال کا جیسا سخت مقابلہ کیا ویسا مغربی افریقہ میں کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ امام صمد نے گنی کے غیر مسلم قبائل میں اشاعت اسلام کی بھی بڑی کوششیں کیں اور انہوں نے بالائی نائیجر اور سمندر کے درمیانی علاقے میں ہزاروں مظاہر پرستوں کو مسلمان کیا۔ فرانسیسی جب ۱۸۸۱ء میں فوتا جلون کے پہاڑی علاقے پر قابض ہو گئے تو امام صمد نے گنی اور اس کے نواحی علاقوں میں فرانسیسیوں کی پیش قدمی روکنے کی بڑی

کوشش کی، لیکن اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور فرانسیسیوں نے ۱۸۹۳ء میں ان کے دارالحکومت بساندوگو (besandugu) پر جو لائبیریا کی سرحد پر واقع تھا، قبضہ کرلیا۔ لیکن اس حوصلہ مند انسان نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور انہوں نے بالائی نائیجر اور سیاہ وولٹا کے درمیان مظاہر پرست قبیلوں کو مفتوح کر کے ایک نئی مملکت قائم کرلی۔ اب سموری نے چھاپہ مار جنگ اختیار کی اور لائبیریا کی سرحد سے اشانتی (غانا) اور دیہومے کی سرحد تک فرانسیسیوں پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ آخرکار ۱۸۹۸ء میں لائبیریا کے شمال میں کوالا (cavalla) کے مقام پر ان کو آخری شکست ہوئی اور وہ گرفتار کرلیے گئے۔ فرانسیسیوں نے ان کو وسطی افریقہ کے علاقے گابون میں جلاوطن کر دیا جہاں ۱۹۰۰ء میں اس عظیم مجاہد کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ۱۸۹۸ء میں فرانسیسی استعمار کے خلاف آخری مسلح مزاحمت کا نہ صرف گنی بلکہ پورے مغربی افریقہ میں خاتمہ ہوگیا۔

گنی کے لوگ پورے ساٹھ سال فرانس کی غلامی میں رہے۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۸ء میں جب جنرل ڈیگال نے اعلان کیا کہ افریقہ کا جو علاقہ ۲۸۔ ستمبر ۱۹۵۸ء کے استصواب میں مجوزہ فرانسیسی آئین کو رد کر دے گا تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ تو گنی وہ واحد علاقہ تھا۔ جس نے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا اور فرانس سے آزادی حاصل کرلی۔

احمد سیکوتوری

گنی کی آزادی کے معمار احمد سیکوتوری ہیں جو امام سموری کی اولاد سے ہیں۔ وہ ۱۹۔ جنوری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ڈاک خانہ میں ملازم ہوگئے۔ انہوں نے بائیس سال کی عمر ہی سے مزدور تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ فرانسیسی دور میں مغربی افریقہ کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آر۔ ڈی۔ اے کے نائب صدر تھے۔ سیکوتوری انتھک کام کرنے والے انسان ہیں اور ان میں زبردست تعلیمی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے یو۔ جی۔ ٹی۔ اے۔ این (U.G.T.A.N) نامی مزدور تحریک کی تنظیم کی جس کے ارکان کی تعداد سات لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے کئی مرتبہ کامیاب ہڑتالیں کرائیں جس کی وجہ سے قید و بند کے مصائب بھی اٹھانے پڑے۔ سیکوتوری فرانسیسی اور مادری زبانوں کے اعلیٰ درجے کے مقرر ہیں۔ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور فرانسیسی سامراج کے مقابلے میں ان کے دلیرانہ اقدامات

نے ان کو گنی میں بہت مقبول بنا دیا۔ چنانچہ جب نئے فرانسیسی آئین پر استصواب ہوا تو آئین کے حق میں صرف پندرہ ہزار ووٹ آئے جب کہ مخالفت میں تقریباً پونے چھ لاکھ ووٹ آئے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سیکوتوری نے گنی کو فرانسیسی اتحاد سے بھی علیحدہ کر لیا اور ۲/ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو گنی کو ایک آزاد جمہوریہ قرار دے دیا۔

گنی کی آزادی کے سلسلے میں سیکوتوری کی خدمات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اپنے جد اعلیٰ سموری کے خلف الرشید نہیں کہے جا سکتے۔ وہ اپنے ابتدائی دور میں کمیونسٹوں کے زیر اثر تھے، اور پریگ (چیکوسلوواکیہ) جا کر انہوں نے اشتراکی نظریات کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ سیکوتوری اگرچہ کمیونسٹ ہونے سے انکاری ہیں لیکن وہ گنی کو ایک مکمل سوشلسٹ مملکت بنانے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گنی کا جو آئین تیار کیا، اس کے تحت گنی کو ایک غیر مذہبی سیکولر سوشلسٹ جمہوریہ قرار دیا، حالانکہ گنی کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی مسلمان ہے۔ ایک اشتراکی اور سوشلسٹ ریاست ہونے کی وجہ سے گنی میں آزادی اور جمہوریت کا فقدان ہے۔ آزادی سے پہلے گنی میں بارہ سیاسی جماعتیں موجود تھیں لیکن اب ایک ہی سیاسی جماعت ہے اور وہ ہے سیکوتوری کی گنی ڈیموکریٹک پارٹی۔ سیاسی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے مخالف عناصر درپردہ انقلاب لانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ مئی ۱۹۶۰ء میں کئی سو باشندوں کو حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان میں سیکوتوری کے سابق رفیق ابراہیم دیالو بھی تھے۔

ابراہیم دیالو کو اتنا مارا گیا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں دارالحکومت کوناکری کی مسجد کے ایک امام نے توری کی حکومت کو لامذہب حکومت کہا تو ان کو اور سترہ دوسرے لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ فروری ۱۹۶۸ء میں بھی بغاوت کے ایک منصوبے کا انکشاف ہوا جس میں وزیر اور فوجی افسر ملوث تھے جس میں سے بارہ افراد کو پھانسی دے دی گئی۔

گنی کو ایک اشتراکی مملکت بنانے کے سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ مختلف صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ اس کا آغاز ۳۱ جنوری ۱۹۶۱ء میں بجلی گھروں کو قومی ملکیت میں لے کر کیا گیا۔ اسی سال مارچ میں ہیرے اور سونے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور اگست میں ٹرانسپورٹ سروس کو قومیا لیا گیا۔ بینک اور بیمہ کمپنیاں بھی نجی ملکیت سے نکال لی گئیں اور

۲۴۔فروری ۱۹۶۲ء کو ملک کا سب سے بڑا صنعتی ادارہ المونیم لمیٹڈ جس میں کنا ڈا کا سرمایہ لگا ہوا تھا قومی ملکیت قرار دے دیا گیا۔

سیکوتوری کے دور میں قبائلی سرداروں کا زور بھی توڑ دیا گیا ہے، اور اب غالباً یہ طبقہ ملک کی سیاست میں بے اثر ہو گیا ہے۔

سیکوتوری کے گنی کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اپنے اشتراکی رجحان کے باوجود انہوں نے روس اور چین کے علاوہ مغربی ملکوں سے بھی برابر کے تعلقات قائم رکھے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں صدر آئزن ہاور کی درخواست پر جب سیکوتوری نے امریکہ کا دورہ کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ گنی اپنا دامن کسی کے ساتھ نہیں باندھے گا خواہ وہ سوویٹ روس ہی کیوں نہ ہو۔ دو سال بعد انہوں نے اس کا عملی ثبوت بھی دے دیا۔ روس سے گنی کے بہت قریبی تعلقات تھے اور وہ روس سے کثیر مقدار میں اسلحہ خرید رہا تھا، لیکن جب دسمبر ۱۹۶۱ء میں اس سازش کا پتہ چلا کہ کمیونسٹ عناصر روس کی مدد سے حکومت کا تختہ پلٹنا چاہتے ہیں تو انہوں نے روسی سفیر کو ملک سے نکال دیا اور دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات ختم ہو گئے جو اگلے سال بحال ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں فرانس سے تعلقات منقطع ہو گئے۔ سیکوتوری نے فرانس پر الزام لگایا کہ اس نے گنی کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش کی تھی۔ یہ تعلقات ۱۹۷۵ء میں بحال ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں سیکوتوری کو قتل کرنے کی سازش ہوئی۔ سیکوتوری ان تمام سازشوں کے باوجود اپنی حکومت بچانے میں کامیاب رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ افریقہ میں تونس کے حبیب بورقیبہ کے علاوہ کوئی مسلمان سربراہ سیکوتوری کے برابر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ گنی کا آئین ۱۲۔نومبر ۱۹۵۸ء کو منظور ہوا تھا جس کے تحت گنی میں صدارتی نظام قائم کیا گیا۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں آئین میں تبدیلی کی گئی اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ قائم کیا گیا۔ ملک میں صرف ایک سیاسی جماعت یعنی گنی ڈیموکریٹک پارٹی قائم ہے۔

مالی اور غانا میں جب تک مودیبو کیتا اور صدر نکرومہ کی حکومت قائم رہی گنی کے ان دونوں ملکوں سے قریبی تعلقات قائم رہے۔ غانا سے خاص طور پر بہت گہرے تعلقات تھے۔ گنی کے آزادی حاصل کرنے کے بعد جب گنی کو مغربی ملکوں سے امداد نہیں مل رہی تھی تو غانا نے گنی سے تعاون کیا اور گنی کو ایک کروڑ پونڈ کا قرض دیا۔ اس کے بعد ۲۳۔نومبر ۱۹۵۸ء کو غانا اور گنی ایک

قسم کی یونین میں منسلک بھی ہو گئے تھے جس میں یکم جولائی ۶۱ کو مالی بھی شامل ہو گیا۔ لیکن یہ یونین معاہدہ کی حد تک رہی اور عملی شکل اختیار نہ کر سکی۔ ۲۴ فروری ۱۹۶۶ء کو جب غانا میں صدر نکرومہ کا تختہ پلٹ گیا تو صدر توری نے نکرومہ کو گنی میں پناہ دے کر اس احسان کا حق ادا کر دیا جو نکرومہ نے گنی کو قرض دے کر کیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں نکرومہ کا گنی کے دارالحکومت کوناکری میں انتقال ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں سیکوتوری پھر سات سال کے لیے گنی کے صدر منتخب ہو گئے۔

تعمیر و ترقی

ان تمام روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ گنی کی سیاست کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ وہاں جبر و استبداد کی حکمرانی ہے اور ایک زمانہ میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے الزام لگایا تھا کہ ملک میں دو ہزار سے چار ہزار تک سیاسی قیدی ہیں اور جگہ جگہ ایذا خانے بنے ہوئے ہیں اور کئی لاکھ باشندے پڑوسی ملکوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔

قدرتی وسائل کے لحاظ سے گنی دنیائے اسلام کے خوش قسمت ملکوں میں سے ہے۔ زمین زرخیز ہے اور بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ ساحلی علاقہ میں بارش کا سالانہ اوسط ایک سو چھیاسٹھ انچ ہے۔ ملک میں قیمتی لکڑی کے جنگلوں کی کثرت ہے۔ چاول، مونگ پھلی، پام، کیلا، اناس، کافی اور نارنگی اہم پیداوار ہیں۔ ربڑ کے درختوں کی بھی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ فوتا جلوں کی سطح مرتفع مویشی بانی کا مرکز ہے۔ موسم اور مناظر کے لحاظ سے بھی یہ سطح مرتفع اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں کے مویشی پڑوسی ملکوں خصوصاً لائبیریا اور سیرالیون کو برآمد کیے جاتے ہیں۔

گنی میں معدنیات کی بھی کثرت ہے۔ بکسائیٹ کے جس سے المونیم تیار کیا جاتا ہے اور لوہے کے وسیع ذخیرے ہیں۔ دنیا میں جتنا بکسائیٹ پایا جاتا ہے اس کا ایک تہائی حصہ صرف گنی میں موجود ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر نوے لاکھ ٹن سالانہ بکسائیٹ لگایا جائے تو یہ ذخیرے بیس سال تک چل سکتے ہیں اور ان سے پچاس کروڑ ڈالر سالانہ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ بکسائیٹ کو نکالنے کا کام ایک بین الاقوامی کنسورشیم کے سپرد کیا گیا ہے جس میں گنی کا حصہ ۴۹ فیصدی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں تیس لاکھ ٹن بکسائیٹ نکالا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں بکسائیٹ برآمد کرنے کے لیے کمسر (cam sar) کے مقام پر ایک نیا بندرگاہ تعمیر کیا گیا ہے۔ لوہے کے ذخیروں کا اندازہ بھی دو ارب

ٹن سے زیادہ ہے۔ کوناکری سے لائبیریا کی سرحد تک جہاں لوہے کی کانیں ہیں بارہ سو کلومیٹر لمبی ریلوے لائن بچھائی جارہی ہے جو ۱۹۸۱ء تک مکمل ہوجائے گی۔ بکسائیٹ اور لوہے کے علاوہ گنی میں سونے اور ہیروں کی کانیں بھی ہیں اور یہ معدنیات بڑی مقدار میں برآمد کی جاتی ہیں۔ ملک کی ستر فیصد معیشت کا انحصار زراعت اور ماہی گیری پر ہے اور تیس فیصد کا انحصار کان کنی اور صنعت پر ہے۔ تازہ خبروں کے مطابق بہت سے سیاسی قیدی رہا کردیے گئے ہیں، محدود پیمانے پر نجی کاروبار کی اجازت دے دی گئی ہے اور اندرون ملک سفر میں سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اگر گنی کی حکومت قدرتی وسائل سے پوری طرح فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوگئی تو افریقہ کا یہ پسماندہ ملک بہت جلد دنیا کے خوشحال ملکوں کی صف میں آسکتا ہے۔

گنی میں تعلیم ہر سطح پر مفت ہے۔ خواندگی کا تناسب دس فیصد ہے اور بیس فیصد بچے زیر تعلیم ہیں۔ اس وقت فرانسیسی سرکاری زبان ہے اور آٹھ زبانوں کو جو مختلف قبیلے بولتے ہیں قومی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ توقع ہے کہ بعد میں سوسو یا مانیکا سرکاری زبان بن جائے۔

گنی کی ستر سے نوے فیصد آبادی مسلمان ہے۔ دارالحکومت کوناکری کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔

(الف) گنی بساؤ

جمہوریہ گنی اور سینیگال کے درمیان ایک اور ساحلی ملک ہے جسے پہلے پرتگالی گنی کہا جاتا تھا اور آزادی کے بعد سے اس کو گنی بساؤ کہا جاتا ہے۔ جغرافیائی طور پر یہ گنی ہی کا ایک حصہ ہے۔ گنی بساؤ پر انیسویں صدی میں پرتگالیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد جب مغربی افریقہ کے ملکوں میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو گنی بھی ان سے بے تعلق نہیں رہا۔ ۱۹۵۶ء میں یہاں "افریقی پارٹی برائے حریت" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی۔ جب گنی بساؤ کے گردو نواح کے تمام ممالک آزاد ہوگئے تو یہاں آزادی کی تحریک نے زور پکڑلیا اور حریت پسندوں نے ۱۹۶۲ء سے پرتگالی حکومت کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع کردی اور ۱۹۷۲ء تک دو تہائی ملک پر قبضہ کرلیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں حریت پسندوں نے "جمہوریہ گنی بساؤ" کے قیام کا اعلان کردیا جسے نوے ملکوں نے تسلیم کرلیا، لیکن پرتگال نے تسلیم نہیں کیا۔ اس سال اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کرلیا

اور ۱۹۷۴ء میں گنی بساؤ اقوام متحدہ کا رکن ہو گیا۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں جب پرتگال میں فوجی انقلاب آیا تو نئی پرتگالی حکومت نے بھی ۲۴ ستمبر ۱۹۷۴ء کو گنی بساو کی آزادی تسلیم کر لی۔

گنی بساو کے رہنما سوشلزم کے علمبردار ہیں۔ انتیس سالہ وزیر اعظم فرانسسکو مینڈیز (Mendes) جنہوں نے گنی بساو کو آزاد کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو لزبن (پرتگال) میں کار کے ایک حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ صدر لوئس دی المید اجبرال (Luis Almeida Cabral) ہیں۔

گنی کا رقبہ چودہ ہزار مربع میل (۳۶ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۶ء) پانچ لاکھ بیس ہزار ہے۔ دارالحکومت بساؤ ہے جس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے، زرعی مملکت ہے۔ مونگ پھلی اور پام کا تیل برآمد ہوتا ہے۔ اندرون ملک مویشی پالے جاتے ہیں۔ چاول خاص غذائی پیداوار ہے۔ معدنیات میں بکسائیٹ کے بیس کروڑ ٹن کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں لیکن ابھی نکالا نہیں جاتا۔

گنی کی آبادی میں مغربی ذرائع کے مطابق مسلمانوں کا تناسب ۳۵ سے چالیس فیصد تک ہے اور مسلمانوں کے دعوے کے مطابق یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مردم شماری نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب قیاسی اعداد و شمار ہیں۔ جمہوریہ گنی اور سینیگال میں مسلمانوں کا تناسب چونکہ نوے فیصدی تک تخمینہ کیا گیا ہے اور گنی بساؤ چونکہ ان دونوں ملکوں کے درمیان واقع ہے اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع تمام ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت اندرون ملک میں ہے اور ساحلی علاقوں میں ان کی اکثریت صرف سینیگال اور گیمبیا میں ہے۔ جمہوریہ گنی کے متعلق بھی چند سال پہلے تک یہی کہا جاتا تھا کہ اس کے ساحلی علاقے میں سوسو نام کا قبیلہ آباد ہے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے اگرچہ اس میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ گنی بساؤ بھی ساحلی علاقہ ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ یہاں مسلمانوں کا تناسب اتنا نہ ہو جتنا مسلمان ذرائع میں بتایا جاتا ہے۔ ویسے گنی کی حکومت اور وہاں کی تحریکوں کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک مسلمان ملک ہوگا۔ حکومت کے سارے افراد عیسائی ہیں، حالانکہ ملک میں عیسائیوں کا تناسب خود مسیحی دعووں کے مطابق دو فیصد سے زیادہ نہیں۔ پرتگالی دور میں چونکہ عیسائیوں کی کھل کر سرپرستی کی گئی

اور تعلیمی سہولتیں بھی ان کو فراہم کی گئیں اس لیے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ سارا کا سارا عیسائی ہے۔ وہی اقتدار پر قابض ہے اور اسی نے سوشلزم کے جھنڈے کے نیچے آزادی کی جنگ لڑی۔ گنی بساؤ میں اسلامی دنیا کی تحریکوں سے یا پڑوس کے مسلمان ملکوں سے کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی بلکہ یہاں کی حکومت جمہوریہ گنی یا سینیگال کے قریب آنے کی بجائے جس کا وہ ایک جغرافیائی حصہ ہے، کئی سو میل دُور ''جزائر راس ورڈے'' کے ساتھ یونین بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ جزائر سینیگال کے مغرب میں ہیں اور آزادی کی جنگ جس پارٹی نے لڑی ہے اس کا پورا نام ''افریقی پارٹی برائے حریت راس ورڈے اور گنی'' (paigc) ہے۔ راس ورڈے نے ۵۔ جولائی ۱۹۷۵ء کو پرتگال سے آزادی حاصل کر لی ہے اور یہاں کی اکثریت عیسائی ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

باب ۴۳

جمہوریہ گیمبیا

گیمبیا دریائے گیمبیا کی وادی کا نام ہے جو تین طرف سے سینیگال سے گھری ہوئی ہے۔ برطانوی تاجروں نے جو غلاموں کی تجارت کیا کرتے تھے سترھویں صدی میں دریائے گیمبیا کے دہانہ پر مختلف مراکز قائم کر لیے تھے۔ غلاموں کی تجارت کا یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ افریقی باشندے اس کثرت سے یہاں سے غلام بنا کر امریکہ بھیجے گئے کہ آج امریکہ کے نیگرو باشندے گیمبیا کو اپنا روحانی وطن تصور کرتے ہیں۔ ۱۸۰۷ء میں یہاں کا انتظام سیرالیون کی برطانوی نو آبادی سے ہوتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں گیمبیا کو الگ کر کے تاج برطانیہ کی نو آبادی کا درجہ دے دیا گیا۔ لیکن ۱۸۶۶ء میں اسے پھر مغربی افریقہ کے برطانوی مقبوضات سے ملحق کر دیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ نو آبادی کی حد بندی کی گئی۔ ۴۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو گیمبیا کو اندرونی خود مختاری دی گئی۔ ۱۸۔ فروری ۱۹۶۵ء کو نئے آئین کے الفاظ کے ساتھ گیمبیا نے آزادی حاصل کر لی لیکن ملک برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہا۔ نومبر ۱۹۶۵ء میں ملک کو جمہوریہ بنانے کے لیے استصواب رائے عامہ کیا گیا۔ جمہوریہ بنانے کے حق میں اکسٹھ ہزار نوسو ووٹ آئے جب کہ اُس کی مخالفت میں اکتیس ہزار نوسو ووٹ آئے۔ آئین کے تحت چونکہ دو تہائی اکثریت ضروری تھی اس لیے جمہوریہ نہیں بن سکا۔ بالآخر اپریل ۱۹۷۰ء میں گیمبیا برطانوی دولت مشترکہ کے اندر جمہوریہ بن گیا۔ مملکت زیمبیا کے نام سے خلط ملط کے امکان سے بچنے کے لیے نئی جمہوریہ کا سرکاری نام دی ''گیمبیا'' رکھا گیا ہے۔

گیمبیا کی سب سے پرانی جماعت گیمبیا مسلم کانگریس تھی جس کے رہنما گو جا جا ھمبا تھے۔ یہ جماعت ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی تھی اور ۱۹۵۹ء تک اس کا زور رہا۔ اس کے بعد داؤ د جوارا کی عوامی ترقی پسند پارٹی (پیپلز پروگریسو پارٹی) کا زور بڑھ گیا جو ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ داود جوارا (Dawds Jawara) ۱۶۔ مئی ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ مسلمان ہیں اور منڈنگو قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے باتھرسٹ کے ابتدائی مشنری اسکول میں تعلیم پائی پھر غانا کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں گلاسکو یونیورسٹی میں وٹنری سائنس (علاج حیوانات) کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے عوامی ترقی پسند پارٹی قائم کی اور جون ۱۹۶۲ء

میں گیمبیا کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ گیمبیا کے جمہوریہ بننے کے بعد ۲۴۔ اپریل ۱۹۷۰ء کو صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۲ء کے انتخابات میں ان کی پارٹی نے پھر کامیابی حاصل کی اور پارلیمنٹ کے ۳۲ ممبروں میں سے ۲۸ ممبران کی پارٹی کے منتخب ہوئے جس کے بعد وہ پھر صدر منتخب ہو گئے اور اب تک اس عہدہ پر فائز ہیں۔ صدر داود جوارا سینے گال سے قریبی تعاون کے حامی ہیں اور اس مقصد کے لیے ایک مشترکہ مرکز قائم کیا ہے جسے سینے گیمبیائی سکریٹریٹ کہا جاتا ہے۔

گیمبیا ایک تنگ وادی ہے جو ساحل سمندر سے دریائے گیمبیا کے ساتھ ساتھ دو سو میل اندر تک چلی گئی ہے۔ چوڑائی صرف بیس میل ہے۔ گیمبیا کا علاقہ دریا کے دونوں طرف ہے۔ دارالحکومت دریا کے کشادہ دہانہ میں واقع جزیرہ سینٹ میری پر واقع ہے اور دنیا کے بہترین بندرگاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ چاول اور مونگ پھلی خاص پیداوار ہے اور مونگ پھلی سب سے بڑی برآمد ہے۔ حکومت جنگلات، مویشی بانی اور ماہی گیری کو ترقی دے رہی ہے۔ ماہی گیری کو ترقی دینے کے لیے جاپان سے مدد لی جارہی ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا آنے کی وجہ سے دریا کا پانی ڈیڑھ سو میل تک کھارا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جگہ جگہ دریا پر بند تعمیر کرنے کے منصوبے زیر غور ہیں۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز پر بھی غور کیا جارہا ہے۔ حکومت گیمبیا کو بیروت اور سنگاپور کے نمونہ پر ترقی دینا چاہتی ہے اور موسم چونکہ نومبر سے مئی تک خوشگوار ہوتا ہے اس لیے سیاحت کو ترقی دینے کی طرف خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ نئے نئے ہوٹل تعمیر کیے جارہے ہیں۔ سعودی عرب کے ایک تاجر کی مدد سے پانچ سو بستروں کا ایک بہت بڑا ہوٹل اس وقت زیر تعمیر ہے۔ اسکینڈی نیویا سے ہر سال ۲۵ ہزار سیاح موسم سرما میں گیمبیا کے موسم سے لطف اٹھانے کے لیے آتے ہیں۔ امریکی حبشی چونکہ گیمبیا کو اپنا روحانی وطن سمجھتے ہیں اس لیے توقع ہے کہ سیاحوں کی ایک بہت بڑی تعداد مستقبل میں امریکہ سے آنے لگے گی۔ ملک میں چار سو قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں۔

گیمبیا میں خواندگی کا تناسب صرف دس فیصد ہے اور بیس فیصد بچے زیر تعلیم ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں جمہوریہ گیمبیا نے ہر سطح پر عربی زبان کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کام میں لیبیا مدد کر رہا ہے۔ حکومت بلاسودی اسلامی بنکنگ سسٹم کو رواج دینے پر بھی غور کر رہی ہے۔

گیمبیا کا رقبہ چار ہزار مربع میل اور آبادی ۱۹۷۸ء کے تخمینہ کے مطابق 5½ لاکھ ہے۔ منڈنگو، فولا اور وولف سب سے بڑے قبیلے ہیں۔ ملک کی نوے فیصد آبادی مسلمان ہے۔ بنجول جس کا نام برطانوی دور میں باتھرسٹ تھا دارالحکومت ہے۔ آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے جس میں ۷۵ فیصد مسلمان ہیں۔

باب ۴۴

جمہوریہ نائیجر

موجودہ صدی سے پہلے نائیجر نام کی کوئی مملکت نہیں تھی۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں نائیجر سلطنت کانم کا ایک حصہ تھا۔ اس کے بعد چودھویں اور پندرھویں صدی میں جمہوریہ نائیجر کا وہ حصہ جو دریائے نائیجر کی وادی میں واقع ہے مالی اور سونگھائی کی سلطنتوں میں شامل تھا اور وہ حصہ جو موجودہ نائیجریا کے شمال اور مغرب میں ہے ہاوسا قبیلہ کی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں نائیجر کے ایک حصے پر سوکوٹو کے فولانی خاندان کا اقتدار قائم ہوگیا جس کے حکمران سلطان سوڈان کہلاتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخری دہائی میں جب فرانس نے مملکت مالی پر قبضہ کرلیا تو اس نے نائیجر کی طرف قدم بڑھائے اور ۱۹۰۰ء کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز میں نائیجر پر بھی قبضہ کرلیا۔ ۱۹۰۴ء میں مغربی افریقہ کے دوسرے مقبوضات کی طرح فرانس نے نائیجر کو نوآبادی قرار دے دیا۔ یہ حصہ بھی مغربی افریقہ کی دوسری فرانسیسی نوآبادیوں کی طرح مغربی افریقہ کے فرانسیسی گورنر جنرل کے تحت تھا جس کا مرکز ڈاکر میں تھا۔ ۱۹۴۶ء میں یہاں مشاورتی کمیٹی قائم کی گئی اور باشندوں کی ایک محدود تعداد کو فرانسیسی شہریت دی گئی۔

فرانس کے نئے آئین کے تحت علاقہ نائیجر نے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو فرانس سے علیحدہ ہوکر جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔ نائیجر کی اسمبلی نے ۲۵۔ فروری ۱۹۵۹ء کو نیا آئین منظور کیا اور ہامانی دیوری وزیراعظم منتخب ہوئے۔ ان سے پہلے جیبو باقری وزیراعظم تھے لیکن دسمبر ۱۹۵۸ء کے انتخابات میں وہ ہار گئے تھے اور صرف چھ نشستیں حاصل کرسکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں باقری کی جماعت سوابا پارٹی کو حکومت نے توڑ دیا، اور اس کے سرکردہ رہنما گرفتار کرلیے گئے۔ جیبو باقری ملک سے فرار ہوگئے اور مالی میں پناہ حاصل کرلی۔ باقری اپنے نظریات میں مالی کے صدر مودیبو کیتا اور گنی کے صدر شیخ طوری کے ہمنوا تھے۔ وہ سوشلسٹ اصلاحات کے علاوہ نائیجر اور مالی کو فیڈریشن میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ ۳۔ اگست ۱۹۶۰ء کو نائیجر نے فرانس سے مکمل

آزادی حاصل کرلی۔ آزادی کے بعد ہامانی دیوری نائیجر کے صدر منتخب ہوئے۔

ہامانی دیوری مسلمان ہیں۔ وہ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نائیجر اور دے ہومی میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈاکر چلے گئے جو اس وقت فرانسیسی مغربی افریقہ کا دارالحکومت تھا۔ اس کے بعد انہوں نے معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پھر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے فرانسیسی مغربی افریقہ کی مشہور سیاسی جماعت۔ آر۔ ٹی۔ اے (R.T.A) کی تشکیل میں حصہ لیا۔ ہامانی دیوری فرانس کی قومی اسمبلی کے رُکن بھی رہے ہیں اور دسمبر ۱۹۵۸ء میں وہ نائیجر کے وزیر اعظم ہو گئے۔

ہامانی دیوری کی پالیسی فرانس کے ساتھ تعاون پر مبنی ہے۔ آزادی کے بعد اگرچہ نائیجر نے فرانسی اتحاد (french community) سے باہر رہنا پسند کیا لیکن فرانس کے ساتھ نائیجر کے قریبی تعلقات قائم ہیں۔

ہامانی دیوری کی حکومت قبائلی سرداروں کے تعاون سے قائم ہے اور سرداروں کے مفاد کی نمائندگی کے لیے ایک علیحدہ وزارت قائم ہے۔ ہامانی دیوری کا یہ متحدہ محاذ یونین پاپولر یا مختصر طور پر یو۔ سی۔ ایف۔ اے (U.C.F.A) کے نام سے مشہور ہے۔ نائیجر افریقہ کے ان مسلم ملکوں میں ہے جس نے اسرائیل سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ چنانچہ اسرائیلی ماہر زراعت اور آبپاشی کے منصوبوں میں کام کر رہے ہیں۔

۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں حزب مخالف کے جلاوطن رہنما جیبو باقرمی نے نمانا سے دہشت انگیزی کی کاروائیاں جاری رکھیں لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۴ء صحرائے اعظم کے دوسرے ملکوں موریتانیا، سینے گال اور مالی کی طرح نائیجر بھی بدترین قحط کا شکار ہوا جس کے دوران بے شمار مویشی ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد ملک میں بے چینی پھیل گئی اور طلبہ نے ایک جماعتی نظام کے خلاف مظاہرے کیے اور بالآخر ۱۵۔ اپریل ۱۹۷۴ء کو فوج نے کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ کرنل (Seyni Konutche) کی قیادت میں ہامانی دیوری کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اس طرح چودہ سال بعد نائیجر کی آزادی کے اس معمار کا اقتدار ختم ہوگیا۔ اس وقت سے نائیجر میں فوجی کونسل حکمراں ہے۔ قومی اسمبلی توڑ دی گئی ہے اور تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی ہے۔

ہامانی دیوری ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے اور صدر منتخب ہو گئے۔

نائیجر کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے اور صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہے۔ کاشت کاری دریائے نائیجر کی وادی اور نائیجریا سے ملحق حصوں تک محدود ہے جہاں ضرورت کے مطابق بارش ہو جاتی ہے۔ گلہ بانی اہم پیشہ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں شمال مغرب میں ارلت (arlit) کے مقام پر یورے نیم کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جس سے ملک کا معاشی مستقبل روشن ہو گیا ہے۔ ان کو نکالنے کے لیے ۱۹۶۷ء میں فرانس سے ایک معاہدہ ہو گیا۔ جس کے بعد ۱۹۷۱ء سے یورے نیم نکلنا شروع ہو گیا ہے۔ اس سال یورے نیم کی مزید کانیں بھی دریافت ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ نائیجر کے یہ ذخیرے دنیا میں یورے نیم کے پانچویں سب سے بڑے ذخیرے ہیں۔ اس وقت فرانس، جرمنی اور اٹلی کی ایک مشترکہ کمپنی یورے نیم نکال رہی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں بارہ ہزار ٹن یورے نیم نکالا گیا تھا۔ ایک اور کمپنی جو نائیجر، فرانس اور جاپان پر مشتمل ہے ضلع آکوتا (akouta) کے ذخیروں کو ترقی دے رہی ہے۔

نائیجر میں تعلیم مفت ہے لیکن خواندگی کا اوسط صرف پانچ فیصد ہے۔ الجزائر کو بحرِ اوقیانوس سے ملانے کے لیے ماورائے صحرائے اعظم جو شاہراہ تعمیر ہو رہی ہے وہ مالی اور نائیجر کو الجزائر سے ملا دے گی۔ اس کا الجزائر والا حصہ ۱۹۷۳ء میں مکمل ہو گیا تھا۔

نائیجر کا سب سے بڑا قبیلہ ہاوسا ہے، اس کے بعد جربہ، سونگھائی اور فولانی بڑے قبیلے ہیں۔ ہاوسا مغربی افریقہ کا سب سے بڑا قبیلہ ہے اور اس کی زبان جو قبیلے کے نام پر ہاوسا کہلاتی ہے پورے مغربی افریقہ کی مشترکہ زبان ہے۔ ہاوسا باشندے چونکہ تجارت پیشہ ہیں اس لیے مغربی افریقہ کے ہر شہر میں ان کی بستیاں موجود ہیں۔ سونگھائی قبیلے نے سولہویں صدی میں مغربی افریقہ میں اسکیا خاندان کی عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی۔ فولانی قبیلے نے بھی انیسویں صدی میں نائیجریا اور مالی میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں۔ نائیجر کے صحرائی علاقہ میں بربر نسل کے باشندے آباد ہیں جن کی تعداد پانچ لاکھ کے قریب ہے اور سب خانہ بدوش ہیں۔ نائیجر کے بربر زیادہ تر توارع قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملک کی پچاسی یا نوے فیصد آبادی مسلمان ہے۔ نیامی جو دریائے نائیجر کے کنارے واقع ہے دارالحکومت ہے۔ آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔
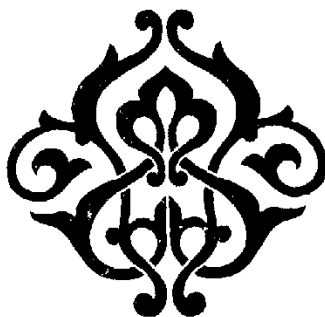
باب ۴۵

جمہوریہ چاڈ

نائیجر، گنی اور افریقہ کے کسی دوسرے ملک کی طرح چاڈ بھی ایک نیا نام اور نئی مملکت ہے جو اس علاقہ پر فرانس کے قبضہ کے بعد وجود میں آئی۔ عہد قدیم میں یہ علاقہ کانم کی سلطنت کا ایک حصہ تھا پھر بورنو کی سلطنت کا حصہ بنا۔ ودای اور بگیرمی کی سلاطین کی حکومتیں بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ [۱] فرانس نے اس علاقہ پر موجودہ صدی کے آغاز میں قبضہ کیا تھا اور جس طرح مغربی افریقہ فرانسیسی دور میں آٹھ انتظامی حصوں میں تقسیم تھا، جس کا مرکز برازیول تھا جو اب کانگو کا صدر مقام ہے۔ یہ حصے چاڈ، اوبنگی شاری [۲]، فرانسیسی کانگو اور گابون کہلاتے تھے۔ ۱۹۵۸ء کے فرانسیسی آئین کے بعد یہ چاروں علاقے بھی علاقائی خودمختاری اور آزادی کے ان تمام مراحل سے گزرے جن سے مغربی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیاں گزری تھیں۔ ان میں چاڈ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے اور یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ [۳]

آزادی

چاڈ کو مارچ ۱۹۵۹ء میں اندرونی آزادی ملی اور ۱۱۔ اگست ۱۹۶۰ء کو مکمل آزادی مل گئی۔ چاڈ میں مسلمانوں کا تناسب کم سے کم پچپن فیصد ہے۔ شمالی حصہ تقریباً تمام مسلمان ہے اور جنوبی حصہ میں وہ اقلیت میں ہیں۔ لیکن مسلمان چونکہ فرانسیسی دور میں تعلیم میں پیچھے رہے اور عیسائی

---

(۱) کانم کی سلطنت کی تاریخ کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم کا باب ہشتم اور بورنو، ودای اور بگیرمی کی تاریخ کے لیے دیکھیے اس کتاب کا باب ۳۵۔

(۲) آزادی کے بعد اس علاقے کا نام "جمہوریہ وسطی افریقہ" ہوگیا۔

(۳) مسلمان اداروں اور مصنفین کی بعض کتابوں اور نقشوں میں جمہوریہ وسطی افریقہ، کانگو اور گابون مسلم اکثریت کے علاقے بتائے گئے ہیں، لیکن یہ غلط ہے۔ خود چاڈ کے جنوبی حصوں میں اسی طرح غیر مسلم اکثریت ہے جس طرح سوڈان کے جنوبی صوبوں میں ہے اور مذکورہ بالا تینوں علاقے چاڈ کے بھی جنوب میں واقع ہیں اور مسلمانوں کے تاریخ اور تہذیبی مرکزوں سے ہمیشہ کٹے رہے ہیں۔

آبادی نے فرانس کی سرپرستی میں تعلیم بھی حاصل کی اور عہدے بھی پائے اس لیے آزادی کے بعد اقتدار عیسائی اقلیت کے ہاتھ میں آ گیا جس کا تناسب پوری آبادی میں ایک چوتھائی بھی نہیں تھا۔ آزادی کے بعد چاڈ کے صدر بھی ایک عیسائی فرانکوے تومبل بائے (Farancois Tombal Baye) منتخب ہوئے جو ترقی پسند پارٹی (P.P.C) کے رہنما تھے۔ قومی افریقی پارٹی شمال کے مسلمانوں کی ترجمان تھی اور احمد کلام اللہ اس کے صدر تھے۔ ۱۸۔ مارچ ۱۹۶۰ء کو یہ پارٹی ترقی پسند پارٹی میں ضم ہوگئی۔ احمد کلام اللہ بگیری کے عربوں کے ترجمان تھے اور مارچ ۱۹۵۹ء میں وزیراعظم رہ چکے تھے۔ قومی افریقی پارٹی کے مسلمان رہنماؤں میں علی جبران خیر اللہ وزیر انصاف اور وزیر خزانہ رہ چکے ہیں۔ آزادی کے حصول کے وقت ملک میں جمہوری فضا قائم تھی، لیکن صدر تومبل بائے نے جلد ہی آمرانہ طریقے اختیار کرنا شروع کر دیے اور ۱۹۶۲ء میں تمام مخالف پارٹیوں کو جو سب مسلمانوں کی نمائندگی کرتی تھیں خلاف قانون قرار دے دیا اور ایک جماعتی حکومت قائم کر دی۔ صدر کے اس آمرانہ اقدام سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا اور وہ سیاست سے عملاً بے دخل ہوگئے۔ جب جمہوری طریقے سے تبدیلی لانے کے دروازے بند ہوگئے تو مسلمان مسلح جدوجہد پر مجبور ہوگئے۔

۱۹۶۳ء میں دار الحکومت فورٹ لامی سے ہنگاموں کا آغاز ہوا۔ جون ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں نے آزادی کا قومی محاذ قائم کیا جو انگریزی میں (floriana) کہلاتا ہے۔ اس کے بعد ملک میں مکمل بغاوت ہوگئی۔ اور سوڈان میں مسلمانوں نے چاڈ کی اسلامی جمہوریہ کے نام سے آزاد حکومت قائم کر لی۔ صدر تومبل بائے نے فرانسیسی فوج کی مدد سے جو معاہدہ کے تحت شمالی چاڈ میں موجود تھی۔ جو بغاوت کا مرکز تھا ۱۹۶۸ء تک بغاوت کچل دی اور ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو سوڈان میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۹۷۱ء میں بیشتر فرانسیسی فوج واپس چلی گئی۔ صدر تومبل بائے کی اس کامیابی کے باوجود ملک میں بے چینی قائم رہی۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۷۵ء کو ایک فوجی بغاوت ہوئی جس میں صدر تومبل بائے مارے گئے اور جنرل مالم فیلکس (Malloum Felix) صدر ہو گئے۔ اکتوبر میں فرانسیسی فوجی اڈے بھی ختم ہو گئے۔ حریت پسند مسلمانوں کے ایک حصہ نے اس کے بعد حکومت سے تعاون شروع کر دیا لیکن قومی محاذ آزادی نے اپنی پالیسی تبدیل نہیں کی۔ قومی محاذ آزادی نے لیبیا اور الجزائر کے درپردہ تعاون سے ۱۹۷۷ء کے وسط تک چاڈ کے

تمام شمالی حصہ پر قبضہ کر لیا۔ صرف ودامئی کے علاقہ میں حسن احمد موسیٰ واحد مسلمان رہنما ہیں جو نئی حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔ ۶۔ فروری ۱۹۷۸ء کو چاڈ کی حکومت نے لیبیا سے تعلقات توڑ لیے اور الزام لگایا کہ لیبیا شمالی حصہ میں باغیوں کی مدد کر رہا ہے جس کی وجہ سے تیس ہزار مربع میل (۸۷ ہزار کلومیٹر) کے علاقہ پر باغی قابض ہو گئے ہیں۔ ۲۴۔ فروری ۱۹۷۸ء کو لیبیا، چاڈ، سوڈان اور نائیجر نے چاڈ میں خانہ جنگی ختم کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ لیکن اپریل میں باغیوں نے جنگ بندی توڑ دی اور ۲۴۔ اپریل کو محاذ آزادی کی طرف سے جنوبی چاڈ کے ایک شہر میں ہڑتال بھی ہوئی جس کے دوران فرانسیسی باشندوں پر حملے بھی ہوئے۔ چاڈ کی حکومت نے ایک بار پھر فرانسیسیوں سے مدد طلب کی اور باغیوں کو پسپا کر دیا۔ لیکن چاڈ میں امن بہرحال ابھی تک قائم نہیں ہوا اور مسلمان حکومت پر الزام لگا رہے ہیں کہ وہ جنوبی حصہ میں مسلمانوں کا قتل عام کرا رہی ہے۔

اس وقت چاڈ کے صدر مالم فیلکس اور وزیر اعظم حسنی حربے (Harbe) ہیں۔

معیشت

چاڈ ایک وسیع وعریض ملک ہے جس کا نصف شمالی حصہ صحرائے اعظم میں ہے اور ریگستانی ہے۔ اس کے بعد وسطی علاقے میں گھاس کے میدان ہیں۔ جھیل چاڈ، بگیرمی اور ودامئی اس علاقے میں ہیں۔ یہ علاقہ مویشی بانی کا مرکز ہے۔ شمال کی طرح یہاں کے باشندے بھی تقریباً سب مسلمان ہیں۔ بارش بھی خاصی ہوتی ہے اور جھیل کے قریب بیس انچ سالانہ کا اوسط ہے۔ اس کے بعد جنوب میں جنگلوں کا علاقہ ہے جہاں بارشوں کا اوسط ۳۵ انچ ہے اور یہاں شاری اور لوگون دو بڑے دریا بھی ہیں۔ روئی اور مونگ پھلی کی کاشت کو معیشت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مویشی بھی بڑی تعداد میں برآمد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے قحط میں ایک لاکھ مویشی ہلاک ہو گئے تھے۔ شمالی چاڈ میں یورے نیم اور لوہے کے ذخیرے ہیں لیکن خانہ جنگی کی وجہ سے ابھی تک ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ باغیوں کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بھی یہی علاقہ ہے۔ چاڈ میں ذرائع مواصلات کی بہت کمی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جنوبی چاڈ کے شہر سرح (Sarh) اور کیمرون کے شہر نگوندیرے (Ngaoudere) کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا

کام شروع ہوا تھا جو معلوم نہیں کہاں تک پہنچا۔ دارالحکومت فورٹ لامی کو بھی ریل کے ذریعہ نائیجریا سے ملانے کا منصوبہ ہے۔ دو نیشنل پارک اور پانچ شکاریوں کے لیے محفوظ علاقے بنائے گئے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں دارالحکومت میں پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی جس میں طلبہ کی تعداد تین سو ہے۔ خواندگی کا تناسب پانچ چھ فیصد کے قریب ہے۔ طلبہ اسلامی تعلیم کے لیے مصر جاتے ہیں۔ اسرائیل سے چاڈ کے تعلقات ۱۹۷۲ء میں ختم ہو گئے۔

چاڈ کا دارالحکومت فورٹ لامی ہے جس کا نام نومبر ۱۹۷۳ء سے نجمینہ (ndjamena) کر دیا گیا ہے یہ عہد قدیم میں کانم کی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اس طرح جنوب میں شہر آرچم بالٹ کا نام سرح (Sarh) کر دیا گیا ہے۔ یہ دوسرا بڑا شہر ہے جس کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔ نجمینہ کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔

باب ۴۶

افریقہ کا دیو: نائیجیریا

تاریخی پس منظر

مغربی افریقہ کے جن ملکوں کا اب تک تذکرہ کیا جا چکا ہے ان میں سوائے گیمبیا کے سب نے فرانسیسی سامراج سے آزادی حاصل کی تھی، لیکن مغربی افریقہ کا ایک خاصا بڑا حصہ برطانیہ کے تسلط میں بھی تھا۔ یہ حصہ نائیجیریا، سیرالیون، غانا اور گیمبیا کے ملکوں پر مشتمل تھا۔ ان میں گیمبیا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے سب سے چھوٹا ہے اور نائیجیریا سب سے بڑا ہے۔ سیرالیون اور غانا میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اکثریت ان کو نائیجیریا میں بھی حاصل نہیں، لیکن یہاں مسلمان سب سے بڑا واحد عنصر ہیں اور یہاں کوئی حکومت مسلمانوں کے تعاون کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ پورے ملک کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد نصف کے لگ بھگ ہے اور مسلمان اکثریت کے علاقے اپنے رقبہ اور آبادی میں نصف سے زیادہ نائیجیریا پر مشتمل ہیں۔ اور اس کا قومی امکان ہے کہ اگلی مردم شماری میں ان کی پورے ملک میں بھی اکثریت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نائیجریا کا تذکرہ مسلمان ملک کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔

نائیجر کی طرح نائیجیریا بھی ایک نیا نام اور نیا ملک ہے۔ لیکن نائیجیریا کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی مالی کی۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں بتایا جا چکا ہے کہ جھیل چاڈ کے نواح میں کانم کی مملکت میں گیارہویں صدی مسیحی میں اسلام پھیل چکا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پاکستان اور ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ موجودہ نائیجریا کی سب سے بڑی ریاست بورنو جو شمال مشرق میں واقع ہے کانم کی سلطنت ہی کا ایک حصہ تھی اور کانم کے زوال کے بعد سولہویں صدی میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس پورے علاقے کو بورنو [1] کہا جانے لگا۔ نائیجیریا کے دوسرے شمالی حصوں میں بھی جن کے مرکز کانو، کاٹسینا اور زاریا کے شہر تھے چودھویں صدی میں

---

(۱) بورنو کی سلطنت اور نائیجیریا کی قدیم تاریخ کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب ۳۵

اسلام پھیل چکا تھا اور ہاوسا ریاستوں کے کئی حکمراں مسلمان ہو چکے تھے۔ سولہویں صدی تک کانو اور کاٹسینا صحرائے اعظم کے جنوب میں مالی کے بعد اسلامی علوم کے سب سے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ انیسویں صدی میں جنوب کے ساحلی علاقے کو چھوڑ کر باقی نائیجیریا فولانی قبیلے کی مختلف ریاستوں میں تقسیم تھا، جن پر انگریزوں نے یکے بعد دیگرے آسانی سے قبضہ کر لیا اور ۱۹۰۳ء تک انہوں نے پورے نائیجیریا کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ اپنی اس نئی مملکت کو انگریزوں نے دریائے نائیجر کی نسبت سے جو اس ملک کے وسط سے گزرتا ہے، نائیجیریا کا نام دیا۔ برطانوی دَور کے شروع میں نائیجیریا انتظامی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک شمالی حصہ اور دوسرا جنوبی حصہ۔ ۱۹۳۹ء میں جنوبی حصے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی علاقہ اور مغربی علاقہ۔

شمالی علاقہ جو پورے نائیجیریا کے تین چوتھائی رقبے اور ۵۸ فیصد آبادی پر مشتمل تھا، اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مغربی علاقے میں جہاں یوروبا نسل کے باشندوں کی اکثریت ہے مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی تھی، لیکن اکثریت کسی مذہب کے پیروؤں کو حاصل نہ تھی۔ مشرقی علاقے میں جہاں ایبو نسل کے باشندوں کی اکثریت تھی عیسائیت کا زور تھا۔ ان تینوں علاقوں کو وہاں کے سب سے بڑے تین قبیلوں کی نسبت سے ہاوسا لینڈ، یوروبا لینڈ اور ایبو لینڈ بھی کہا جاتا تھا۔ شمالی علاقے کا صدر مقام کڈونا، مغربی علاقے کا ایبادان اور مشرقی علاقے کا انوگو تھا۔ بندرگاہ لاگوس جو مغربی علاقے میں واقع تھا نائیجیریا کا مرکزی دارالحکومت تھا۔

انگریزوں نے نائیجیریا کے کچھ حصے کو براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا تھا کچھ حصوں میں مقامی حکومتوں[1] کو برقرار رکھا تھا۔ شمال میں ان مقامی حکومتوں کی تعداد تیس تھی اور یہ سب مسلمان تھیں۔ ان میں سب سے بڑی ریاستوں کے نام سوکوٹو، بورنو، باچی، کاٹسینا، زاریا اور آداماوا ہیں ان کے حکمران امیر کہلاتے ہیں، رقبے میں بورنو اور آبادی میں کانو سب سے بڑی ریاستیں ہیں۔ انگریزوں اور ان ریاستوں کے امیروں کے درمیان جو معاہدے ہوئے تھے ان کے تحت برطانیہ نے وعدہ کیا تھا کہ ان ریاستوں میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات اور ان کے مروجہ قوانین میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

---

(۱) برصغیر پاکستان و ہند میں ان مقامی حکومتوں کو ریاست (state) کہا جاتا تھا جب کہ نائیجیریا میں ان کو (native authorities) یعنی مقامی مقتدرہ یا حکومت کہا جاتا تھا۔

آزادی کی جدوجہد

۱۹۴۶ء نائیجیریا کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال ملک کے تینوں حصوں میں علاقائی اسمبلیاں قائم کی گئیں اور مرکز میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی۔ اس کے بعد جو سیاسی جدوجہد شروع ہوئی اس میں نائیجیریا کے مسلمانوں نے جداگانہ حیثیت سے حصہ نہیں لیا۔ یہ جدوجہد زیادہ تر علاقائی اور نسلی بنیاد پر ہوئی لیکن شمال میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں کی قیادت تقریباً پوری کی پوری مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے شمال کی سیاست ایک طرح سے مسلمانوں کی سیاست بن گئی۔ نائیجیریا کی تحریک آزادی اس معاملے میں برصغیر کی تحریک آزادی سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے۔

شمال کے مسلمانوں کو نئی آئینی اصلاحات کی وجہ سے کئی خطرے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں شمال کو تناسب سے کم نمائندگی دی گئی تھی اور شمال والے اکثریت میں ہونے کے باوجود اسمبلی میں اقلیت میں تھے۔ علاوہ ازیں جنوب کے لوگوں میں سیاسی شعور[1] زیادہ تھا، اس لیے مرکزی ملازمتوں پر بھی وہی چھائے ہوئے تھے، ان حالات کے پیش نظر شمال کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ ایک مرکزی حکومت کے تحت وہ جنوب والوں کے غلام بن جائیں گے اس خطرے کے سدِ باب کے لیے شمال کے لوگوں نے حسب ذیل تین مطالبے پیش کیے:

۱۔ ملک میں مرکزی وحدانی نظام کی بجائے وفاقی نظام قائم کیا جائے جس میں ہر علاقے کو اندرونی خودمختاری حاصل ہو۔

---

(۱) نائیجیریا کے ساحلی علاقے چونکہ انگریزوں کے قبضے میں پہلے آئے تھے اس لیے حکومت نے ان پر زیادہ توجہ دی۔ اس کے علاوہ عیسائی تبلیغی ادارے بھی شروع ہی سے ان علاقوں میں مدرسے اور شفاخانے قائم کرنے میں مصروف رہے جس کی وجہ سے نائیجیریا کے جنوبی علاقوں کو شمالی علاقے کی نسبت تعلیمی، سیاسی اور معاشی ترقی کے زیادہ مواقع میسر آئے۔ جنوبی علاقوں کے لوگوں کو انگریزی زبان پڑھنے اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں تھی لیکن یہ باتیں دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح نائیجیریا کے مسلمانوں کے لیے آسانی سے قابل قبول نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرح شمالی نائیجیریا کے مسلمان بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور جنوبی علاقوں کے مسیحی باشندے اقلیت میں ہونے کے باوجود ملکی سیاست، حکومت، تعلیم، کاروبار اور تجارت وصنعت پر اسی طرح چھا گئے جس طرح ہندو باشندے پاکستان بننے سے پہلے ان علاقوں کی پوری معیشت اور سماجی زندگی پر چھائے ہوئے تھے جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ اس غیر مساوی ترقی کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے مسلم شمالی حصے اور اور غیر مسلم جنوبی حصے کے درمیان مستقل کشمکش رہتی ہے۔

۲۔ وفاقی مجلس قانون سازی میں شمال کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

۳۔ ملک کی آمدنی ہر علاقے میں آبادی کے تناسب سے تقسیم کی جائے، ان مطالبوں کی منظوری کی شکل میں چونکہ جنوب کی اجارہ داری میں فرق آتا تھا اس لیے شمال کے ان مطالبوں کی جنوب کے باشندوں نے شدت سے مخالفت کی اور شمال اور جنوب کی یہ کشمکش اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک مرتبہ شمال کے رہنما احمد وبلو نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''اگر جنوب کے لوگ متحدہ نائیجیریا چاہتے ہیں، تو ان کو اسلام قبول کر لینا چاہیے۔

بہرحال ۱۹۵۷ء میں یہ کشمکش ختم ہوگئی۔ شمال کے سارے مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور نائیجیریا کے لیے وفاقی نظام قائم ہوگیا۔ ۲۔ ستمبر ۱۹۵۷ء کو شمال کے رہنما ابوبکر تفادا بلیوا وفاقی نائیجیریا کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے اور وہ اس عہدے پر ۱۹۶۶ء میں شہادت پانے تک فائز رہے۔ اسی سال (۱۹۵۷ء) مشرقی اور مغربی علاقوں کو اندرونی خودمختاری دی گئی۔ شمالی علاقے کو ڈیڑھ سال بعد ۱۵۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو خودمختاری حاصل ہوئی، اور یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ابوبکر تفادا بلیوا کی قیادت میں نائیجیریا نے برطانیہ سے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ اس کے بعد نئے آئین کی تیاری شروع ہوئی اور اس کی تکمیل کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نائیجیریا کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ ابوبکر تفادا بلیوا بدستور وزیراعظم رہے اور مشرقی علاقے کے ممتاز سیاسی راہنما ڈاکٹر ازکوی جو پہلے گورنر جنرل تھے۔ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

احمد وبلو

نائیجیریا کی آزادی کی جدوجہد میں جن رہنماؤں نے حصہ لیا، ان میں احمد وبلو، ابوبکر تفادا بلیوا، ڈاکٹر ازکوی (Azikiwe) اور ایولووو (Awolowo) سب سے ممتاز ہیں۔

ازکوی نسلاً ایبو ہیں اور مشرقی نائیجیر کے ایبو باشندوں میں ان کا سب سے زیادہ اثر تھا۔

ایولووو نسلاً یوروبا ہیں اور وہ مغربی علاقے کے سب سے مقبول راہنما تھے۔ احمد وبلو اور ابوبکر تفادا بلیوا شمالی نائیجیریا کے ترجمان تھے۔ ابوبکر تفادا بلیوا اگرچہ وفاق نائیجیریا کے وزیراعظم تھے، لیکن نائیجیریا کی سب سے بڑی اور بااثر شخصیت احمد وبلو (۱۹۰۹ء تا ۱۹۶۶ء) کی تھی وہ کاٹسینا کالج کے طالب علم تھے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سوکوٹو میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۹ء

میں شمالی علاقے کی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ شمالی عوام کی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے جو نائیجیریا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ ان کو شمالی نائیجیریا کی ترقی سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وفاق نائیجیریا کی تشکیل کے بعد انہوں نے پورے نائیجیریا کی وزارت عظمیٰ پر شمالی نائیجیریا کی وزارت عظمیٰ کو ترجیح دی، اور وزیر اعظم کا نیا عہدہ اپنے نائب وزیر اعظم ابوبکر تفادا بلیوا کے سپرد کر دیا۔ شمالی نائیجیریا کے وزیر اعظم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے علاقے کو ہر حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان کی کوششوں سے شمالی علاقے کا صدر مقام کڈونا ایک جدید طرز کا خوبصورت شہر بن گیا۔ احمد دبلو کو انگریزی زبان پر پورا عبور تھا اور وہ مائی لائیف (My Life) کے نام سے ایک خود نوشت سوانح عمری کے مصنف تھے، یہ کتاب کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی تھی اور شمال کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا ایک مستند ماخذ ہے۔ احمد دبلو ایک دیندار مسلمان تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں کئی حج کیے وہ چونکہ عثمان دان فودیو کی اولاد میں سے تھے۔ اس لیے ان کو نائیجیریا کے علاوہ مغربی افریقہ کے بڑے حصے میں مذہبی لحاظ سے بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو نائیجیریا میں اسلام کی توسیع واشاعت سے گہری دلچسپی تھی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کی کوششوں سے نائیجیریا کے ہزارہا لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے۔ احمد دبلو اتحاد اسلامی کے زبردست علمبردار تھے۔ وہ ایک مرتبہ پاکستان بھی آئے تھے۔ اس موقع پر شالامار باغ لاہور میں ان کو شاندار ضیافت دی گئی تھی۔ اور کراچی میں انہوں نے نائیجیریا کے مسائل پر پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز میں تقریر بھی کی تھی۔

احمد دبلو کے بعد شمال کی سب سے بڑی شخصیت بلاشک وشبہ ابوبکر تفادا بلیوا (۱۹۱۲ء تا ۱۹۶۶ء) کی تھی۔ ان کا تعلق شمالی صوبے باچی کے ایک چھوٹے سے قبیلے سے تھا جو جیرے (jere) کہلاتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن سے معلمی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ شمالی ایوان نمائندگان کے رکن بنے۔ ۱۹۵۲ء میں شمال میں وزیر تعمیرات ہوئے۔ اس کے بعد ان کے پاس کوئی نہ کوئی قلمدان وزارت برابر رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں وفاق نائیجیریا کے وزیر اعظم منتخب ہوئے، اور آخر وقت تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ابوبکر تفادا بلیوا انگریزی کے بہترین مقرر تھے۔ اور ان کو شمال کی تقریری آواز کہا جاتا تھا۔

ابوبکر تفادا بلیوا شمالی عوام کی کانگریس کے نائب صدر بھی تھے۔ ان کو اپنی شہرت اور نام ونمود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ان کی ذہانت، قوت فیصلہ اور انتھک محنت نے ان کو سارے ملک میں مقبول بنا دیا تھا۔ تفادا بلیوا ان کے گاؤں کا نام ہے جو باچی میں دریائے گونگولا کے کنارے آباد ہے۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں وفاق نائیجیریا کے ایوان نمائندگان میں تحریک آزادی کی قرارداد ابوبکر تفادا بلیوا ہی نے پیش کی تھی۔ (۱)

سیاسی جماعتیں

۱۹۶۶ء کے فوجی انقلاب سے پہلے نائیجیریا میں کئی سیاسی جماعتیں موجود تھیں لیکن ان میں تین جماعتیں سب سے بااثر تھیں۔ ان میں سب سے بڑی شمالی عوام کی کانگریس (N.P.C) تھی۔ یہ جماعت ۱۹۴۹ء میں کانو میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانیوں میں ابوبکر تفادا بلیوا بھی تھے۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی تنظیم جدید ہوئی۔ یہ جماعت شمال کے باشندوں کی ترجمان تھی جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔ لیکن چونکہ شمالی علاقے میں مسلمانوں کی تعداد ستر فیصد تھی اس لیے عملاً یہ جماعت مسلمانوں کی ترجمان بن گئی۔ ۱۹۵۸ء میں اس کی قومی مجلس عاملہ کے ۷۴ ممبروں میں ۶۴ مسلمان اور نو عیسائی تھے۔ اس جماعت کا ہاوسا نام (jamiyyar mutanen areva) تھا اور اس کا نعرہ تھا۔

---

(۱) شمالی نائیجیریا کے مسلمانوں میں احمد وبلو اور ابوبکر تفادا بلیوا کے علاوہ کئی اور راہنما بھی اہمیت کے حامل ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ الحاجی محمد ربادو (۱۹۰۹ء) میں آوابادا کے ضلع ریادو میں پیدا ہوئے۔ وہ فولانی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں شمالی اسمبلی کے رکن ہوئے اور ۱۹۵۱ء میں وفاقی ایوان کے وزیر ہوئے۔ آخر میں وزیر دفاع تھے۔ ۱۹۵۴ء کے بعد سے شمالی کانگریس کے نائب صدر رہے۔ محمد ربادو شمال کے مرد آہن سمجھے جاتے تھے۔ اور احمد وبلو اور بلیوا کو شامل کر کے ہم ان کو شمال کے تین بڑوں میں شمار کر سکتے ہیں ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

۲۔ الحاجی وزیری ابراہیم (۱۹۲۶ء تا ۱۹۵۷ء) صوبہ بورنو سے تعلق تھا نسلاً عرب تھے، نائیجیر کے وزیر ترقیات تھے، نائیجیریا کے ۶ سالہ منصوبے کی تیاری کا سہرا ان ہی کے سر تھا۔

۳۔ بوکر سولوما دیب چریما (Bukar Sulama Dipcharima) صوبہ بورنو سے تعلق کنوری نسل سے ہیں نہایت قابل اور جدید نظریات کے حامی ہیں۔ صوبہ بورنو میں ان کا بہت اثر ہے۔

۴۔ ابا محمد حبیب ۱۹۱۴ء میں صوبہ سردونا کے شہر کوا میں پیدا ہوئے۔ شمال میں وزیر تجارت وصنعت تھے۔ شمالی عوام کی کانگریس میں جنرل سیکرٹری کے اہم عہدے پر فائز تھے۔ صوبہ سردرنا کی سب سے بااثر شخصیت ہیں۔

''ایک شمال، ایک قوم بلا لحاظ مذہب قبیلہ اور مرتبہ''

۱۹۵۹ء کے انتخابات میں وفاقی اسمبلی کے تین سو بارہ ارکان میں سے ۱۴۲ ممبر شمالی عوام کی کانگریس کے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں بھی شمالی عوام کی کانگریس کی یہ برتری قائم رہی۔

کانگریس شمال کو متحد رکھنا چاہتی تھی۔ امیروں کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ان کو عوام کی منتخب کردہ مجالس کا پابند بنانا چاہتی تھی۔

نائیجیریا کی دوسری بڑی سیاسی جماعت نائیجیریا کی قومی کونسل (N.N.C) تھی جو جنوبی کیمرون کی ۱۹۶۱ء میں علیحدگی سے پہلے (N.N.C) کہلاتی تھی، یہ جماعت مضبوط وفاقی حکومت کی حامی تھی۔ اس کے بانی ازیکوی نامدی تھے، جو ڈاکٹر زک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ڈاکٹر زک تیرہ کتابوں کے مصنف ہیں، اور نائیجیریا میں صحافت اور قوم پرستی کے باوا آدم ہیں۔ مجلس قانون ساز میں اس جماعت کے ۸۹ نمائندے تھے۔ یہ جماعت اگرچہ کل نائیجیریا کی بنیاد پر کام کر رہی تھی لیکن اس کا اثر مشرقی نائیجیریا تک محدود تھا۔ ۱۹۵۸ء میں (N.C.N.C) کی قومی مجلس عاملہ کے ۷۱ ممبروں میں ۵۵ عیسائی تھے، اور صرف چھ مسلمان تھے۔ اس جماعت نے شروع میں شمالی عوام کی کانگریس کے ساتھ مل کر حکومت چلائی لیکن ۱۹۶۵ء کے انتخابات کے بعد اس سے شمالی عوام کی کانگریس نے علیحدگی حاصل کر لی۔

نائیجیریا کی تیسری بڑی جماعت ایکشن گروپ تھی، جس کی بنیاد یوروبا راہنما او بافیمی ایوولووو نے جو عرف عام میں ایوو (AWO) کہلاتے ہیں، ۱۹۵۱ء میں ڈالی تھی۔ یہ جماعت ایسی فیڈریشن یا وفاق کی حامی تھی جس میں علاقوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل ہوں اور مرکز کو کم سے کم۔ ایوو کا کہنا ہے کہ مشرقی نائیجیریا اور مغربی نائیجیریا ایک دوسرے سے اسی قدر مختلف ہیں جس قدر آئرلینڈ جرمنی سے مختلف ہے اور شمالی نائیجیریا دونوں سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا چین۔ ایوو ۱۹۶۲ء تک مغربی نائیجیریا کے وزیر اعظم تھے لیکن اسی سال کے وسط میں وفاقی حکومت نے ان کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اور ان کی جگہ ایکشن گروپ کے نائب صدر آکن تولا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۱۹۵۸ء میں مرکزی مجلس قانون ساز میں ایکشن گروپ کے ۷۱ نمائندے تھے۔ ایکشن گروپ صرف یوروبا باشندوں کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی قیادت زیادہ تر مسیحی راہ

نماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے رہنماؤں میں ایوواور آ کن تولا (Akntola) دونوں مسیحی ہیں۔
نائیجیریا کے مسلمان رہنماؤں کا خیال ہے کہ ایکشن گروپ مسیحی باشندوں کی بالادستی قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ایکشن گروپ میں مسیحی اثرات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مغربی علاقے میں مسلمانوں کا تناسب تیس فیصد تھا، لیکن جن اکسٹھ افراد نے یہ جماعت قائم کی ان میں مسلمان صرف دو تھے۔ اسی طرح ۱۹۵۸ء میں ایکشن گروپ کی وفاقی مجلس انتظامیہ میں مغربی علاقے کے ۳۴ ممبروں میں سے صرف تین مسلمان تھے۔ اور مغرب کے بارہ وزیروں میں صرف دو مسلمان تھے۔

یوروبا مسلمان

مغربی علاقے کے یوروبا مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے اگرچہ ملک کی سیاست میں وہ نمایاں حصہ نہیں لے سکے جس کے وہ آبادی کے لحاظ سے مستحق تھے لیکن اس کا احساس ان میں موجود تھا اور مختلف اوقات میں ان کی شکایات زبان پر آجاتی تھیں۔ یوروبا مسلمانوں کو عام طور پر مغربی علاقے میں ایکشن گروپ کی حکومت سے حسب ذیل شکایتیں تھیں۔

۱۔ مسلمانوں کے مدرسوں سے غفلت برتی جاتی ہے۔
۲۔ تعلیمی اور دیگر مسلم اداروں کے لیے رقم مخصوص کرنے میں امتیاز برتا جاتا ہے۔
۳۔ مدرسوں کے نصاب میں عربی نظام کی تعلیم شامل نہیں۔
۴۔ مسلمان طلبہ کو وظیفے کم دیے جاتے ہیں۔
۵۔ مسیحی مدرسوں میں تعلیم کے ذریعہ مسلمان بچوں کو عیسائی بنالیا جاتا ہے۔
۶۔ اسمبلیوں اور حکومت میں مسلمانوں کو کم نمائندگی دی جاتی ہے۔

یوروبا مسلمانوں نے اپنی شکایات کے ازالہ کے لیے جولائی ۱۹۵۷ء میں ایک علیحدہ سیاسی جماعت نیشنل مسلم لیگ قائم کی۔ لیکن یوروبا راہ نما ایوولووو نے سیاست میں مذہب کو لانے کی اس کوشش کی سختی سے مخالفت کی اور اس کو یوروبا قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش قرار دی۔ نسلی بنیاد پر اس مخالفت کی وجہ سے نیشنل مسلم لیگ کامیاب نہ ہوسکی، لیکن مسلمانوں کی اس کوشش نے ایکشن گروپ کو اس پر مجبور کردیا کہ مسلمانوں کو اپنی جماعت میں زیادہ نمائندگی دی

جائے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فوجی انقلاب سے پہلے ایکشن گروپ میں دولت مند اور تعلیم یافتہ مسلمان زیادہ تعداد میں شامل ہونے لگے تھے۔

مغربی علاقے کے یوروبا مسلمانوں میں دو مسلمان راہنماؤں کے نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے ایکشن گروپ سے ہٹ کر سیاست میں اس طرح حصہ لیا کہ مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ ان میں ایک آدیگوکے آدے لابو (Adegoke Adelabu) ۱۹۱۵ء تا ۱۹۵۸ء تھے۔ وہ ایبادان کے مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک بڑے تاجر اور صحافی تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مابولاجے (Mabolaje) کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی تھی۔ اس جماعت نے مشرقی علاقے کی جماعت (N.C.N.C) کے تعاون سے مغربی علاقے میں وفاقی اسمبلی کی بیشتر نشستیں جیت لی تھیں لیکن علاقائی اسمبلی کے انتخاب میں اس کو ناکامی ہوئی۔ اگر یہ ناکامی نہ ہوتی تو آدے لابو مغربی علاقے کے وزیر اعظم ہو جاتے۔ آدے لابو نے ۱۹۵۷ء میں حج کیا لیکن مارچ ۱۹۵۸ء میں کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

مغربی علاقے میں آدے لابو کے کام کو ایک دوسرے مسلمان راہ نما آدیو آدیسا (Adeoe Adisa) نے آگے بڑھایا۔ آدیو آدیسا ۱۹۲۰ء میں ایباوان میں پیدا ہوئے۔ لندن سے وکالت کی سند حاصل کی پھر مغربی اسمبلی کے رکن ہوئے۔ اور وہاں حزب مخالف مابولاجی کے راہ نما بنے۔ وہ شمال سے تعاون کے زبردست حامی ہیں اور ان کی وجہ سے یوروبا مسلمانوں اور شمال کے مسلمانوں کے درمیان تعاون کو فروغ ہوا۔ انقلاب سے قبل ایبادان کے صوبے میں ان کا زبردست اثر تھا۔ مغرب کے (N.C.N.C) مابولاجے اتحاد کے ۳۸ ممبروں میں ۲۸ مسلمان تھے۔

ایکشن گروپ کے حامی مسلمانوں میں الحاد آوگ برنو (Adegberno) سب سے ممتاز تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں آبیوکوتا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں مغربی ایوان کے رکن اور وفاقی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مغربی علاقے میں پارلیمنٹری سیکرٹری پھر وزیر ہو گئے اور ۱۹۶۲ء میں کچھ مدت کے لیے وزیر اعظم بھی ہو گئے تھے۔

فوجی انقلاب

ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ نائیجیریا میں سیاست کی بنیاد علاقائیت اور قبائلیت

پر ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہاں کی وہ سیاسی پارٹیاں جو ملک گیر ہونے کی دعوے دار تھیں وہ بھی عملاً صرف اپنے اپنے علاقے کی ترجمان تھیں۔ شمال میں ہاوسا اور فولانی قبائل کے اثرات گہرے تھے اور یہ قبائل مسلمان تھے۔ جنوب میں یوروبا اور ایبو قبائل کے اثرات گہرے تھے اور اگرچہ یوروبا باشندوں کی نصف تعداد مسلمان تھی لیکن ایبو کی طرح یوروبا قیادت عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جنوب کے یہ عیسائی باشندے تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں سے بہت آگے تھے اور اپنی اس برتری کی وجہ سے پورے ملک کی سیاست اور معیشت پر چھا گئے تھے۔ لیکن وفاقی حکومت قائم ہونے کے بعد ان کے اثرات میں کمی آنے لگی۔ وفاقی اسمبلی میں شمالی علاقے کو ۵۵ فیصد نمائندگی حاصل تھی اور اس کی وجہ سے شمالی عوام کی کانگریس جس کو شمال میں مقبولیت حاصل تھی، شروع ہی سے حکمران جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس حکومت نے جب شمال کے مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ کیا تو جنوب کے مسیحی باشندوں کی سابقہ اجارہ داری خطرے میں پڑ گئی اور جب ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں شمالی عوام کی کانگریس کامیاب ہوگئی تو جنوب کے ایبو باشندوں میں یہ خیال عام ہوگیا کہ اب شمال کے غلبے سے ان کو نجات نہیں مل سکتی۔ ایبو باشندوں کو چونکہ فوج اور سرکاری ملازمتوں میں غلبہ حاصل تھا، اس لیے ان کے ایک فوجی رہنما جنرل آئرونسی (Ironsi) نے جنوری ۱۹۶۶ء میں ایک نہایت بھیانک سازش کے ذریعہ آئینی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مسلمانوں کے ہردلعزیز راہ نما احمد وبلو اور ابوبکر تفاوا بلیوا کو قتل کر دیا گیا اور وفاقی ڈھانچے کو ختم کر کے مرکزی حکومت قائم کر دی گئی۔ اپنے ہردلعزیز راہ نماؤں کے قتل سے شمال کے مسلمانوں کو تکلیف تو پہنچی ہی تھی لیکن وفاقی ڈھانچے کے ختم کرنے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ایبو قبائل پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد شمال میں وسیع پیمانے پر ایبو باشندوں کے خلاف فسادات شروع ہوگئے اور پھر جولائی ۱۹۶۶ء میں فوج کے ہاوسا سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ جنرل آئرونسی قتل کر دیا گیا اور ایک ہاوسا جنرل یعقوبو گوون کی قیادت میں نئی حکومت قائم کر دی گئی۔ جس میں وہ لوگ شامل کر دیے گئے جن کا شمال اور مشرق کی حکمران پارٹی سے تعلق نہیں تھا۔

بارہ ریاستیں

نائیجیریا جب ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا تھا تو انتظامی لحاظ سے تین خودمختار حصوں میں تقسیم تھا جو علاقے کہلاتے تھے، اور جن کی حیثیت جداگانہ ریاستوں کی تھی ان میں سے ہر علاقہ متعدد صوبوں میں تقسیم تھا۔ شمالی علاقے میں بارہ صوبے تھے، مغربی علاقے میں آٹھ اور مشرقی علاقے میں پانچ صوبے تھے۔ یہ صوبے[1] بالعموم قبائلی بنیاد پر قائم کیے گئے تھے۔ آزادی کے بعد ملک میں مزید خودمختار علاقے قائم کرنے کے مطالبے شروع ہو گئے۔ شمالی علاقے میں بعض قبائل ''وسطی پٹی'' کے نام سے اور مغربی علاقے میں وسط مغرب کے نام سے علیحدہ علاقے بنانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ شمال میں تو کوئی نیا علاقہ قائم نہ ہو سکا لیکن مغربی علاقے سے بنین (benin) اور ڈیلٹا کے صوبوں پر مشتمل وسط مغرب کا ایک نیا علاقہ قائم کر دیا گیا۔ دوسرے فوجی انقلاب کے بعد جنرل گودان کی حکومت نے اس سمت ایک اور قدم بڑھایا۔ اور مئی ۱۹۶۷ء میں پورے ملک کو بارہ خودمختار علاقوں یا ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ ان ریاستوں میں چھ شمال میں قائم کی گئیں اور تین مشرق میں۔ اس تقسیم کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح کوئی ایک علاقہ اپنی آبادی کی کثرت پر دوسرے علاقے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا اور تمام قبائل کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ ملنے کی وجہ سے بداعتمادی ختم ہو جائے گی۔ ملک کی یہ نئی تقسیم اگرچہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ تھی کیونکہ اس طرح ان کا شمالی علاقہ چھ ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس تقسیم سے شمال کی ہی برتری پر ضرب لگائی گئی ہے لیکن ابیو باشندوں نے اس تقسیم کو محض اس لیے قبول نہیں کیا کہ خود ان کا علاقہ تین ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان میں ایک ریاست وسطی مشرقی اس صوبہ پر مشتمل تھی جس میں خالص ابیو آبادی تھی اور باقی دو ریاستیں جنوب مشرقی اور ریورزان صوبوں پر مشتمل تھیں جن میں غیر ابیو قبائل کی اکثریت تھی۔ ابیو فوجی راہ نماؤں نے جو اب بھی مشرقی علاقے پر قابض تھے، جب یہ دیکھا کہ ان کا اقتدار مرکزی حکومت پر بھی ختم ہو گیا اور مشرقی علاقے میں بھی قائم نہیں رہا، تو انہوں نے ۳۰۔ مئی ۱۹۶۷ء کو مشرقی نائیجیریا کو

---

(۱) نائیجیریا کی دیسی ریاستیں یعنی (native authorities) صوبوں کا ایک حصہ ہیں مثال کے طور پر صوبہ کانو کو لیجیے اس صوبے میں دیسی ریاست کانو کے علاوہ وہ حصے بھی شامل ہیں جو امیر کانو کی ریاست کے حدود سے باہر ہیں۔

نائیجیریا سے علیٰحدہ کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنی نئی مملکت کا نام بیافرا رکھا۔ نائیجیریا کی وفاقی حکومت نے ملک کا اتحاد قائم رکھنے کے لیے جولائی ۱۹۶۷ء سے بیافرا کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دی۔ اب جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ نائیجیریا اور بیافرا کی اس کشمکش میں جلد ہی بین الاقوامی طاقتیں بھی ملوث ہو گئیں۔ وفاقی فوجوں کے مظالم کی فرضی داستانیں گھڑی گئیں۔ مشہور کیا گیا کہ نائیجیریا کی اس کارروائی کا مقصد مشرقی علاقے سے عیسائیوں کو ختم کرنا ہے۔ تنزانیہ گابون آئیوری کوسٹ اور زیمبیا کی حکومتوں نے بیافرا کو تسلیم کر لیا اور فرانس اور پرتگال نے بیافرا کو اسلحہ فراہم کرنے کی کوشش بھی کی۔ چین نے بھی بیافرا کی مدد کی۔ نائیجیریا کو بھی بعض ملکوں سے اسلحہ ملا، خصوصاً روس نے بڑی تعداد میں طیارے فراہم کیے۔ دولت مشترکہ کا ملک ہونے کی وجہ سے برطانیہ کو بھی نائیجیریا کی مدد کرنی پڑی۔ آخر کار ڈھائی سال کی لڑائی کے بعد ۱۲۔ جنوری ۱۹۷۰ء کو بیافرا نے ہتھیار ڈال دیے اور ایبو رہنما کرنل اوجوکود (Qiukwu) فرار ہو گیا۔ اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشہور ایبو رہنما اور سابق گورنر جنرل ڈاکٹر ازیکوی نے جنگ کے آخری حصے میں وفاقی حکومت کے موقف کی تائید کی اور یوروبا رہنما ایولووو نے بھی فوجی حکومت سے پورا پورا تعاون کیا۔

شہری حکومت کی بحالی

یعقوبو گودن (۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۵ء) کے دورِ صدارت میں نائیجیریا کو بارہ ریاستوں میں تقسیم کرنے، وفاقی نظام کی بحالی اور بیافرا کی بغاوت فرو کرنے کے علاوہ اور بھی کئی اہم اقدامات کیے گئے۔ مثلاً ۱۹۷۳ء کی مصر، اسرائیل جنگ کے بعد افریقہ کے کئی دوسرے ملکوں کی طرح نائیجیریا نے بھی اسرائیل سے تعلقات ختم کر دیے۔ یعقوبو گوون نے ۱۹۷۶ء میں شہری حکومت بحال کرنے کا بھی اعلان کیا لیکن ۱۹۷۴ء میں وہ اس اعلان سے منحرف ہو گئے جس پر طلبہ نے مظاہرے شروع کر دیے۔ گرانی میں اضافے اور بدعنوانیوں پر قابو نہ پانے کی وجہ سے یعقوبو گوون کی حکومت کے خلاف بے چینی بڑھتی گئی یہاں تک کہ جب یعقوبو گوون افریقی اتحاد کی تنظیم کی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے یوگنڈا گئے ہوئے تھے ۲۹ جولائی ۱۹۷۵ء کو بریگیڈیر مُرتلا رفاعی محمد نے بغیر کسی خونریزی کے یعقوبو گوون کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ فوجی

حکومت نے سرکاری ملازمین کی وسیع پیمانے پر تطہیر کی۔ ریڈیو، ٹی وی اور بڑے بڑے اخبارات قبضہ میں لیے گئے۔ فوج کی تعداد بھی کم دی اور ۱۹۷۹ء تک شہری حکومت بحال کرنے کا وعدہ کیا۔ ۳۔ فروری ۱۹۷۶ء کو جنرل مُرتلا رفاعی محمد نے نئے دارالحکومت اور بارہ کی بجائے انیس ریاستوں کے قیام کا اعلان کیا۔ مارچ میں نئی ریاستوں کی حد بندی ہوگئی۔ نیا دارالحکومت صوبہ نائیجیر میں ابوجا کے مقام پر قائم کیا جائے گا جو ملک کے وسط میں ہے۔ اس کے لیے تین ہزار ایک سو پچیس مربع میل پر مشتمل وفاقی علاقہ کی حد بندی کر دی گئی ہے۔

جنرل رفاعی ۱۳۔ فروری ۱۹۷۶ء کو ایک ناکام بغاوت میں مارے گئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل اول سیگن اوباسنجو (Olsegun obasanjo) سربراہ ہو گئے۔ ان کے زمانے میں دسمبر ۱۹۷۶ء میں لوکل کونسلوں کا انتخاب ہوا۔ ان لوکل کونسلوں نے ۳۱۔ اگست ۱۹۷۷ء کو دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کیا جو دو سو تین منتخب ممبروں اور فوجی حکومت کے نامزد کردہ بیس فوجیوں پر مشتمل تھی۔ ۶۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ فوجی حکومت نے جو دستوری مسودہ پیش کیا وہ سیکولر نوعیت کا تھا، اس لیے اس پر مسلمانوں نے سخت اعتراضات کیے اور مطالبہ کیا کہ اسلام کو آئین میں نائیجیریا کے مسلمانوں کی تعداد اور حقوق کے مطابق جگہ دی جائے۔ نیا آئین تیار ہو جانے کے بعد فوجی حکومت نے شہری حکومت کی بحالی کی طرف پہلے قدم کے طور پر ۲۴۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو صوبوں سے فوجی گورنر ہٹا لیے اور ۲۱۔ ستمبر کو سیاسی پارٹیوں پر سے پابندی اٹھالی۔ ۱۴۔ جولائی ۱۹۷۹ء کو جب عام انتخابات ہوئے تو شمال کے مسلمان رہنما شیجو شغاری کی قومی پارٹی نے ۴۴۹ ممبروں کے ایوان میں ۱۶۸ نشستیں حاصل کیں، جب کہ یوروبا رہنما اوبافیمی کی اتحاد پارٹی نے ایک سو گیارہ، نائیجیریا عوامی پارٹی نے ۷۹ نشستیں اور عظیم نائیجیریا پارٹی نے ۴۳ نشستیں حاصل کیں۔ انیس ریاستوں میں سے سات کے گورنر بھی قومی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۱۔ اگست کو صدر کا انتخاب ہوا جس میں شیجو شغاری نے اپنے مدمقابل اوبافیمی کو ۴۹ لاکھ کے مقابلے میں ۵۷ لاکھ ووٹوں سے شکست دی۔ آئین کے تحت صدر منتخب ہونے کے لیے دو تہائی ریاستوں میں کم سے کم ایک چوتھائی ووٹ حاصل کرنا ضروری تھا۔ شیجو شغاری نے یہ شرط بھی پوری کر دی اس لیے وہ نائیجیریا کے صدر منتخب ہو گئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء کو شیجو شغاری نے صدارت کا حلف اٹھایا اور اس طرح تیرہ سال بعد نائیجیریا میں شہری حکومت بحال ہوگئی۔

نائیجیریا کا نیا آئین صدارتی ہے اور اس کے تحت ایوان نمائندگان کے علاوہ ۹۵ ممبروں پر مشتمل ایک سینٹ بھی قائم کی گئی ہے۔

نائیجیریا میں اسلام

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نائیجیریا میں اسلام کے مستقبل پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ نائیجیریا میں چھوٹے بڑے قبیلوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے اور ان میں ہر ایک کی بولی دوسرے سے مختلف ہے۔ ان قبیلوں میں پانچ قبیلے سب سے بڑے ہیں اور ان کی مجموعی تعداد پورے ملک کی دو تہائی کے برابر ہے۔ تعداد کے لحاظ سے ہادسا اور ایبو سب سے بڑے قبیلے ہیں اور پوری آبادی میں ان کا تناسب بالترتیب اٹھارہ فی صد اور سولہ فیصد ہے۔ اس کے بعد یوروبا قبیلہ ہے جس کا تناسب پوری آبادی میں چودہ فیصد ہے۔ چوتھے بڑے قبیلے فولانی کا تناسب دس فیصد اور کنوری قبیلہ کا چار فیصد ہے۔

ان قبیلوں میں ہادسا، فولانی اور کنوری مسلمان ہیں اور یہ سب شمالی نائیجیریا میں آباد ہیں۔ یوروبا مغربی ریاست میں آباد ہیں اور ان کی نصف تعداد مسلمان ہے۔ اور نصف عیسائیوں اور مظاہر پرستوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کی قیادت زیادہ تر مسیحی راہ نماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ ایبو باشندے زیادہ تر مسیحی ہیں۔ ان پانچ بڑے قبیلوں کے علاوہ جو چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں وہ شمال میں زیادہ تر مسیحی ہیں۔ ان پانچ بڑے قبیلوں کے علاوہ جو چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں وہ شمال میں زیادہ تر مسلمان ہیں اور جنوب میں عیسائی۔ شمال کے مسلمان قبیلوں میں نوپے قبیلہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ ان میں دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں جدید تعلیم کا زیادہ چرچا رہا ہے۔

نائیجیریا میں مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے اور پاکستان میں ایسے اعداد و شمار ملتے ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد ۷۵ فیصدی تک بتائی جاتی ہے، حالانکہ یہ قطعی غلط ہے۔ نائیجیریا ان ملکوں میں سے ہے جن میں باقاعدہ مردم شماری ہوتی ہے اور یہ مردم شماری مذہب کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی مردم شماری کے مطابق نائیجیریا کی تین کروڑ گیارہ لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ ۳۸ لاکھ تھی یعنی کل آبادی کا ۴۴ فیصد۔ ۱۹۶۳ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۲، کروڑ ۶۲ لاکھ ہے یعنی کل آبادی کا ۴۸

فیصد جب کہ عیسائیوں کا تناسب ۳۴ فیصد ہے، اور باقی مظاہر پرست ہیں۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نائیجیریا میں اگرچہ مسلمان سب سے بڑی واحد ملت ہیں لیکن پورے ملک میں ان کی اکثریت نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہم نائیجیریا کو فی الحال ایک مسلم ملک نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اگلی مردم شماری تک مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ ہو جائے کیونکہ مظاہرہ پرست باشندے اسلام یا مسیحیت میں سے کوئی ایک مذہب تیزی سے قبول کرتے جا رہے ہیں۔

نائیجیریا میں مسلم آبادی کا سب سے بڑا علاقہ وہ ہے جسے ۱۹۶۷ء سے پہلے شمالی علاقہ کہا جاتا تھا۔ یہاں ۱۹۵۳ء میں مسلمانوں کا تناسب ستر فیصد تھا۔ لیکن شمال کے پورے علاقے میں مسلمان ہر جگہ اکثریت میں نہیں ہیں۔ شمال کے تیرہ صوبوں میں سے ین صوبوں، بینو، جوس، پلیٹو اور کبا میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اب بینو اور جوس کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا گیا ہے اور کبا کو صوبہ الورین میں جہاں مسلمانوں کا تناسب ۷۶ فیصد ہے، ملا دیا گیا ہے۔ اس وقت نائیجیریا کی بارہ نئی قائم شدہ ریاستوں میں سے پانچ میں مسلم اکثریت ہے اور چھٹی یعنی مغربی ریاست میں مسلمان سب سے بڑی واحد ملت ہیں۔ یہ مغربی ریاست جو یوروبا آبادی پر مشتمل ہے، شمال کے بعد مسلمانوں کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے یوروبا باشندوں کی نصف تعداد مسلمان ہے اور باقی نصف عیسائی اور مظاہر پرستوں پر مشتمل ہے۔ مغربی ریاست چھ صوبوں میں تقسیم ہے۔ ان میں سے صرف ایک صوبے اوندو میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ باقی پانچ صوبوں میں مسلمان نصف یا نصف سے زیادہ ہیں۔

مغربی ریاست کے تمام بڑے شہروں میں مسلمان واضح اکثریت میں ہیں۔ ایبادان میں جو نائیجیریا کا سب سے بڑا شہر ہے، مسلمانوں کا تناسب ۶۰ فیصد ہے اور شہر اور اس کے گرد و نواح میں مسجدوں کی تعداد چھ سو ہے۔ دارالحکومت لاگوس میں ۱۹۵۳ء میں مسلمان کل آبادی کا ۴۲ فیصد تھے لیکن یوروبا باشندوں میں ان کا تناسب ۵۵ فی صد تھا۔

مغربی ریاست کو چھوڑ کر جنوب کی باقی چار ریاستوں میں جن میں ایک وسط مغرب (mid-west) کہلاتی ہے اور تین وہ ہیں جو سابق مشرقی علاقے پر مشتمل تھیں۔ مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ وسط مغرب میں تو پھر بھی ۱۹۵۳ء میں تقریباً اسی ہزار مسلمان تھے یعنی کل

آبادی کا پانچ فیصد لیکن سابق مشرقی علاقے میں تو سوا کروڑ کی آبادی میں پچاس ہزار مسلمان بھی نہیں ہیں۔

نائیجیریا میں عیسائیوں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں عیسائیوں کا تناسب پورے ملک میں صرف اکیس فی صد تھا، اور اب یہ تناسب ۳۴ [۱] فی صد سے زیادہ ہوگیا ہے، گویا دس سال کی مدت میں عیسائیوں کا تناسب تیرہ فیصد بڑھ گیا، جب کہ اسی مدت میں مسلمانوں کا تناسب صرف چار فیصد بڑھا ہے یعنی ۴۴ فیصد سے ۴۸ فیصد۔

نائیجیریا میں عیسائیوں کی تبلیغی جدوجہد پورے عروج پر ہے اور اس کام میں ان کو یورپ اور امریکہ کے ملکوں سے مدد مل رہی ہے۔ خود نائیجیریا کے اندر عیسائیوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی برتری جنوب کے مظاہر پرستوں کے لیے عیسائیت کو قبول کرلینے میں معاون ہے۔ اس لیے اگر مسلمانوں نے تبلیغ اسلام کی انتھک کوشش نہیں کی تو وہ نائیجیریا میں کبھی بھی موثر اکثریت حاصل نہ کرسکیں گے۔ اور نائیجیریا افریقہ کا لبنان بن جائے گا اور لبنان کی طرح وہاں بھی مستحکم حکومت قائم نہ ہوسکے گی۔ اور نائیجیریا افریقہ کا لبنان بن جائے گا اور لبنان کی طرح وہاں بھی مستحکم حکومت قائم نہ ہوسکے گی۔ افریقہ کے سب سے بڑے ملک کے لیے ایسی غیر مستحکم پوزیشن اسلامی دنیا کے لیے ہرگز مفید ثابت نہ ہوگی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بیافرا کی شکست مسلمانوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اگر بیافرا علیحدہ ہوجاتا تو باقی نائیجیریا میں مسلمانوں کا تناسب ۶۰ فیصد سے زیادہ ہوتا اور مسلمان افریقہ کی اس عظیم مملکت کو زیادہ آسانی سے اسلامی رنگ دے سکتے تھے۔

وفاق نائیجیریا میں مسلمانوں کی اس کمزور حیثیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ نائیجیریا کو مسلمان آبادی کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کو تسلیم کرنا پڑا۔ جون ۱۹۵۹ء میں جب نائیجیریا کے ایبو وزیر خزانہ نے اسرائیل سے مالی امداد حاصل کرنے کے ایک معاہدے پر دستخط کیے تو شمال کے مسلمانوں نے اس کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ شمالی عوام کی کانگریس نے اس معاہدے کو نائیجیریا کی بدقسمتی قرار دیا اور وفاقی حکومت پر زور دیا کہ وہ اس معاہدے کو منسوخ کردے کیونکہ نائیجیریا کی

---

(۱) برٹانیکا ایر بک ۱۹۶۱ء میں یہ تناسب ۲۳ فیصدی ہے۔

آبادی کا ایک حصہ اسرائیل سے ہر قسم کے تعلقات کے خلاف ہے۔

نائیجیریا کی ایک بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں بھی افریقہ کے دوسرے نیگرو ملکوں کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں کے مسلمانوں میں اسلام کا سیاسی شعور نہیں پایا جاتا۔ یہ شعور شمال کے مسلمانوں میں کسی قدر موجود ہے کیونکہ ان کا اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات سے گہرا تعلق رہا ہے۔ لیکن جنوب کے یوروبا باشندوں میں جو اسلامی تعلیمات کی نسبت مغربی اندازِ فکر سے بہت زیادہ متاثر ہیں یہ شعور بہت کم ہے۔ علاوہ ازیں نائیجیریا میں مظاہر پرست ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں، لیکن ان کا اس طرح اسلام قبول کرنا کسی شعوری تحریک کے تحت نہیں ہے بلکہ رواجی نوعیت کا ہے۔ جب کسی قبیلہ کا سردار مسلمان ہو جاتا ہے تو عام طور پر اس کا قبیلہ بھی اس کی تقلید میں مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ نو مسلم دینی تربیت کے نظام کے فقدان کی وجہ سے اپنے قدیم رسم و رواج پر بھی قائم رہتے ہیں اور جدید مغربی تعلیم کے اثرات بھی قبول کر لیتے ہیں۔ بہر حال اب اسلامی دنیا سے پہنچنے والے اثرات کے نتیجے میں نائیجیریا میں ایسی آوازیں بھی بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اجتماعی فکر مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں کانو کے بائرو کالج میں ایک افریقی بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور سیکولر اور مذہبی تعلیم کی تقسیم غلط ہے۔ مغربی تعلیم اچھے اور ذمہ دار افراد پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے اور معاشرے کے اخلاقی زوال کا باعث بنی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی تعلیم حق و باطل اور اچھے اور برے میں تمیز سکھاتی ہے۔

نائیجیریا میں سیکولرازم کے توسط سے سوشلزم کے اثرات بھی پھیل رہے ہیں۔ ۱۲۔ فروری ۱۹۷۷ء کو دارالحکومت لاگوس میں ۲۹ دن تک افریقی جشن منایا گیا جس کا افتتاح جنرل اوباسنجو نے کیا تھا۔ اس جشن کے دوران مشرکانہ رسوم ادا کی گئیں اور آخر میں سیاہ فام باشندوں کے اتحاد کی بلا لحاظ تاریخی روایات اور نظریاتی اختلاف، اپیل کی گئی اور سائنٹیفک سوشلزم کی سفارش کی گئی۔ نائیجیریا کے ایک سابق قاضی القضاہ الحاج ابوبکر گومی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''اسلامی ثقافت اور روایات حضرت آدم کے برابر پرانی ہیں اور مسلمانوں کا احیاء اسلامی احکام کے مطابق ہونا چاہیے اور ہم ثقافت و تہذیب کے کسی ایسے احیاء کو قبول نہیں کر سکتے جو اسلامی اصولوں کی نفی کرے۔

۱۱۔ ۱۵۔ اپریل ۱۹۷۷ء میں احمد وبلو یونیورسٹی زاریا نے ایک قومی سیمینار کا انتظام کیا تھا

جس نے ایک قرارداد میں کہا:

''سیمینار کا خیال ہے کہ نائیجیریا کے غیر مسلم ان اخلاقی، فلسفیانہ اور علمی اصولوں سے ناواقف ہیں جو اسلام سے متعلق ہیں۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کو اسلام کے مطابق عملی زندگی گزارنے کے حق سے محروم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر مسلمان یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ غیر مسلم اسلامی اصولوں پر عمل کریں تو یہ بھی غیر جمہوری ہے کہ مسلمانوں کو غیر اسلامی اصولوں کو رد کرنے کا حق نہ دیا جائے۔ سیمینار نے مسودہ میں شریعت کو شخصی معاملات تک محدود رکھنے کی جو سفارش کی ہے وہ ناقابل قبول ہے۔ شریعت کو مسلمانوں کی پوری زندگی میں نافذ ہونا چاہیے اور ان تمام ریاستوں میں جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے شریعت کو قانونی نظام کی بنیاد بنایا جائے اور قانونی تعلیم کے ملکی نظام میں شریعت کی تعلیم کو مساوی درجہ دیا جائے۔ (ایپکٹ ۱۳۔۲۶۔مئی ۱۹۷۷ء)

تعمیر و ترقی

نائیجیریا کو براعظم افریقہ کا دیو کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دیو افریقہ کے نقشے پر اتنا نمایاں نظر نہیں آتا جتنے نمایاں سوڈان، زائرے اور الجزائر نظر آتے ہیں کیونکہ رقبہ میں نائیجیریا نہ صرف یہ کہ مذکورہ بالا تینوں ملکوں سے چھوٹا ہے بلکہ اور بھی کئی ملکوں سے چھوٹا ہے۔ لیکن آبادی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ نائیجیریا کے ساڑھے تین لاکھ مربع میل رقبے میں ساڑھے چھ کروڑ (۱) انسان آباد ہیں۔ گویا آبادی کے لحاظ سے نائیجیریا نہ صرف افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے بلکہ اگر ہم اس کو ایک مسلم ملک سمجھیں تو انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور پاکستان کے بعد اسلامی دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔

نائیجیریا کو آبادی کے علاوہ زرعی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے بھی افریقہ کے بیشتر ملکوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ملک کی قابل کاشت اراضی کا اب تک صرف دسواں حصہ زیر کاشت آیا ہے۔ نائیجیریا میں سوائے بورنو کے کچھ حصوں کے کہیں بھی پانی کی کمی نہیں۔ دریا بھی موجود ہیں اور

---

(۱) نائیجیریا میں مردم شماری کا مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے۔ جب نائیجیریا چار علاقوں میں تقسیم تھا تو ہر علاقہ مردم شماری کے وقت اپنی آبادی زیادہ بتانے کے لیے، تاکہ وفاقی اسمبلی میں اس کو زیادہ نمائندگی ملے، غلط اعداد و شمار تیار کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء کی مردم شماری میں نائیجیریا کی آبادی سات کروڑ ۹ لاکھ یعنی تقریباً دس کروڑ بتائی گئی تھی۔ یہ اعداد و شمار غیر حقیقت پسندانہ ہونے کی وجہ سے رد کر دیے گئے۔ اب اقوام متحدہ ۱۹۶۳ء کی مردم شماری کی بنیاد پر آبادی کا تخمینہ لگاتی ہے۔

بارش بھی وافر مقدار میں ہوتی ہے اس لیے زراعت کی توسیع کے امکانات وسیع ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں دریاؤں پر بند تعمیر کیے جارہے ہیں تاکہ نہروں کے ذریعہ مزید اراضی زیر کاشت لائی جائے۔ ان میں سب سے بڑا بند کینجی بند ہے جو ۱۹۶۹ء میں دریائے نائیجیریا پر بنایا گیا ہے۔ یہ بند ایک عظیم تر منصوبہ کا حصہ ہے جس کے تحت دریائے نائیجر پر جبّا کے مقام پر دوسرا بند اور نائیجر کے معاون دریائے کڈونا کے مقام پر ایک بند اور تعمیر کیا جارہا ہے۔ یہ ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے اور اپنی افادیت کے لحاظ سے مصر کے اسوان بند اور پاکستان کے منگلا اور تربیلا کے بندوں کی طرح ہے۔ منصوبے کی تکمیل پر سترہ لاکھ کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔ آبپاشی، سیلاب کی روک تھام اور دریائی جہاز رانی میں سہولت کی شکل میں جو فائدے حاصل ہوں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

سوکوٹو، گنگولا، ہادیجیا اور دوسرے چھوٹے دریاؤں پر بھی بند تعمیر کیے جارہے ہیں۔ جھیل چاڈ کے تاس میں بھی آبپاشی کے ایک بڑے منصوبہ کو مکمل کیا جارہا ہے۔ ان تمام منصوبوں کی تکمیل کے بعد توقع ہے کہ ۱۹۸۱ء تک نائیجیریا گیہوں کی پیداوار میں خود کفیل ہوجائے گا۔

نائیجیریا کے ساحلی علاقوں میں ربر، پام کا تیل اور کوکو اور شمالی حصوں میں روئی اور مونگ پھلی قیمتی پیداوار ہیں جو بڑی مقدار میں برآمد کی جاتی ہیں۔ شمالی صوبے ملک میں گلہ بانی اور مویشیوں کی افزائش کے بڑے مرکز ہیں۔ پورے ملک میں گوشت ان ہی علاقوں سے فراہم ہوتا ہے۔

معدنیات بھی کافی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ کوئلہ، لوہا، سیسہ، ٹین، جست، کولمبائٹ کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد پٹرول کے ذخیرے دریافت ہوئے اور ۱۹۷۶ء تک نائیجیریا دنیا کا ساتواں سب سے بڑا تیل پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔ تیل کی دریافت سے پہلے ملک کی نوے فیصد برآمد زرعی پیداوار تھی لیکن اب ستر تا نوے فیصد برآمد تیل پر مشتمل ہے اور زراعت کا حصہ صرف دس سے بیس فیصد رہ گیا ہے۔ قدرتی گیس بھی موجود ہے۔ دنیا کا ۹۵ فیصدی کولمبائٹ نائیجیریا میں نکالا جاتا ہے۔ تیل کی پیداوار کی وجہ سے تجارتی توازن ۱۹۶۵ء سے ملک کے حق میں ہوگیا ہے۔ صنعت میں کپڑے اور سیمنٹ کے کارخانے اور تیل صاف کرنے کے کارخانے اہم ہیں۔ فولاد سازی کا بھی ایک کارخانہ زیر تعمیر ہے۔ ۱۹۷۴ء میں حکومت نے تیل کمپنیوں کے بیشتر حصے خود حاصل کر لیے۔ بیرونی ملکوں کے قائم کردہ دوسرے صنعتی اداروں میں بھی اہل نائیجیریا کی شرکت ضروری قرار دے دی گئی ہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء کے پنج سالہ

پروگرام میں زراعت کی ترقی اور تعلیم وصحت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

سماجی تحفظ کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ بیماری، ریٹائرمنٹ اور بڑھاپے کے لیے قومی پراویڈنٹ فنڈ موجود ہے۔

تعلیم وصحافت

نائیجیریا میں تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ابتدائی مدرسوں میں ۴۵ لاکھ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۸۰ء تک یہ تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ ہو جائے گی۔ ۱۹۷۶ء سے تعلیم مفت ہے۔ ۱۹۷۳ء میں زاریا، ایبادان، آئی فے، لاگوس، بنین، اور نسوکا میں چھ یونیورسٹیاں تھیں اور ان میں طلبہ کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ۱۹۸۰ء تک چار مزید یونیورسٹیاں قائم کی جانے والی تھیں۔ خواندگی کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے۔

نائیجیریا کی صحافت افریقہ میں مصر اور جنوبی افریقہ کے بعد سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پہلے صحافت پر عیسائی چھائے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد مسلمان بھی اس طرف توجہ کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ٹائمز ہے جو ۱۹۲۵ء سے انگریزی میں نکل رہا ہے۔ اب یہ اخبار سرکاری ملکیت میں لے لیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت دو لاکھ روزانہ ہے۔ اتوار کا ایڈیشن ڈھائی لاکھ سے چار لاکھ تک چھپتا ہے۔ مینجنگ ایڈیٹر الحاج باباتندے ہیں۔ شمال میں کڈونا سے انگریزی میں نیو نائیجیرین نکلتا ہے جس کے ایڈیٹر توری محمد ہیں۔ ہاوسا زبان میں کڈونا سے ایک ہفت روزہ ''گاسکیا تافی کوابو'' نکلتا ہے جس کے ایڈیٹر الحاج عثمان ہیں۔ ان کے علاوہ باقی اخبار اور رسالے عیسائیوں کی ملکیت میں ہیں۔

نائیجیریا کا صدر مقام لاگوس ہے جس کی آبادی ۱۹۷۵ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ دوسرا بڑا شہر ایبادان ہے جس کی آبادی 8½ لاکھ ہے۔ اوگبوموشو اور کانو کی آبادی چار چار لاکھ کے قریب ہے۔ شمال میں کڈونا جو کبھی شمالی علاقہ کا صدر مقام تھا ایک چھوٹا شہر ہے لیکن شہری منصوبہ بندی کے لحاظ سے ملک کا سب سے خوبصورت شہر ہے۔ لاگوس کے علاوہ ان تمام شہروں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لاگوس میں مسلمانوں کی تعداد نصف کے قریب ہے۔

نائیجیریا کی سرکاری زبان انگریزی ہے۔ مقامی زبانوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہاوسا ہے۔ پہلے اس کا رسم الخط عربی تھا لیکن اب رومن ہو گیا ہے۔ لیکن مقامی زبانوں

میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مغربی ریاست کی زبان یورُوبا ہے۔ شمالی حصوں میں خصوصاً ریاست بورنو میں عربی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے خصوصاً دینی حلقوں میں۔ ایک زمانہ میں نائیجیریا کے علماء دینی کتابیں صرف عربی میں لکھتے تھے۔

نائیجیر کے فولانی حکمران

عثمان دان فودیو	(۱۸۰۴ء تا ۱۸۱۷ء)
محمد بلو	(۱۸۱۷ء تا ۱۸۳۷ء)
ابوبکر عتیق	(۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء)
علی بابا	(۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۹ء)
احمد و عتیق	(۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۶ء)
علی بوکرامی	(۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۷ء)
ابوبکر عتیق دوم	(۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۷ء)
معزو	(۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۷ء)
عمرو	(۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۱ء)
عبدالرحمن	(۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۲ء)
محمد والطاہرو	(۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء)
محمد والطاہرو دوم	(۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۵ء)
محمد ومیتو رارے	(۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۵ء)
محمدو	(۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۱ء)
حسن	(۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۸ء
ابوبکر	(۱۹۳۸ء)

ان تمام حکمرانوں کا دارالحکومت سوکوٹو تھا۔

جزیروں کی دنیا

جزائر قمر	۸½ سو مربع میل دو ہزار دو سو مربع کلومیٹر	۳ لاکھ (۱۹۷۸ء)
جزائر مالدیپ	ایک سو پندرہ مربع میل دو سو ۹۸ مربع کلومیٹر	ایک لاکھ چالیس ہزار (۱۹۷۸ء)

باب ۷۴

جزائر قُمر

جزیروں کا یہ مجموعہ مالاگاسی (مڈغاسکر) کے شمال مغربی ساحل اور تنزانیہ کے جنوب مشرقی ساحل کے درمیان آبنائے موزمبیق میں واقع ہے۔ عہدِ قدیم میں یہ جزیرے سلطنت زنج کا ایک حصہ تھے اور اسی زمانے میں یہاں اسلام پھیلا۔ ہر جزیرہ کا ایک علیحدہ سلطان تھا۔ غالباً سترھویں صدی میں ان جزیروں پر مالاگاسی کی بالادستی قائم ہوگئی۔ ۱۸۴۳ء میں مالاگاسی کے حکمراں نے ان میں سے جزیرہ مایوت کو فرانس کے سپرد کر دیا۔ ۱۸۸۶ء میں فرانس نے باقی جزیروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۶ء تک جزائر قمر کا انتظام مالاگاسی کی فرانسیسی حکومت کے تحت رہا۔ مالاگاسی پر فرانس ۱۸۸۵ء میں قابض ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں فرانس نے جزائر قمر کو مالاگاسی سے الگ کر دیا اور ان کو سمندر پار کے فرانسیسی علاقے کی حیثیت دے دی۔ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو جزائر قمر کی اسمبلی نے فرانس میں رہنے کا فیصلہ کیا جس کے بعد فرانس کی اسمبلی میں جزائر قمر کو نمائندگی مل گئی۔ ۱۹۶۱ء میں جزائر قمر کو اندرونی خود مختاری مل گئی۔ جون ۱۹۷۳ء میں فرانس اور جزائر قمر کی حکومت کے درمیان طے پایا کہ پانچ سال کے اندر ان جزیروں کو استصواب رائے کے بعد مکمل خود مختاری دے دی جائے گی۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں جزائر قمر کے باشندوں نے استصواب میں ۹۶ فیصد اکثریت سے مکمل آزادی کی حمایت کی۔ صرف جزیرہ مایوت نے آزادی کے خلاف رائے دی۔ اس اختلاف کو دیکھ کر فرانس نے مطالبہ کیا کہ آزادی سے قبل ہر جزیرہ آئین کی الگ الگ توثیق کرے۔ یہ مطالبہ چونکہ مایوت کی علیحدگی کا باعث ہو سکتا تھا اس لیے جزائر قمر کی حکومت کے سربراہ احمد عبداللہ نے ۶۔ جولائی ۱۹۷۵ء کو یک طرفہ طور پر جزائر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ فرانس نے آزادی تسلیم کر لی لیکن جزیرہ مایوت پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ ۳۔ اگست ۱۹۷۵ء کو علی صالح نے احمد عبداللہ کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اور سعید محمد جعفر کو صدر بنا دیا۔ نئی حکومت نے جزیرہ مایوت کے باشندوں کی خواہش کا احترام کرنے کا وعدہ کیا۔ احمد عبداللہ فرانس جلاوطن کر

دیے گئے۔ پونے تین سال بعد احمد عبداللہ کے حامی فوجی افسروں نے ۱۳۔ مئی ۱۹۷۸ء کو علی صالح کا تختہ پلٹ دیا۔ جو ۲۔ جنوری ۱۹۷۶ء کو صدر ہو گئے۔ احمد عبداللہ نے فرانس سے آ کر ۲۳۔ مئی کو پھر صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ علی صالح ۲۹۔ مئی ۱۹۷۸ء کو جب کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے مارے گئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء کو استصواب رائے عامہ میں ۹۹ فیصد افراد نے جزائر قمر کے نئے آئین کو منظور کر لیا۔ اس وقت سے احمد عبداللہ جزائر قمر کی جمہوریہ کے صدر ہیں۔ جزائر قمر کا مجموعی رقبہ تقریباً ½۸ سو مربع میل (دو ہزار دو سو مربع کلومیٹر) اور آبادی تین لاکھ کے قریب ہے (۱۹۷۶ء)

جزائر قمر حسب ذیل چار جزیروں پر مشتمل ہے:

	رقبہ (کلومیٹر)	آبادی (۱۹۵۶ء)
۱۔ انگاریا قُمر عظمیٰ	۱۱۴۸	ایک لاکھ ۲۶ ہزار
۲۔ انجوان یا جوہانہ	۴۲۴	۸۰ ہزار
۳۔ مُہیلی	۲۹۰	۱۰ ہزار
۴۔ مایوت	۳۷۴	۳۲ ہزار

ان میں جزیرہ مایوت نے چونکہ دسمبر ۱۹۷۶ء میں استصواب رائے عامہ کے ذریعہ فرانس سے وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے وہ جمہوریہ قمر سے ابھی تک باہر ہے۔ جزیرہ مایوت کے باشندوں کی اکثریت عیسائی ہے جب کہ باقی جزیروں کے باشندے تقریباً سب مسلمان ہیں۔

قُمر عظمیٰ ان میں سب سے بڑا ہے۔ ۳۸ میل لمبا اور بارہ میل چوڑا ہے۔ جزائر کی نصف آبادی اسی جزیرے میں ہے اور دارالحکومت مورونی (آبادی بارہ ہزار) اس جزیرہ میں ہے۔ انجوان جس کو جوہانہ بھی کہتے ہیں بیس میل چوڑا اور تیس میل لمبا ہے۔ یہاں گھنے جنگل پائے جاتے ہیں اور ملک کا سب سے بلند پہاڑ (بلندی ۵ ہزار فٹ) بھی اس جزیرے میں ہے۔ ملک کی ایک تہائی آبادی اس جزیرہ میں رہتی ہے۔ قُمر عظمیٰ کے علاوہ باقی تمام جزیرے بہت زرخیز ہیں۔ ناریل، چاول، مکئی، شکر قند، گنا، کافی، روئی نجورا سے اور ونیلا خاص پیداوار ہیں۔ باشندے ملاح ہیں اور ماہی گیری کرتے ہیں۔ فرانسیسی آبادکاروں نے شکر کے کارخانے شراب کشید کرنے کے کارخانے اور لکڑی کاٹنے کے کارخانے قائم کیے تھے جو اب بھی کام کر رہے ہیں۔

جزائر قمر کی حکومت کے فرانس سے اچھے تعلق ہیں اور وسط ۱۹۷۷ء میں حکومت نے عرب لیگ میں شرکت کی درخواست کی تھی۔

علی صالح کے دور میں حکومت کے رجحانات سوشلزم کی طرف تھے۔ ۱۹۷۶ء میں عورتوں کے نقاب پر یہ کہہ کر پابندی لگا دی گئی تھی کہ پردہ انقلابی مقاصد سے ہم آہنگ نہیں۔ قدیم روایات کو ثقافتی سامراجیت قرار دیا گیا۔ رمضان میں ملازمین کو روزہ رکھنے سے روکا گیا اور فوجیوں کے لیے روزہ معاف کر دیا گیا۔ اسلامی امور کے مشیر اور چیف جسٹس سید عبدالرحمن نے جب اعتراض کیا تو ان کو برطرف کر کے قید کر دیا گیا۔ اب معلوم نہیں احمد عبداللہ کی حکومت کے رجحانات کیا ہیں۔ (امپکٹ)

عربی اور فرانسیسی سرکاری زبانیں ہیں۔
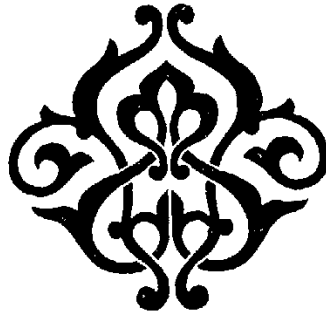
جزائر مالدیپ

جزائر مالدیپ، سری لنکا کے جنوب مغرب میں چار سو میل کے فاصلے پر بحر ہند میں واقع ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے تاریخ اسلام کے ابتدائی دَور ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں جب ابنِ بطوطہ یہاں آیا تو ساری آبادی مسلمان تھی۔ ۱۵۱۸ء میں ان جزیروں پر پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا۔ سترہویں صدی میں ولندیزی قابض ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۰۰ء کے قریب جب انگریزوں نے ولندیزوں سے ان کے مشرقی مقبوضات انڈونیشیا اور لنکا چھین لیے تو مالدیپ پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ ۱۸۸۷ء سے مالدیپ کا انتظام سری لنکا کی برطانوی حکومت کے سپرد ہو گیا۔ اس تمام عرصہ میں مالدیپ کی حیثیت ایک ریاست کی تھی جس کا سربراہ سلطان کہلاتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب سری لنکا آزاد ہو گیا تو برطانوی حکومت اور سلطان مالدیپ میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت خارجی امور برطانیہ کے سپرد کئے گئے اور اندرونی معاملات میں سلطان کو مکمل آزادی دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں مالدیپ کے باشندوں نے سلطان کو معزول کر کے جمہوریت قائم کر دی۔ نئے صدر نے جب اصلاحات کی کوشش کی تو سلطان کے حامیوں نے مخالفت کی اور قومی اسمبلی نے سلطان کو بحال کر دیا۔

۱۹۵۷ء میں حکومت نے جزیرہ گان میں ایک سابق برطانوی فوجی اڈے کو پھر سے قائم کرنے کا معاہدہ کیا تو عوام کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی اور وزیر اعظم ابراہیم علی دیدی کو مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ ابراہیم ناصر، وزیر اعظم ہوئے جو برطانوی اڈے کے قیام کے خلاف تھے اور اس کو مالدیپ کی خود مختاری کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں تین جنوبی جزیروں نے بغاوت کر دی جس کو کچلنے کے لیے حکومت نے برطانیہ سے امداد طلب کی اور اس کے معاوضے میں

گان (GAN) کا جزیرہ ۱۹۸۶ء تک کے لیے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔

۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء کو مالدیپ مکمل طور پر آزاد ہو گیا اور استصواب رائے کے بعد جس میں اسی فیصد باشندوں نے جمہوریت کے حق میں رائے دی۔ ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو مالدیپ کو جمہوریہ بنا دیا گیا۔ جمہوریہ بننے کے بعد سلطان امیر محمد فرید دیدی تخت سے دست بردار ہو گئے اور سابق وزیر اعظم امیر ابراہیم ناصر (پیدائش ۲ ستمبر ۱۹۲۶ء) صدر جمہوریہ ہو گئے۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم احمد زکی کی گرفتاری کے بعد وزارتِ عظمٰی بھی ابراہیم ناصر نے سنبھال لی۔ احمد زکی جلاوطن کر دیے گئے۔

جزائر مالدیپ دو ہزار جزیروں پر مشتمل ہیں جن کا رقبہ صرف ایک سو پندرہ مربع میل (۲۹۸ مربع کلومیٹر) ہے اور آبادی (۱۹۷۸ء) ایک لاکھ چالیس ہزار ہے۔ دو ہزار جزیروں میں سے صرف دو سو بیس جزیرے آباد ہیں۔ دارالحکومت مالے ہے جس کی آبادی ۲۵ ہزار ہے۔ باشندے سب مسلمان ہیں اور ان کی زبان سری لنکا کی قدیم سنہالی زبان سے مشابہ ہے۔ ماہی گیری خاص پیشہ ہے اور لنکا اور جاپان کو مچھلیاں برآمد کی جاتی ہیں۔ ناریل خاص پیداوار ہے۔ دارالحکومت مالے سے ایک میل دور ایک جزیرے میں جدید طرز کا ہوائی اڈہ ہے۔ سیاحت کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مالے سے کولمبو (سری لنکا) تک ایر مالدیپ کے جہاز چلتے ہیں۔ پاکستان، ہندوستان اور لنکا کے درمیان مالدیپ سے چھوٹے چھوٹے بحری جہازوں میں بھی سفر کیا جاتا ہے۔ مالدیپ کا میزانیہ سوا دو کروڑ روپے سالانہ کا ہے۔ مالے سے دو روزنامے بھی شائع ہوتے ہیں۔

یورپی روس میں زاروں کے عہد سے پہلے (یعنی ۱۵۰۰ء سے پہلے) کوہ یورال، دریائے وولگا کی وادی، کریمیا، قفقاز اور اس سے متصل علاقوں تک کئی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن زاروں کی مسلم کش پالیسی کی وجہ سے ان میں سے بیشتر علاقوں کی مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو گئی۔ مسلمان لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کر گئے اور ان کی جگہ روسی آباد کر دیے گئے۔

اشتراکی دور میں بھی عہد زار کی اسی مسلم کش پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ وسط ایشیا اور ترکستان کی طرح یورال اور وولگا کے علاقے میں مسلمانوں کی تعداد برابر کم ہو رہی ہے۔ تاتارستان اور باشقریا میں مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصدی رہ گیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کریمیا کے تمام مسلمان جلاوطن کر دیے گئے۔ یہی سلوک قفقاز کے کئی مسلم علاقوں کے ساتھ کیا گیا جن میں چیچن، انگش اور چرکس قبائل آباد تھے۔ اب یورپی روس میں صرف داغستان اور آذربائیجان میں مسلم اکثریت باقی ہے۔ اگرچہ یہاں بھی روسی آبادی بڑھ رہی ہے۔ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو کی تقریباً نصف آبادی روسی یا غیر مسلم ہے۔

اشتراکی دُنیا

ملک	رقبہ	آبادی
۱۔ قازقستان	۱۰ لاکھ ۶۴ ہزار مربع میل ۲۷ لاکھ مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۴۵ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۲۔ کرغیزستان	۷۶ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۹۸ ہزار مربع کلومیٹر	۳۵ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۳۔ ازبکستان	ایک لاکھ ۵۸ ہزار مربع میل ۴½ لاکھ مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۴۵ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۴۔ ترکمانستان	ایک لاکھ ۸۸ ہزار مربع میل ۴ لاکھ ۸۸ ہزار مربع کلومیٹر	۲۷ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۵۔ تاجیکستان	۵۴ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۴۳ ہزار مربع کلومیٹر	۳۶ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۶۔ آذربائیجان	۳۳ ہزار مربع میل ۸۶ ہزار مربع کلومیٹر	۵۸ لاکھ (۱۹۷۷ء)
۷۔ داغستان	پچاس ہزار مربع میل ایک لاکھ ۹۴ ہزار مربع کلومیٹر	
۸۔ چیچن انگش	سات ہزار مربع میل ۱۹ ہزار مربع کلومیٹر	
۹۔ کبردینو۔ بالکر	۴¾ ہزار مربع میل ۱۲½ ہزار مربع کلومیٹر	
۱۰۔ قراچائی چرکس	۵½ ہزار مربع میل ۱۴ ہزار مربع کلومیٹر	

١١۔ تاتارستان	٢٦ ہزار مربع میل ٦٨ ہزار مربع کلومیٹر	
١٢۔ باشقردستان	٥٥ ہزار مربع میل ایک لاکھ ٤٣ ہزار کلومیٹر	
١٣۔ البانیا	گیارہ ہزار مربع میل ٢٨ ہزار مربع کلومیٹر	٢٦ لاکھ (١٩٧٧ء)
١٤۔ مشرقی ترکستان	٦ لاکھ ٣٣ ہزار مربع میل ١٦½ لاکھ مربع کلومیٹر	٣٧ لاکھ (١٩٧٧ء)

باب ۴۹

رُوس اور مغربی ترکستان

تاریخی پس منظر

ہم نے اب تک جن اسلامی ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈالی ہے۔ وہ سب سیاسی طور پر آزاد ملک ہیں۔ لیکن اسلامی دُنیا کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ابھی تک آزادی کی نعمت سے محروم ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو رُوس اور چین کی اشتراکی حکومتوں کے تحت ہے۔ آزاد اسلامی دُنیا کے بیشتر ملک، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہیں جن پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغربی ملکوں نے جن میں برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نمایاں تھے، قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن سوائے فلسطین کے یہ تمام ملک آج مکمل طور پر آزاد ہیں۔ لیکن اسی زمانے میں رُوس اور چین نے جن اسلامی ملکوں پر اپنا قبضہ جمایا تھا، وہ ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ رُوس اور چین میں ان جمہوری اقدار کو فروغ نہ ہوسکا جو مغربی ملکوں میں عام ہیں۔ یہاں جمہوریت کی جگہ اشتراکی استبدادی نظام نے حاصل کر لی۔ اگر یہ استبدادی نظام قائم نہ ہوا ہوتا تو یقیناً اس وقت روس اور چین کے مسلمان بھی اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے۔

وہ اسلامی علاقے جو آج سوویٹ یونین میں شامل ہیں۔ اسلامی دَور میں دنیائے اسلام کے بڑے اہم علاقے تھے۔ ان میں ترکستان کا علاقہ خاص طور پر اسلامی تہذیب اور علوم کا عظیم مرکز تھا۔ یہاں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کو ہم سامانیوں، غزنویوں، سلجوقیوں اور تیموریوں کے حالات میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن سوویٹ یونین کے اسلامی دَور کی تاریخ ترکستان اور وسط ایشیا تک محدود نہیں ہے۔ قفقاز کے پہاڑوں اور میدانوں اور خاص روس کا بھی مسلمانوں سے گہرا تعلق رہا ہے اور ان علاقوں میں سینکڑوں سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ دریائے والگا کی وادی میں جہاں، بلغار کی مسلم مملکت اور سرائے کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی

مسلمانوں کا اقتدار تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قائم رہا۔ اسی طرح جزیرہ نما کریمیا اور اس کے گردونواح میں بھی مسلمانوں کی حکومت پانچ سو سال قائم رہی۔ [1] جہاں تک قفقاز کا تعلق ہے تو یہاں کے مختلف علاقوں یعنی داغستان و آذربائیجان، آرمینیہ اور گرجستان پر مسلمانوں کو پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں بھی بالادستی حاصل ہوگئی تھی اور یہ بالادستی انیسویں صدی تک قائم رہی۔ گویا قفقاز کے ان علاقوں کی اسلامی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ترکستان اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں کی تاریخ پرانی ہے۔

ان علاقوں میں جو اب سوویٹ یونین میں شامل ہیں مسلمانوں کے خلاف روسیوں کی جارحانہ کارروائیوں کا آغاز جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں پڑھ چکے ہیں [2] ۱۵۵۲ء میں کازان پر روسیوں کے قبضے سے ہوا۔ ۱۵۵۶ء میں استراخان سے مسلمان بیدخل کیے گئے۔ ۱۷۸۳ء میں کریمیا پر بھی روس کا قبضہ ہوگیا اور ۱۸۲۸ء تک روسی فوجیں آذربائیجان، آرمینیہ اور گرجستان پر قابض ہو چکی تھیں۔ اس دوران میں روسیوں نے سائبیریا میں بھی اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور ۱۸۴۶ء میں قازقستان پر قبضہ کرنے کے بعد وہ دریائے سیحوں تک بڑھ آئے۔ ۱۸۶۵ء میں انہوں نے فرغانہ پر، ۱۸۶۸ء میں سمرقند و بخارا پر، ۱۸۷۳ء میں خیوہ (خوازم) پر اور ۱۸۸۴ء میں مرو کے تاریخی شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح انیسویں صدی کے آخر تک زار روس کی سلطنت ان تمام علاقوں اور ملکوں تک پھیل گئی جو آج سوویٹ یونین میں شامل ہیں۔

زار روس کا دورِ حکومت

زارِ روس کا سکہ قائم ہونے سے پہلے ترکستان، قازقستان، سائبریا کا بڑا حصہ دریائے والگا اور یورال کی وادیاں، کریمیا اور اس سے ملحقہ حصے، شمالی قفقار کے کئی حصے داغستان اور آذربائیجان وہ علاقے تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ رقبے کے لحاظ سے زارِ روس کی سلطنت کا تقریباً ایک تہائی حصہ مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ ایک قوم کی سلطنت میں کسی دوسری قوم کی اتنی بڑی تعداد کا وجود ایک حکمران قوم کے لیے بجا طور پر وجہ تشویش ہوسکتا

(۱) بلغار اور سرائے کی تاریخ کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب دوم اور کریمیا کی تاریخ کے لیے باب ۳۳۔

(۲) ملاحظہ کیجیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب ۳۲۔

ہے۔ چنانچہ زار کی حکومت مسلمانوں کے وجود سے ہمیشہ خوفزدہ رہی اور اس ڈر اور خوف کو دُور کرنے کے لیے اس نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا۔ اس معاملے میں رُوسیوں نے اس رواداری کو بھی فراموش کر دیا جس کا مظاہرہ تاتاریوں اور مسلمانوں نے روسیوں کے ساتھ اپنے دورِ حکومت میں کیا تھا۔ روسیوں نے اس مقصد کے لیے دو طریقے اختیار کیے ایک یہ کہ مسلمانوں میں ارتداد کی مہم چلائی، مسجدوں کو شہید کیا گیا، مسلمانوں کی تجارت اور کاروبار پر پابندیاں عاید کیں اور ان کی جائدادوں کو ضبط کیا، دوسرا یہ کہ مسلم علاقوں میں نہ صرف خالی زمینوں پر رُوسی اور سلافی نسل کے دوسرے غیر مسلموں کو آباد کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو ان کی زمینوں سے بیدخل کر کے ان کی زمینیں بھی روسیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت کے خاتمے تک یورو پی روس اور سائبیریا اور شمالی قازقستان کی مسلم اکثریت کے علاقے غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

مسلمانوں نے روسی حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف بارہا بغاوتیں کیں لیکن وہ بڑی حد تک بے اثر رہیں۔ ہاں ان کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ کبھی کبھی کچھ مدت کے لیے مسلمانوں پر سے کچھ پابندیاں اٹھ جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں ملکہ کیتھرائن ۱۷۶۲ء تا ۱۷۹۶ء کے عہد میں خاص طور پر مسلمانوں کے بہت سے حقوق، بحال کیے گئے۔ پھر انیسویں صدی میں جب زار روس کے جبر و استبداد کے خلاف روسی عوام کی تحریکوں نے زور پکڑا تو پھر بالواسطہ طور پر مسلمانوں کو بھی بہت سے حقوق مل گئے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں مسلمانوں میں بیداری کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا اور ان میں کئی راہ نما پیدا ہوئے جنہوں نے تجدید و اصلاح کا کام کیا۔ ان رہنماؤں میں شہاب الدین میر غنی (۱۸۱۵ء تا ۱۸۸۹ء، عبدالقیوم نصیری ۱۸۲۴ء تا ۱۹۰۲ء حسین فیض خانی ۱۸۲۶ء تا ۱۸۶۶ء اور اسماعیل گسپر الی کے نام اہم ہیں۔

اسماعیل گسپر الی

۱۸۵۱ء تا ۱۹۱۴ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رُوس کے ان راہ نماؤں میں اسماعیل گسپر الی اپنی اصلاحات اور تعلیمی کارناموں کی وجہ سے بجا طور پر روس کے سرسید کہے جا سکتے ہیں۔ گسپر الی نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر روس نواز موقف ضرور اختیار کیا لیکن انہوں نے سلطنت

رُوس کے اسلامی علاقوں کو روسیانے کی پالیسی کی سختی سے مخالفت کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مغرب کی نجات اسلامی اخلاق میں مضمر ہے اور یہ کہ اسلام ترکوں اور تاتاریوں کے قومی کلچر کا لازمی جزو ہے۔ انہوں نے ایک ایسی ترکی زبان کو فروغ دیا جو رُوس کے ترکی النسل مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی بولیوں کی جگہ سب مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان بن سکے۔ مسلمانوں کی اس بیداری میں اسماعیل گسپر الی کے اخبار ہفت روزہ ''ترجمان'' نے نمایاں حصہ لیا جو کاشغر سے لے کر کریمیا بلکہ قسطنطنیہ تک ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ترکی زبان کے اخبار کے ذریعہ کازان اور کریمیا کے ترک کاشغر کے ترکوں سے مربوط اور منسلک ہو گئے تھے۔ اسماعیل گسپر الی اسلامی اتحاد کے علمبردار تھے۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے ۱۹۰۸ء میں قاہرہ میں ایک کل اسلامی کانگریس ہوئی تھی جو غالباً مسلمانانِ عالم کی پہلی عالمی کانگریس تھی۔

اسماعیل گسپر الی اور دوسرے[1] راہنماؤں کی وجہ سے مسلمانانِ رُوس میں جو بیداری پیدا ہوئی، اس نے جلد ہی سیاسی رنگ اختیار کر لیا اور مسلمانوں کو روسی پارلیمنٹ دوما میں محدود نمائندگی بھی مل گئی۔ اسی زمانے میں رُوسی مسلمانوں کے دو بڑے اجتماع بھی ہوئے جو کل مسلم کانگریس کہلاتے تھے۔ پہلا اجتماع اگست ۱۹۰۵ء میں شہر گورکی میں، اور دوسرا جنوری ۱۹۰۶ء میں سینٹ پیٹرزبرگ میں ہوا۔ ان اجتماعات میں مسلمانوں نے عام انتخابات میں حصہ لینے کا پروگرام بنایا، اور طے کیا کہ وہ اپنے ووٹ رُوسی آئینی جمہوری پارٹی کو دیں جو کیڈٹ (CADET) کے مختصر نام سے زیادہ مشہور تھی، کیونکہ یہ جماعت آئینی اور پارلیمانی طرزِ حکومت چاہتی تھی۔ ان ہی اجتماعات میں اتفاق پارٹی (union party) کی تشکیل ہوئی اور ایک مسلمان رہنما یوسف آق چورا دغلو نے تمام تاتاری مسلمانوں کو اپنی علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے پر زور دیا جس کی بنیاد قومیت اور اسلام کے اصولوں پر ہو۔ اجتماع میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ رُوس کے تمام ترک و تاتار باشندوں کے لیے ایک ترکی ادبی زبان رائج کی جائے جو قسطنطنیہ کی ترکی پر مبنی ہو۔

---

(۱) اس جگہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جن رہنماؤں اور مصنفوں کی وجہ سے روسی مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی، ان میں سے کوئی بھی وسط ایشیا سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یہ تمام رہنما روس خاص کے رہنے والے تھے میر غنی، حسین فیض خانی، عبدالقیوم اور یوسف آق چورا غلو کازان کے رہنے والے تھے اور اسماعیل کریمیا کے ایک گاؤں گسپرا کے رہنے والے تھے اور اسی گاؤں کی نسبت سے ترکی ترکیب کے مطابق گسپر الی یعنی گسپرا میں رہنے والے کہلائے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روسی مسلمان بحیثیت ترک اپنی علیحدہ قومیت کے دعویدار تھے اور یہ کہ اس قومیت میں اسلام کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مسلمانانِ روس کی یہ سیاسی جدوجہد جاری تھی کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور رُوس اس جنگ میں اتحادیوں کے حلیف کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔

اشتراکی انقلاب

روس جس وقت جنگ میں شامل ہوا اس وقت پورے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور زار کی سلطنت میں آباد مختلف قومیں اور خود روسی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر زار کے استبدادی نظام کو ختم کر کے عوامی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس مقصد کے لیے رُوسی مسلمانوں نے ایک بار پھر متحدہ جدوجہد کرنے کی کوشش کی۔ یکم مئی ۱۹۱۷ء کو ماسکو میں کُل مسلم روسی کانگریس طلب کی گئی جس میں زار کی سلطنت کے ہر حصے سے نو سو مندوبوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد دوسری کانگریس جولائی ۱۹۱۷ء میں کازان میں طلب کی گئی۔ ان اجتماعات میں مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ روس میں ایک وفاقی نظام قائم کیا جائے جس کے اندر ہر قوم کو علاقائی خودمختاری حاصل ہو اور مسلمان قومی اور ثقافتی معاملات میں آزاد ہوں لیکن ابھی یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ رُوس میں انقلاب آ گیا۔ فروری ۱۹۱۷ء میں دارالسلطنت پیٹروگراڈ کے عوام نے زارِ رُوس کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس انقلاب میں اگرچہ سوشلسٹ جماعتوں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا لیکن یہ ایک عوامی انقلاب تھا اور اس کا مقصد جمہوری نظام کا قیام تھا۔ نئی حکومت نے شہری آزادیوں کا اعلان کیا اور بلا لحاظ مذہب اور رنگ و نسل تمام شہریوں کو یکساں حقوق دیے۔ مسلمانوں نے بھی اس حکومت سے پورا پورا تعاون کیا لیکن چند ماہ بعد ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ملک کے کمیونسٹ عناصر فوج کے ساتھ مل کر ایک نیا انقلاب لے آئے جو اشتراکی کمیونسٹ انقلاب کہلاتا ہے۔ اس انقلاب کا بانی لینن (۱۸۷۰ء تا ۱۹۲۴ء) تھا اور اس کے بعد ٹراٹسکی (۱۸۷۷ء تا ۱۹۴۰ء) اور اسٹالن (۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۳ء) اس انقلاب کے بڑے رہنما تھے۔ ان کمیونسٹ رہنماؤں نے زار کے حامیوں اور دوسرے مخالف عناصر کے مقابلے میں عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لیے غیر روسی قوموں سے بڑے اچھے اچھے وعدے کیے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہر قوم کو جو زار کے عہد میں

رُوس کی غلام تھی، اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے بعد آزادی دے دی جائے گی، اور ان کا مذہب ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوگا۔ ترکستان اور رُوس کے دوسرے حصوں کے مسلمان جوزار کے زمانے میں ظلم وستم کا نشانہ رہے تھے، ان کے لیے یہ اعلان مسرت اور خوشی کا پیغام لے کر آیا، اور رُوس کے مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اشتراکیوں سے تعاون کیا، بلکہ ہر جگہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اپنی علیحدہ حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ مسلم حکومتیں جو اشتراکی انقلاب کے بعد قائم ہوئیں، حسب ذیل تھیں۔

۱۔ ایدل یورال: یہ حکومت کازان کے علاقے میں ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم کر دی گئی۔ اس کے راہ نما صدری مقصودی تھے۔ وہ بعد میں ترکی چلے گئے۔ جہاں ۱۹۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۲۔ باشقریا: یہ حکومت یورال کے علاقے سے ملحق اس حصہ میں قائم ہوئی جہاں باشقر ترک آباد تھے۔ اور ان کا دارالحکومت شہر اوفا تھا، یہ حکومت ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۲۰ء تک قائم رہی اس کے رہنما زکی ولیدی طوغان تھے۔ طوغان آج کل ترکی کے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ ہیں۔

۳۔ کریمیا: یہ حکومت ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک قائم رہی اور اس کے سرگرم رہنما سید جعفر احمد کریمر تھے۔ وہ بھی ترکی میں پناہ گزیں ہیں اور ایک سیاسی مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں۔

۴۔ آذربائیجان: اور داغستان میں بھی ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک دو آزاد حکومتیں قائم رہیں ان میں آذربائیجان کے راہ نما محمد امین رسول زادہ ۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۵ء تھے۔ رسول زادہ آذربائیجان پر کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ترکی میں انتقال ہوا۔

وسط ایشیا میں خوقند اور آ اولاش اور دہ قازقستان کی حکومتیں قائم ہوئیں جن کے راہنما مصطفیٰ شوقی (chokaiev) تھے لیکن اشتراکیوں نے ان حکومتوں کو چند ہفتے کے اندر اندر ختم کر دیا۔

بخارا اور خیوہ میں پہلے سے خوانین کی ریاستیں قائم تھیں۔ اشتراکی انقلاب کے بعد انہوں نے روس کی بالا دستی کو ختم کرنا چاہا لیکن اشتراکی فوجوں نے فروری ۱۹۲۰ء میں خیوہ کی ریاست کو اور اگست ۱۸۲۰ء میں بخارا کی ریاست کو ختم کر دیا۔

بسماچی اور انور پاشا

رُوس کی تربیت یافتہ اور منظم فوجوں نے ان نوزائیدہ حکومتوں کا خاتمہ تو کر دیا لیکن اس فعل نے ترکستان کے مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر دیا اور وہ ہر جگہ اشترا کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کی یہ بغاوت بسماچی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اور اگرچہ اس بغاوت کا سلسلہ کئی سال جاری رہا لیکن اس کا اصل زور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک قائم رہا۔ اس دوران میں ترکی کے مشہور رہنما انور پاشا ۱۸۸۱ء تا ۱۹۲۲ء جو جنگ عظیم میں ترکستان کی شکست کے بعد رُوس چلے گئے تھے، بخارا پہنچ گئے اور مسلمانوں پر روسیوں کے ظلم و ستم دیکھ کر ترکستان کی آزادی کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے ترکستانیوں کے مختلف گروہوں کو متحد کر کے رُوس کی فوجوں کا دو سال تک مقابلہ کیا اور کئی علاقوں کو رُوسی حملہ آوروں سے آزاد کرا لیا لیکن ہتھیاروں کی کمی کی وجہ سے وہ بھی بے بس ہو گئے۔ اور ۸۔ اگست ۱۹۲۲ء کو افغانستان کی سرحد کے پاس روسی حملہ آوروں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے مسلم علاقوں کی طرح ترکستان پر بھی روس کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ مسلمانوں نے اشترا کی انقلاب کے وقت آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ پارہ پارہ ہو گیا۔

علم و ادب

اسلامی دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرح زار روس کے مقبوضہ مسلم علاقوں میں بھی قومی بیداری کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ اس قومی بیداری نے جدید نثر کی اور صحافت کے لیے راہ ہموار کی اور نصف صدی کے اندر اندر کازان باغچی سرائے کریمیا، اور باکو روسی مسلمانوں کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز بن گئے جہاں کے چھاپے خانوں سے کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر اخبار اور رسالے بھی شائع ہونے لگے۔ شہاب الدین مرجانی، عبدالقیوم نصیری اور حسین فیض خان جن کا پیچھے تذکرہ ہو چکا ہے صرف رہنما اور مصلح ہی نہیں تھے بلکہ ترکی زبان کے ممتاز مصنف بھی تھے۔ شہاب الدین مرجانی نے کازان کے ترکوں کی تاریخ سے متعلق قیمتی تحقیقات کیں اور کتابیں لکھیں جن میں ''مستفاد الاخبار فی احوال کازان و بُلغار'' سب سے اہم ہے۔ عبدالقیوم نُصیری تقریباً چالیس کتابوں کے مصنف تھے۔ اسماعیل گسپرالی کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ روسی

مسلمانوں کے سب سے مشہور اور مقبول ہفت روزہ ''ترجمان'' کے مدیر اور ناشر تھے۔ کازان کا شہر روسی مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی و ادبی مرکز تھا۔ اس خطے کے دوسرے مشاہیر علم و ادب یہ ہیں:

رضاء الدین ابن فخر الدین (۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۶ء) ممتاز مورخ اور سوانح نگار تھے۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''آثار'' ہے جو روسی مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ انہوں نے غزالی، ابن عربی، ابن تیمیہ اور دوسرے مسلمان مشاہیر پر بھی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے اشتراکی استبداد کا بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

عبداللہ توقائے (۱۸۸۶ء تا ۱۹۱۳ء) کازان کے ترکوں کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ نوجوانی میں انتقال ہو گیا۔

صدری مقصودی (۱۸۸۰ء تا ۱۹۵۷ء) کازان کے ممتاز سیاسی رہنما تھے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد روسی مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد ہجرت کر کے ترکی آ گئے۔ بلند پایہ محقق تھے۔ ترکوں کے قوانین کی تاریخ پر اہم کتابیں لکھیں۔

ایاز اسحاقی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۵۴ء) کازان کے ممتاز ترین ناول نویس اور ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے بھی اشتراکی دور میں مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کی لیکن ناکام ہونے کے بعد روس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے ناول اور ڈراموں کی تعداد ۳۸ ہے۔

یوسف آقچورہ (۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۳ء) کازان کے ممتاز سیاسی رہنما اور صحافی تھے۔ آزادی کی جنگ میں ناکامی کے بعد ہجرت کر کے ترکی آ گئے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جنہوں نے ترکوں کے افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ اتحاد تورانی کے علمبردار تھے۔

زکی ولیدی توغان (۱۸۹۰ء تا ۱۹۷۰ء) کازان کے رہنے والے تھے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد تاتارستان اور باشقردستان کو روسی تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ناکام ہونے کے بعد ترکی چلے گئے جہاں ترکوں کی تاریخ خصوصاً روسی مسلمانوں کے بارے میں بڑا اہم تحقیقی کام کیا۔ توغان کا شمار ان محققوں میں ہوتا ہے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وفات کے وقت استنبول میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر تھے۔

موسیٰ جار اللہ (۱۸۷۵ء تا ۱۹۴۹ء) مشہور عالم دین تھے۔ دریائے ڈان کے دہانے پر واقع شہر روف میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ شہر کریمیا کی مملکت میں شامل تھا اور رازاق کہلاتا تھا۔ موسیٰ

جار اللہ نے اشتراکی انقلاب کے بعد کمیونسٹوں سے کئی سال تعاون کیا لیکن آخرکار ۱۹۳۰ء میں وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ باقی عمر ترکی اور مصر میں گزاری اور مصر میں انتقال ہوا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ روس کے مسلمان جہاں کہیں ہوں وہ ایک ہی ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں، صوبوں اور جمہوریتوں میں ان کی تقسیم روسی مسلمانوں کی تقسیم نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں زور دیا کہ اسلام ہر دَور اور ہر زمانے میں انسانوں کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ ان کی تصانیف ترکی اور عربی دونوں میں ہیں۔

کازان کے بعد روسی مسلمانوں کا دوسرا بڑا ادبی مرکز آذربائیجان تھا۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز ترین یہ تھے:

فتح علی اخوندزادہ (۱۸۱۳ء تا ۱۸۷۸ء): وہ نہ صرف ترکی زبان کے بلکہ پوری اسلامی دنیا میں پہلے ڈرامہ نگار تھے۔ آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ ان کے دو ڈرامے وکلائے مرافعہ اور سرگزشت حکیم نباتات اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ جدید آذری ادب کی نشوونما میں اخوندزادہ کا اہم حصہ ہے۔

حسنین جاوید (۱۸۸۲ء تا ۱۹۴۴ء): آذربائیجان کی دوسری اہم ادبی شخصیت ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے آذری ترکی ادب کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ممتاز شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ ان کی حریت پسندی اشتراکی حکومت کو پسند نہیں آئی اور وہ قتل کر دیے گئے۔

محمد امین رسول زادہ (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۵ء) صدری مقصودی اور یوسف آقچوں کی طرح وہ بھی ممتاز سیاسی رہنما تھے، لیکن ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے بھی نمایاں ہیں۔ ان کی سب سے اہم کتاب مشہور شاعر نظامی گنجوی کی سوانح عمری ہے۔

ازبکستان کی ادبی شخصیتوں میں خواجہ محمود بہبودی (۱۸۷۴ء تا ۱۹۱۹ء) کا نام اس لحاظ سے اہم ہے کہ ان کی تحریروں نے ترکستان میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ ان کے بعد اشتراکی دور میں جو ادبی شخصیتیں اُبھریں ان میں عبدالحمید سلیمان چولپان (۱۸۹۷ء تا ۱۹۳۸ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ شاعر حریت کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی نظموں نے وسط ایشیا کے ترکوں میں آزادی کے لیے تڑپ پیدا کی جس کی وجہ سے کمیونسٹوں نے ان کو قتل کرا دیا۔ چولپان جدید ازبک ادب کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ازبکستان کی ایک اور ادبی شخصیت عبداللہ

قادری جُلکن بے (۱۸۹۴ء تا ۱۹۳۹ء) کی ہے۔ وہ ازبک زبان کے ممتاز ترین ناول نگار اور افسانہ نگار تھے اور ایک آزاد فن کار کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ سوویٹ حکومت نے اس بات پر ان کو وہی سزا دی جو وہ اس سے پہلے چولپان کو دے چکی تھی اور بعد میں حسنین جاوید کو دی یعنی قتل کرا دیا۔

اتحاد و وحدت کا خاتمہ

روس کے اشتراکیوں نے شروع میں ترکستان کو ایک روسی گورنر جنرل کے تحت رکھا۔ لیکن وہ ترکستان کے وسیع و عریض ملک کی یہ سیاسی وحدت زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اس وحدت کو ختم کرنے کے لیے ترکستان کو حسب ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو خود مختار اشتراکی جمہوریتوں کا نام دیا:

	رقبہ (مربع میل)	آبادی (۱۹۷۰ء)
۱۔ قازقستان	۱۰ لاکھ ۶۴ ہزار	ایک کروڑ ۲ ۴ لاکھ
۲۔ ازبکستان	ایک لاکھ ۵۸ ہزار	ایک کروڑ ۷ ۳ لاکھ
۳۔ کرغیزستان	۷۶ ہزار	۳۴ لاکھ
۴۔ ترکمانستان	ایک لاکھ ۸۸ ہزار	۲۵ لاکھ
۵۔ تاجیکستان	۵۴ ہزار	۳۴ لاکھ

ان میں قازقستان کا دارالحکومت آلما اتا (آبادی سولہ لاکھ) ازبکستان کا تاشقند (آبادی سولہ لاکھ) کرغیزستان کا فرنزی..... ترکمانستان کا عشق آباد..... اور تاجیکستان کا دوشنبہ ..... ہے۔

سوویٹ یونین کے یوروپی حصے میں چھٹی جمہوریہ آذربائیجان کے نام سے قائم کی گئی۔ قفقاز کے علاقے میں داغستان اور اس سے ملے ہوئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی کئی ریاستیں قائم کی گئیں جن کو خود مختار علاقوں کا نام دیا گیا۔ دریائے والگا اور کوہستان یورال کے علاقے میں تاتارستان اور باشقردستان یا باشقریا کی خود مختار حکومتیں قائم کی گئیں جو روسی وفاقی جمہوریہ کا حصہ ہیں اور ان کی آئینی خود مختاری مذکورہ بالا چھ جمہوریتوں کے برابر نہیں۔ ان ریاستوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ داغستان کی خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ (قفقاز) رقبہ پچاس ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۹۴ ہزار مربع کلومیٹر) آبادی (۱۹۶۹ء) چودہ لاکھ ۲۹ ہزار۔ دارالحکومت مہاچ قلعہ۔

۲۔ چیچن۔ انگش خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ (قفقاز) رقبہ سات ہزار مربع میل (۱۹ ہزار مربع کلومیٹر) آبادی ۱۹۶۹ء) دس لاکھ ۶۹ ہزار۔ دارالحکومت گروزنی۔

۳۔ کبردینو۔ بالاکر خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ قفقاز) رقبہ چار ہزار آٹھ سو مربع میل (½۱۲ ہزار مربع کلومیٹر) آبادی (۱۹۶۹ء) ½۵ لاکھ۔ دارالحکومت بالچک۔

۴۔ شمال آسی خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ (قفقاز) رقبہ تین ہزار مربع میل۔ (آٹھ ہزار مربع کلومیٹر) دارالحکومت ولادی قفقاز جس کا موجودہ نام (ordzhonikidze) ہے۔

۵۔ قراچائی چرکس خود مختار علاقہ (قفقاز) رقبہ ½۵ ہزار مربع میل (چودہ ہزار مربع کلومیٹر) آبادی (۱۹۶۹ء) تین لاکھ ۴۸ ہزار۔ دارالحکومت چرکس۔

۶۔ تاتار خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ (وادیٔ والگا) رقبہ ۲۶ ہزار مربع میل (۶۸ ہزار مربع کلومیٹر) آبادی (۱۹۶۹ء) ۳۲ لاکھ۔ دارالحکومت کازان۔

۷۔ باشقر دستانی خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ۔ (یورال) رقبہ ½۵۵ ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۴۳ ہزار کلومیٹر) دارالحکومت اوفا۔

اسلامی ترکستان کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد رُوس کی اشتراکی حکومت نے دوسری ضرب لسانی اتحاد پر لگائی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ زار کے عہد میں روسی مسلمان جو زیادہ تر ترکی النسل تھے، اپنے لیے ایک مشترکہ ترکی زبان کو ترقی دے رہے تھے اور اسماعیل گسپرالی کی کوششوں سے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ یہ مشترکہ زبان اشتراکی سامراج کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، کیونکہ یہ زبان روس کے تمام مسلمانوں کو متحد رکھنے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس خطرے کو دُور کرنے کے لیے روس نے ہر علاقے کی مختلف بولیوں کو مستقل زبان کی حیثیت سے ترقی دینا شروع کیا۔ چنانچہ آج اسلامی ترکستان میں ایک زبان کی بجائے ایک درجن سے زیادہ زبانیں رائج ہیں۔ اشتراکیوں نے اس پر بس نہیں کی، انہوں نے رُوس کی ترکی زبانوں کا رسم الخط بھی عربی سے بدل کر لاطینی کر دیا اور جب ترکی کی حکومت نے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا تو رُوس میں ترکی زبانوں کا لاطینی رسم الخط بدل کر رُوسی رسم الخط کر دیا

گیا۔ ان تمام تبدیلیوں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ روس کے مسلمانوں کا ان کے اہل زبان آزاد ترکوں سے تعلق ختم کر دیا جائے۔ اور رُوسی مسلمانوں کو اسلامی علوم اور ادب سے محروم کر دیا جائے جو صرف عربی رسم الخط میں موجود تھا۔

ترکستان کی جمہوریتوں کو بظاہر معاشی اور سماجی لحاظ سے اشتراکی دور میں بڑی ترقی دی گئی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ اور فرانس وغیرہ نے اپنے محکوم ملکوں کو جو ترقی دی اس کے مقابلے میں اشتراکیوں نے اپنی نو آبادیوں کو کہیں زیادہ ترقی دی۔ ان جمہوریتوں میں معاشی استحصال اس حد تک نظر نہیں آتا جو مغربی نو آبادیوں کی خصوصیت تھا۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے ترکستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد آٹھ دس فیصد سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب پوری آبادی لکھی پڑھی ہے۔ نہری آبپاشی کو اور زراعت کو وسیع پیمانے پر ترقی دی گئی ہے۔ بے شمار قسم کی معدنیات نکالی جا رہی ہیں اور صنعتی ترقی اپنے عروج پر ہے۔ لیکن جس طرح فرانس نے الجزائر، تونس اور مراکش کو اس لیے ترقی دی تھی کہ اس سے ان ملکوں میں آباد فرانسیسی فائدہ اٹھائیں، اسی طرح ترکستان میں بھی اس ترقی سے مقامی باشندوں سے زیادہ رُوسی باشندے فائدے اٹھا رہے ہیں اور ان ہی کو مستقبل میں حقیقی فائدہ پہنچے گا۔

اکثریت اقلیت بن گئی

سولہویں صدی میں قازقستان اور مغربی سائبیریا کے علاوہ یورال اور دریائے والگا کی وادی کریمیا اور شمالی قفقاز کے کئی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس کے بعد جب ان علاقوں پر روس کا قبضہ ہوا تو یہاں رُوسی کثیر تعداد میں آباد ہونا شروع ہو گئے، یہاں تک کہ اشتراکی انقلاب کے وقت مغربی سائبیریا، کریمیا، اور یورال والگا کے بیشتر علاقوں میں روسیوں کی تعداد مقامی تاتاری باشندوں سے زیادہ ہو گئی۔ اشتراکی انقلاب کے بعد بھی رُوسی حکومت نے عہد زار کی یہ پالیسی جاری رکھی اور رُوسی اور سلافی نسل کے باشندوں کو اسلامی علاقوں میں آباد کرنے کا یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ مسلم علاقوں میں اس رُوسی آبادکاری کا نتیجہ نکلا ہے کہ وسط ایشیا کے وسیع علاقے روسی نو آبادیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور مسلمان اپنے ہی وطن میں اقلیت بن گئے ہیں۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے قازقستان میں قازق مسلمانوں کی تعداد ۵۸ فیصد تھی، لیکن اب یہ

تناسب صرف ۲۵ فیصد رہ گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایسا اسلامی خطہ جو رقبے میں پاکستان سے تین گنا ہے، آج ایک غیر اسلامی ملک بن گیا ہے۔ وسط ایشیا کی دوسری جمہوریتوں میں بھی مسلمانوں کی تعداد برابر کم ہوتی جارہی ہے۔ کرغیزیہ میں رُوسی آباد کاروں کی تعداد ۳۷ فیصد اور ترکمانیہ میں ۳۳ فیصد ہوچکی ہے۔ ازبکستان آبادی کی کثرت اور تاجیکستان دور دراز اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر محفوظ ہے لیکن ان دونوں علاقوں میں بھی رُوسی آبادکاروں کا تناسب پندرہ فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں تک شہری آبادی کا تعلق ہے وسط ایشیا کے تقریباً تمام شہروں میں روسیوں کی اکثریت ہے کرغیزیہ کا دارالحکومت ایک اشتراکی رُوسی جنرل کے نام پر فرنزی اور تاجیکستان کے صدر مقام دوشنبہ کا نام لینن کے نام پر لینن آباد کردیا گیا ہے۔

روس اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کو ترقی کی بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ان کو نہ صرف یہ کہ اپنا جداگانہ وجود ختم کرنا پڑا ہے۔ بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ہے، کیونکہ اشتراکی سامراج کی غلامی سیاسی اور معاشی غلامی سے زیادہ ذہنی اور رُوحانی غلامی ہے۔ خدا کے منکر اشتراکی سوویٹ یونین میں خود خدا بن گئے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کو غلط سمجھتے ہیں جو اشتراکی نظریہ کے خلاف ہو اور وہ ہر اس تہذیب و تمدن کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو ان کے اصولوں کے خلاف ہو۔ جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو ایسی خونریزی ہوئی جس کی تاریخ میں کم مثالیں ملیں گی۔ اس انقلاب میں صرف فوجی ہی نہیں مارے گئے بلکہ عام شہری بھی ہلاک کیے گئے۔ انقلاب کے بعد حکومت نے اشتراکی نظام زراعت اس بیدردی سے ملک پر ٹھونسا کہ سوویٹ یونین میں کئی مرتبہ شدید قحط پڑے جن میں لاکھوں انسان موت کا شکار ہوگئے اور لاکھوں انسانوں کو اشتراکی انقلاب کا دشمن سمجھ کر یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، یا بیگار کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ بے شمار مسلمان ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد جب حالات سدھر گئے، تو اشتراکی رہنما آپس میں لڑ مرے اور خود ان کے اپنے رہنماؤں کو جنہوں نے انقلاب میں حصہ لیا تھا، غیر ملکوں کے ساتھ سازش کے الزام میں ایک ایک کرکے ختم کردیا گیا۔ [1]

---

(۱) ان میں ٹراٹسکی، کمنیف، زینولیف اور بیریا قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اشتراکی انقلاب کے بانی تھے۔

اشتراکی حکومت میں دوسروں کو ملکی نظام کے خلاف سوچنے اور اپنی رائے ظاہر کرنے کی قطعی آزادی نہیں۔ اشتراکی حکومت کی غلامی درحقیقت ذہن اور رُوح کی غلامی ہے جو معاشی اور سیاسی غلامی سے بھی بُری ہے۔ اشتراکی نظام کے تحت ہر قوم کو اپنی تہذیب اپنے مذہب اور اپنے نظریوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، چنانچہ ترکستان کے مسلمانوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ وسط ایشیا کی مذکورہ بالا جمہوریتیں ویسے تو اندرونی معاملات میں آزاد ہیں اور ان کو رُوس سے علیحدہ ہونے کا کاغذی حق بھی حاصل ہے لیکن ان کے لیے ایسا فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رُوس میں صرف ایک سیاسی جماعت کمیونسٹ پارٹی ہے۔ سوویٹ یونین میں جو انتخابات ہوتے ہیں ان میں صرف کمیونسٹ پارٹی کے نامزد کیے ہوئے لوگوں کو اسمبلیوں کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ نظام انتخاب ایسا ہے کہ اشتراکیت کے مخالف انتخاب میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ پھر سوویٹ یونین کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی میں روسیوں کی اکثریت ہے۔ ایسی صورت میں غیر اشتراکیوں کا منتخب ہونا ممکن نہیں اور غیر روسی باشندے اپنی بات منوانا تو درکنار اپنے مطالبات پیش بھی نہیں کر سکتے۔

مذہبی آزادی کا خاتمہ

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان جمہوریتوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور حکومت میں بھی وہاں کے لوگ کئی جگہ اکثریت میں ہیں لیکن ان جمہوریتوں میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ پر پابندی ہے۔ قرآن مجید اور مذہبی کتابیں حکومت کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے برخلاف حکومت کی سرپرستی میں بے دینی اور الحاد کی تحریکیں چلائی جاتی ہیں اور مدرسوں، اخباروں، رسالوں، کتابوں اور ریڈیو سے دن رات اسلامی عقائد و تعلیمات کے برخلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ ریاستیں آزاد ہیں لیکن ایسی آزادی کو کون تسلیم کرے گا جہاں مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود اسلام کے خلاف تحریروں، تقریروں اور تعلیم کو روک نہ سکیں۔ ترکستان کا علاقہ عہد قدیم میں اسلامی علوم کا سب سے بڑے مرکزوں میں شمار ہوتا تھا۔ رُوسی دعویدار ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں نے تعلیم اور علم کے میدان میں زبردست ترقی کی ہے لیکن اس ترقی کے باوجود گذشتہ پچاس سال میں سوویٹ یونین سے اسلام سے متعلق ایک بھی قابل ذکر کتاب شائع نہیں ہو سکی۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یا تو ترکستان کے

مسلمانوں کے ذہن بنجر ہوگئے ہیں یا ان کو اسلام پر لکھنے کی آزادی نہیں جب کہ اس مدت میں انڈونیشیا، پاکستان، ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں میں اسلام پر بے شمار بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور بہترین قسم کے رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔

ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ روس میں ہر چیز حکومت کی ملکیت ہوتی ہے یا اشتراکی جماعتوں کی۔ اخبار اور رسالے بھی یا تو سرکاری ہوتے ہیں یا اشتراکی جماعتوں کے۔ غیر اشتراکی نہ تو اخبار نکال سکتے ہیں اور نہ رسالے اور نہ وہ کتابیں چھاپ سکتے ہیں۔ اور نہ اپنے مدرسے قائم کر سکتے ہیں۔ ہر بچہ اور جوان کو سرکاری مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے اور ان میں مدرسوں میں مذہب کے خلاف تعلیم دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اشتراکیت ہی دُنیا کا سب سے اچھا نظام ہے اور مذہب اس کا دشمن ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے مدرسوں میں جو بچے تعلیم حاصل کرتے ہوں گے اور ایسی حکومت میں جو مسلمان رہتے ہوں گے اُن کا اپنے مذہب پر قائم رہنا کتنا مشکل ہوگا۔ اس بات کی تصدیق روس کی سرکاری مطبوعات سے بھی ہو سکتی ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ترکستان کے علاقے میں ملحدوں اور دہریوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ[1] ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کی اشتراکی حکومت مسلمانوں کو اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو مرتد کرنے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے اور اس کام میں ترکستان کی نام نہاد آزاد جمہوریتیں ماسکو کی مدد کر رہی ہیں۔ پہلے زمانے میں تلوار کے زور سے مذہب بدلنے پر مجبور کیا جاتا تھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہسپانیہ اور پرتگال میں ہوا۔ اب روس میں یہی کام تعلیم اور سیاسی جبر و استبداد کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ سوویٹ یونین قوموں کی برادری ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ سوویٹ یونین قوموں کا قید خانہ ہے۔

وسط ایشیا کے مسلم علاقوں پر روسیوں کی گرفت اتنی سخت ہے کہ اگر ان میں کوئی قومی تحریک چلتی ہے یا ان میں اتحاد پیدا کرنے کا خیال بھی پیدا ہوتا ہے تو ان لوگوں کو فوراً کچل دیا جاتا ہے۔ رُوسی استبداد کے خلاف مسلمانوں نے بارہا بغاوتیں کیں لیکن ہر مرتبہ ان کوششوں کو بیدردی سے

---

(۱) ملاحظہ کیجیے (Alexi Puzin) مصنفہ (Religion in Ussr) مطبوعہ نووستی (Novosty) پریس ایجنسی پبلشنگ ہاؤس۔

کچل دیا گیا۔ اب تک ان ریاستوں کے کئی وزیروں اور ممتاز لوگوں کو محض اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ وہ ترکستان کے تمام ترک باشندوں میں اتحاد پیدا کر کے پھر سے ترکستان کی ایک حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سلطان علی اوغلو کا نام قابل ذکر ہے جو سلطان گالف (Soltan Galieve) کے نام سے مشہور ہیں وہ ایک تاتاری اشتراکی تھے لیکن وسط ایشیا کے ترک باشندوں کی خواہش کے مطابق ایک متحدہ ترکستان کا وفاق قائم کرنے کے حامی تھے جو مسلمانانِ رُوس کی پرانی تمنا تھی۔

مسلمانوں کی اس بے چینی کا اظہار مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے ہوتا رہا ہے۔ رُوس میں جزیرہ نمائے کریمیا سینکڑوں سال تک مسلمانوں کا مرکز رہا ہے اور ایک زمانے میں وہاں کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان تھی۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں کریمیا پر جرمنوں کا عارضی قبضہ ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جرمنوں سے تعاون کیا۔ جب لڑائی میں جرمنوں کو شکست ہوگئی اور رُوس کا کریمیہ پر دوبارہ قبضہ ہوا تو اشتراکی حکومت نے یہاں کے تمام تاتاری مسلمانوں کو سائبیریا کے کسی گمنام علاقے میں جلاوطن کر دیا اور آج تک کسی کو نہیں معلوم کہ ان بیچاروں پر کیا گزری؟ کہا جاتا ہے کہ اب ان مسلمانوں کو جو ان مصائب سے بچ گئے ہیں رُوس کے مختلف حصوں میں آباد کر دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک کریمیا کا تعلق ہے وہ مسلمانوں سے پوری طرح خالی کرا لیا گیا ہے۔

رُوس کی اشتراکی حکومت نے علاقہ قفقاز کے کئی مسلمان قبیلوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ ان پر جرمنوں کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام تھا۔

ترک مسلمانوں کی اشتراکی حکومت سے بیزاری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ دوسری جنگ عالمگیر کے دوران جو دس لاکھ مسلمان فوجی جرمنوں کی قید میں چلے گئے تھے وہ اس شرط پر جرمنوں سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ جرمنی ان کے علاقوں کو آزاد کرانے کا وعدہ کرلے۔

یہ ہے مختصر سا حال ترکستان کے اسلامی خطے کا اگر یہی حالت کچھ عرصہ اور قائم رہی تو شاید وسط ایشیا کا یہ وسیع وعریض علاقہ اسلامی دنیا کا حصہ نہ رہے۔ ایک طرف تو وہاں یورپ کے لوگوں کی اکثریت ہو جائے گی اور دوسری طرف موجودہ نسل کے لاکھوں مسلمان جن کو مدرسوں میں الحاد کی تعلیم دی جا رہی ہے، مرتد اور بے دین ہو جائیں گے۔

روسی مسلمانوں کی حالت زار یہ ظاہر کرتی ہے کہ مغرب کے یوروپی ملکوں نے اپنی نو آبادیوں کا معاشی استحصال تو کیا لیکن روحانی اور ذہنی استحصال اس حد تک نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام ملک جو مغربی اقوام کے تحت تھے، آج آزاد ہیں۔ اس کے برخلاف اشتراکی رُوس نے معاشی استحصال تو زیادہ نہیں کیا لیکن ذہنی، روحانی اور سماجی استحصال کو اپنے نقطہ عروج پر پہنچا دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی روس کے مسلمان آزادی کی اس نعمت سے بہرہ ور نہ ہو سکے جس سے مغربی قوموں کی غلامی میں رہنے والے مسلمان آج بہرہ ور ہیں۔ اشتراکی سامراج اور مغربی سامراج کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ مغربی سامراج سے قومیں نجات حاصل کر سکتی ہیں لیکن اشتراکی سامراج کا شکار ہونے کے بعد اس سے چھٹکارا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ترکستان

وسط ایشیا میں ترکستان میں اسلامی تہذیب وتمدن کا عظیم مرکز رہا ہے۔لیکن آج مسلمانوں کی تعداد برابر کم ہوتی جارہی ہے۔ یہ خطہ جس کا رقبہ پندرہ لاکھ مربع میل ہے یعنی برصغیر پاکستان و ہند کے برابر، بڑی تیزی سے دنیائے اسلام کے نقشے سے خارج ہوتا جارہا ہے۔روسی آبادکاروں کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے۔اشتراکی انقلاب سے پہلے قازقستان کی دو تہائی آبادی مسلمان تھی۔صرف قازق باشندوں کا تناسب تقریباً ساٹھ فیصد تھا۔اب مسلمانوں کا تناسب چالیس فیصدی سے بھی کم رہ گیا ہے اور قازق باشندے صرف تیس فیصدی رہ گئے ہیں۔کرغیزیہ میں روسی باشندوں کا تناسب ۳۷ فیصدی، ترکمانستان میں ۲۵ فیصدی اور ازبکستان اور تاجکستان میں پندرہ پندرہ فیصدی تک پہنچ چکا ہے جب کہ اشتراکی انقلاب کے وقت ان علاقوں میں روسیوں کی تعداد برائے نام تھی۔

سنکیانگ یا چینی ترکستان کا بھی قریب قریب یہی حال ہے جہاں چینیوں کو لاکر بڑی تعداد میں آباد کیا جارہا ہے۔

ایران
افغانستان
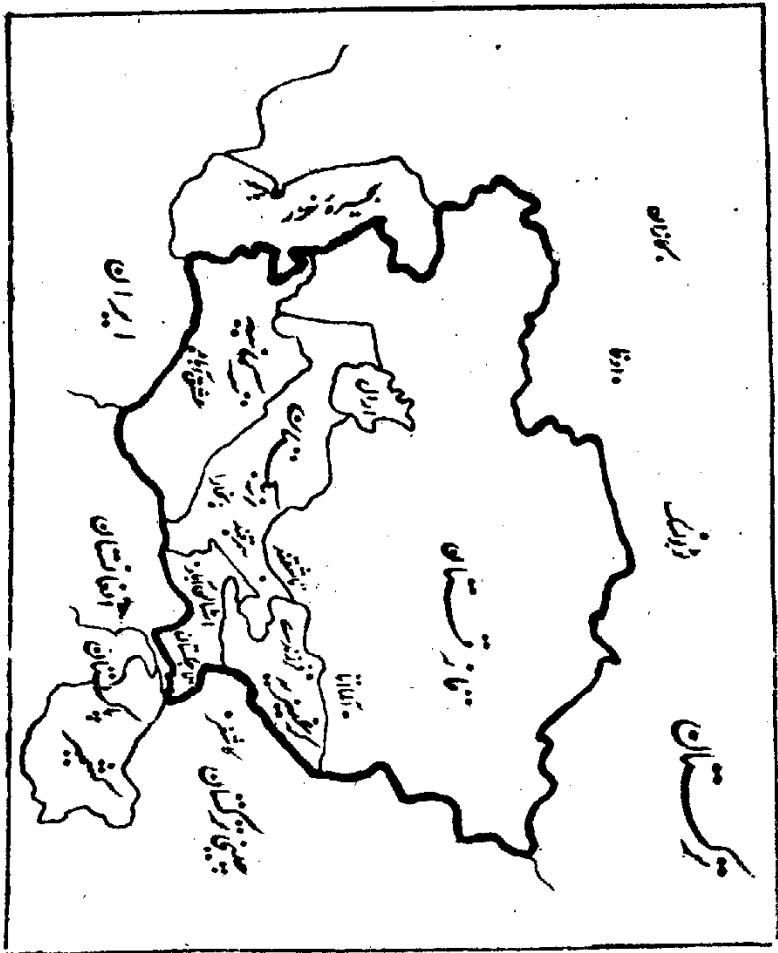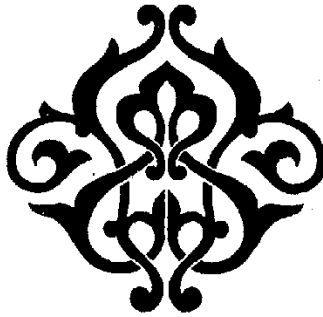
باب ۵۰

مشرقی ترکستان

پچھلے صفحات میں ہم نے جس ترکستان کا ذکر کیا ہے وہ مغربی ترکستان تھا جسے روسی ترکستان بھی کہا جاتا ہے لیکن جو ترکستان کی وسیع وعریض سرزمین کا صرف مغربی حصہ ہے۔ ترکی بولنے والے باشندوں کی اس سرزمین کا دوسرا حصہ مشرقی ترکستان کہلاتا ہے اور یہ علاقہ بھی بدقسمتی سے ایک دوسرے اشتراکی ملک چین کے قبضے میں ہے اور اسی لیے چینی ترکستان بھی کہلاتا ہے۔

مشرقی ترکستان میں مسلمان سب سے پہلے پہلی صدی ہجری کے آخر میں پہنچے تھے جب اموی سپہ سالار قتیبہ نے کاشغر سے طرفان تک کا علاقہ فتح کرلیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتوحات عارضی ثابت ہوئیں، اور چین کی حکومت نے جلد ہی اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ چینیوں نے اس کے بعد مغربی ترکستان پر بھی قبضہ کرنا چاہا، لیکن ۷۵۱ء میں تالاس کے مقام پر مسلمانوں نے چینی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ یہ جنگ تاریخ ترکستان کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی اور بقول بدرالدین چینی کے اس جنگ نے یہ فیصلہ کردیا کہ ترکستان کی آئندہ تہذیب عربی رہے گی، اور چینی تہذیب کو وہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ جنگ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں قید ہونے والے چینی سمرقند میں آباد کیے گئے تھے، اور ان سے مسلمانوں نے کاغذ بنانے کی صنعت سیکھی جو یہاں سے پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔

ایغوری مسلمان

تالاس کی جنگ کے بعد اگرچہ چینی مغربی اور مشرقی دونوں ترکستانوں سے دستبردار ہوگئے لیکن خلافت کا اقتدار صرف مغربی ترکستان تک محدود رہا، مشرقی ترکستان پر مختلف ترک قبائل کی حکومت قائم ہوگئی جن میں سے بعض نے بنی امیہ کے آخری دور میں اسلام قبول کرلیا تھا اور بعض کافی عرصے تک اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ ان ترکوں میں جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، ایغوری نسل کے باشندے قابل ذکر ہیں۔ اور آج بھی مشرقی ترکستان میں ان ہی ایغوری

باشندوں کی اکثریت ہے۔ ان ایغوری مسلمانوں نے ۷۵۷ء میں چین کے بادشاہ کی ایک بغاوت کوفروکرنے میں مدد بھی کی تھی، اوراس کے بعدان کی ایک جماعت چین کے مختلف شہروں میں آباد ہوگئی تھی۔ یہ مسلمان اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں آزاد تھے اور انہوں نے چینی عورتوں سے شادیاں کرلی تھیں۔ چین میں اسلام زیادہ تران ہی مسلمانوں کی بدولت پھیلا۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں مشرقی ترکستان کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ چین نے کس طرح ۱۷۶۰ء میں مشرقی ترکستان پر قبضہ کیااوراس کے بعد یعقوب بیگ نے (۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۶ء) کس طرح مشرقی ترکستان کو چینیوں کی غلامی سے آزاد کرایا۔ یعقوب بیگ کی آزاد حکومت کو برطانیہ، روس اور ترکی کی سلطنت عثمانیہ نے تسلیم کرلیا تھا۔لیکن جب یعقوب بیگ کے انتقال کے بعد چین نے مشرقی ترکستان پر حملہ کیا توان حکومتوں میں سے کسی نے بھی مشرقی ترکستان کی مدد نہیں کی اوراس خطہ پر چین کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۸۴ء میں مشرقی ترکستان کوچین کا ایک صوبہ بنادیا گیااوراس کا نام سنکیانگ یعنی نیاصوبہ رکھا گیا۔اس طرح چینیوں نے ملک کے تاریخی نام کوبدل کر جووہاں کے باشندوں کی قومیت کی عکاسی کرتا تھا۔اپنی سامراجی ذہنیت کا ثبوت دیا۔

آزادی کی جدوجہد

مشرقی ترکستان کوچین کا ایک صوبہ قرار دینا، چین کے جارحانہ عزائم کا ثبوت تھا، ورنہ قومی حیثیت سے مشرقی ترکستان اورچین میں کوئی بات مشترک نہیں۔مشرقی ترکستان کے باشندے نسلاً ترک ہیں اور مذہباً مسلمان، جب کہ چین کے باشندے نسلاً چینی اور مذہباً بت پرست یا ملحد ہیں۔دونوں ملکوں کی زبانیں بھی مختلف ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں۔لسانی،نسلی، مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے مشرقی ترکستان، سرزمین ترکستان یا ارض توران کا ایک حصہ ہے جس کی حدود دیوارچین سے دریائے والگا تک پھیلی ہوئی ہیں۔چینی باشندوں نے ڈھائی ہزارسال پہلے ان ہی باشندوں سے اپنے ملک اوراپنی تہذیب وثقافت کوبچانے کے لیے دیوارِچین تعمیر کی تھی۔لیکن اب جب اقتدار چینیوں کے ہاتھ میں آیا توانہوں نے ان ترکوں کے جداگانہ قومی وجودکوبھی تسلیم کرنے سے انکارکردیااوران کے اصلی وطن اورمرزبوم کواپنے ملک کا

ایک حصہ تصور کرنے لگے۔

جب ۱۸۸۴ء میں مشرقی ترکستان کو چین کا ایک صوبہ قرار دے دیا گیا تو چین سے گورنر مقرر ہو کر مشرقی ترکستان کے دارالحکومت ارمچی آتے رہے۔ لیکن چین سے دور ہونے کی وجہ سے چینی حکومت مشرقی ترکستان پر براہ راست حکومت نہیں کرسکی اور سنکیانگ کے فوجی گورنر ایک طرح سے خودمختارانہ حکومت کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب چین میں جمہوری انقلاب آیا اور مانچو خاندان کی حکومت کی جگہ چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو مشرقی ترکستان کے چینی گورنروں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۴ء تک مشرقی ترکستان پر تین فوجی گورنروں کی حکومت رہی۔ ان گورنروں کے دور میں مسلمانوں پر مسلسل مظالم کیے گئے اور ان پر محاصل کا بار بے انتہا بڑھا دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کومل کے باشندے جو چین سے مشرقی ترکستان آنے والی سڑک پر اہم ایک شہر تھا۔ چینی گورنر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، ان باغیوں کا قائد ایک نوجوان مسلمان فوجی ماچنگ ینگ (Machung Ying) تھا، ۱۹۳۲ء میں یہ سپہ سالار ارمچی تک پہنچ گیا اور چینی گورنر نے راہ فرار اختیار کرلی۔ لیکن بغاوت بھی جلد ہی کچل دی گئی۔ نئے چینی گورنر نے کچھ عرصے تو مسلمانوں سے اچھا سلوک کیا، اور ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے روس بھی بھیجا لیکن غالباً گورنر کی یہ روس نواز پالیسی چین کی منا تنگ حکومت کو پسند نہیں آئی اور اس نے ایک بار پھر سنکیانگ پر قبضہ کر کے ۱۹۴۴ء میں ایک نیا گورنر مقرر کر دیا جس کا نام وو چانگ تھا۔ نئے گورنر نے مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو ختم کرنے اور ان کو چینی تہذیب میں ضم کرنے کی مہم شروع کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں پھر بے چینی پھیل گئی اور ۷۔ نومبر ۱۹۴۴ء کو وادی الی کے مسلمانوں نے جمہوریہ مشرقی ترکستان کے نام سے ایک آزاد جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ مشرقی ترکستان کے دوسرے حصوں میں تو بغاوتوں کو دبا دیا گیا لیکن وادی الی میں جمہوریہ مشرقی ترکستان کی یہ حکومت ختم نہیں کی جاسکی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں تیھورا اور طرفان میں بھی مسلمانوں نے بغاوت کر دی۔ یہ حالات تھے کہ چینی حکومت نے ایک ترک مسلمان مسعود صابری کو جو چین میں بارہ سال رہ چکا تھا، مشرقی ترکستان کا گورنر بنا کر بھیجا۔

ادھر تو یہ حالات تھے، ادھر چین میں ایک نیا انقلاب آ رہا تھا۔ چینی کمیونسٹ کئی سال سے چینی حکومت کے خلاف مسلح بغاوتیں کیے ہوئے تھے اور وہ ترکستان اور چین کے درمیان پہاڑی

علاقوں پر قابض تھے۔ اگر چین میں کمیونسٹوں کو کامیابی نہ ہوتی اور چین کی خانہ جنگی کچھ مدت اور جاری رہتی تو اس کا قوی امکان تھا کہ صوبہ کانسو اور چنگھائی کے جنگجو مسلمان اور وادی اِتی کے مسلمان باقی ترکستان سے بھی چینی اقتدار کو ختم کر دیتے اور مشرقی ترکستان میں ایک آزاد مسلم مملکت وجود میں آ جاتی۔ لیکن حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنوں اور جاپانیوں کو شکست ہوئی اور جنگ کے بعد روسی حکومت نے چینی کمیونسٹوں کو وسیع پیمانے پر فوجی امداد دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمیونسٹوں نے ۱۹۴۹ء میں چین کی قوم پرست حکومت کو شکست دے دی اور چین میں ایک جمہوری حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت نے لے لی۔ اس کے بعد اشتراکی چین کی فوجوں نے مشرقی ترکستان پر بھی قبضہ کر لیا۔ چین نے مشرقی ترکستان کو ۱۹۵۳ء سے اندرونی خودمختاری دے رکھی ہے لیکن یہ خودمختاری ویسی ہی ہے جیسی مغربی ترکستان اور رُوس کی دوسری مسلم ریاستوں کی خودمختاری ہے۔ مذہب پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں اور چینی باشندوں کو بڑی تعداد میں چین سے لاکر مشرقی ترکستان میں آباد کیا جا رہا ہے تاکہ یہاں ترک اور مسلمان اقلیت میں ہو جائیں اور مشرقی ترکستان صحیح معنوں میں سنکیانگ یعنی چینی صوبہ بن جائے۔

چینی ترکستان کے باشندے نسل، زبان اور مذہب ہر لحاظ سے چینیوں سے مختلف ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی مشرقی ترکستان چین سے بالکل الگ ہے۔ دیوارِ چین، کوہ کیون لیون کے برف پوش پہاڑ اور صحرائے گوبی دونوں کو ایک دُوسرے سے جدا کیے ہوئے ہیں۔ مشرقی ترکستان دراصل مغربی ترکستان کی طرح سرزمین ترکستان کا ایک حصہ ہے جس کے باشندے مذہب، رنگ، نسل اور زبان میں ایک ہیں لیکن جس طرح جداگانہ قومیت کے ان تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے رُوس نے مغربی ترکستان کو سوویٹ یونین کا ایک حصہ بنا رکھا ہے اسی طرح چینی بھی مشرقی ترکستان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔

اِسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان 042-35252501-2